



الحمد لله رب العالمين
والصلاة والسلام على
سيدنا محمد وآله الطيبين
الطاهرين

الحمد لله رب العالمين
والصلاة والسلام على
سيدنا محمد وآله الطيبين
الطاهرين

اک لفظِ محبت

”آپ نے مجھے یہاں کیوں بلوایا ہے؟“

”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”مجھے یہ فیلڈ چھوڑے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔“

”شیر اگر شکار چھوڑ دے۔ تب بھی وہ شیر ہی رہتا ہے۔ جو جب مرضی پہ آئے۔ واپس شکار کو نکل کھڑا ہو۔“

ایک نوجوان اور ادھیڑ عمر مرد رستورانٹ میں آمنے سامنے گریسیوں پہ موجود تھے۔ نوجوان نے سامنے والے

کی بات پر سوالیہ نظروں سے اُسکو دیکھا۔

”کس سلسلے میں مدد درکار ہے؟۔۔۔“

”معاملہ انتہائی سنجیدہ ہے۔ جسے ہر حال میں پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔ میڈیا میں خبر نہیں جانی چاہیے۔“

تمہارے ادارے کے لوگوں کو بھی کان و کان خبر نہ ہو پائے۔ اس مشن کو پورا کرنے میں چاہے تمہارا باپ ہی

کیوں نہ سامنے آجائے تم اُسے بھی انجام تک پہنچاؤ گے۔ اگر ان سب شقوں پر متفق ہو تو ہم کانٹریکٹ سائن کر

لیتے ہیں۔“

”یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں کبھی بھی ساری تفصیل سے آگاہ ہوئے بغیر کیس سائن نہیں کرتا ہوں۔“

”اگر تم میرے اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو کو کسی اور کے سامنے نہ کھولنے کا وعدہ کرتے ہو۔ تو میں تمہیں کیس بتانے کو تیار ہوں۔“

”محترم اگر آپ کو مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں تھا۔ تو میرا اور اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔“

”میں نے تمہارا ماضی کا سارا ریکارڈ پڑھا ہے۔ تمہارے آفسر بھی تمہاری بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے تم سے رابطہ کیا تھا۔“

”میرے بارے میں اگر اتنی چھان بین کی ہے۔ تو ایک بات جان ہی گئے ہونگے۔ میں اپنے کام کے لیے منہ مانگی رقم لیتا ہوں۔ جسکی وجہ یہ ہے۔ میں اپنے کام سے غداری نہیں کرتا ہوں۔“

”تمہاری ڈیمانڈ سے بڑھ کر انعام دوں گا۔ اگر تم واقعی یہ کام کر گئے۔ میں تمہیں اتنی دولت دے دوں گا کہ تمہاری آنے والی نسلیں یاد کریں گی۔“

”میں بخشش نہیں لیتا ہوں۔ اپنی محنت کا پھل لینا پسند کرتا ہوں۔“

اُس کے سر دلچے میں کہنے پر دوسرے آدمی نے اپنے ہریف کیس سے ایک فائل نکال کر میز پر رکھی اور پھر اُسکی جانب دھکیل دی۔

”جس کو ڈھونڈنا ہے۔ اُسکی تصویر اسی فائل میں موجود ہے۔ کہاں پایا جاسکتا ہے۔ اُس کے ٹک بھی فائل میں موجود ہیں۔ یہ ایک بہت مشہور فیملی کی عزت کا سوال ہے۔ کسی بھی طور پر میڈیا ٹرائل نہیں ہونا چاہیے۔“

وہ آدمی بول رہا تھا۔ جبکہ وہ فائل کھول کر ہر چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ پہلے پیشانی پہ شکنوں کا جال آیا۔ پھر سنجیدگی اور سرد مہری چھا گئی۔

”میں نے یہ کیس تمہیں اس لیے دیا ہے۔ کیونکہ تم پہلے بھی اس قسم کے کیس دیکھ چکے ہو۔“

”مگر وہ اتنے خطرناک نہیں تھے۔ یہاں تو بہت سی زندگیوں کا سوال ہے۔“

”اسی لیے تو تمہارا انتخاب کیا ہے۔“

”یہ کیس مجھے ملا ہے۔ آپ کے علاوہ اس بات سے اور کون واقف ہے؟“

”تمہارا ہڈ انا باس یا دوست جو بھی ہے۔ اُسی نے مجھے تمہارا بتایا ہے۔“

”اگر مجھے کہیں اُنکے اختیارات کا استعمال کرنا پڑا تو کیا وہ میری مدد کر سکیں گے؟“

”چیف احسان اللہ میرا قریبی دوست ہے۔ تمہیں جہاں کہیں ضرورت پڑی وہ حاضر ہوگا۔“

”آپ ایڈوائس میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادیں۔ جیسے ہی مجھے رقم مل گئی۔ میں کام شروع کر دوں گا۔“

اللہ حافظ۔“

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ فائل بازو میں دبائی اور وہاں سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

اُٹھتے ہی اُسکی نظرفون کی چمکتی سکرین پر پڑی۔ دل نے بیٹ مس کی۔ اس وقت صرف ایک ہی شخص کامیج آسکتا تھا۔ جو اُسکی ہر منت سماجت کے باوجود کسی طرح کی پابندی نہیں مانتا تھا۔ تاہم صرف ایک مخصوص وقت میں اُس کے ساتھ بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ اُسکی بات کبھی نہیں مانتا تھا۔ جس پر اُسکو غصہ بھی آتا۔ مگر پھر بھی وہ اُسے ٹھلا نہیں سکتی تھی۔

ابھی بھی اپنی جگہ اُٹھ کر بیٹھی بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے سیدھا کیا۔ دوپٹہ کندھے پر پھیلا کر فون ہاتھ میں لیا۔ لاک کا پن ٹائپ ان کرنے کے بعد وائس ایپ کھولا۔ اس وقت بھی اُسکو اپنے پیٹ میں تتلیاں اُڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ جب بھی وہ اُس کے ساتھ بات کرتی ایسا ہی ہوتا تھا۔

میج کو آئے پانچ منٹ گزر چکے تھے۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کوئی دلیل دیکر قائل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے صرف تمہیں دیکھنا ہے۔“

اُسکی ہتھیلی میں پسینا آ گیا۔

آج سے پہلے دوسری جانب سے ملنے کا مطالبہ نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اپنی سیٹنگ میں لاسٹ سین کا آپشن بند کر رکھا تھا۔ اس لیے وہ نہ جان پائی کب آف لائن ہوا ہوگا۔ مگر پھر بھی جلدی سے اپنا جواب لکھ بھیجا۔

”آپ جو چاہ رہے ہیں۔ وہ ممکن نہیں ہے۔“

ابھی ایپ بند کر کے فون رکھا بھی نہیں تھا۔ دوسری جانب سے جواب مل گیا۔ ناچار اُسکو دوبارہ سے فون کو کھولنا پڑا۔

”مجھے ناممکن لفظ سے شدید نفرت ہے۔“

”آپ کو محبت کس سے ہے۔“

”صرف تم سے۔۔۔“

تاہم نے فون کو بستر پہ پھینک دیا۔ ایسا لگا جیسے سامنے بیٹھ کر کہہ رہا ہو۔ سکرین اب بھی روشن ہی تھی۔ اگلا مسیج آیا۔

”فون بند مت کرنا۔ کم از کم جب تک میرے سوال کا جواب نہ دے دو۔“

گہرا سانس لیتے ہوئے اُس نے فون واپس اٹھایا۔

”مجھے نماز پڑھنی ہے۔ پھر بات ہوگی۔“

”مجھے ناراض کر کے اللہ کو کیسے مناؤ گی؟“

”آپ سدا کے ناراض ہیں۔“

”تم نے کبھی منانے کی کوشش جو نہیں کی۔ ایک وعدہ آزما ہی لو۔“

”مجھے کسی کی آزمائش مطلوب نہیں ہے۔“

”ذرتی کس سے ہو؟“

”اپنے آپ سے۔۔۔“

”آج تک تم نے مجھے اپنی ایک تصویر نہیں بھیجی۔ اب میں تمہیں روبرو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”اگر میں پسند نہ آئی تو؟“

”ایسا کوئی اگر میری زندگی میں نہیں ہے۔“

”لوگ بدل جاتے ہیں۔“

”ہاں بدلتے ہیں۔ انسان ہی کیا ساری کائنات ہی مسلسل ارتقا کا شکار ہے۔ کوئی چیز ”حیوان انسان سدا ایک سے نہیں رہ سکتے۔“

”میں نے یہ بات سنجیدگی سے کی تھی۔“

”مذاق تو میں نے بھی نہیں کیا۔ جب میں پیدا ہوا تھا۔ چند سینٹی میٹر میرا قد تھا۔ اور صرف چار کلو وزن تھا۔ آج میں چھ فٹ ایک انچ لمبا ہوں۔ اسی کلو میرا وزن ہے۔ جب تم مجھے ملیں تھیں۔ میں نے تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی۔ اس گورے وقت میں ایک سٹوڈنٹ سے ترقی کر کے بزنس مین بنا ہوں۔ اسی لیے جب ویسا نہیں رہا جیسا تھا۔ تو تم پر بھی تو وقت نے اثر چھوڑا ہوگا۔ میں وہی دیکھنے کے لیے بے قرار ہوں۔“

وہ پھر سے بات کو کسی اور سمت لے جا رہا تھا۔ وہ جلدی سے لکھنے لگی۔

”مجھے نماز پڑھنی ہے۔“

”میرے لیے ایک دُعا کرو گی؟“

”جی۔۔۔“

”جو میرا نصیب ہے۔ وہ مجھے جلد مل جائے۔“

تاہفہ نے سائل آئی کان بھیج دیا۔

”تم نے تو آمین تک نہیں کہا۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین ہے۔ تم دُعا بھی نہیں کرو گی۔“

”انسان کا نصیب صرف اُسی کے پاس آتا ہے۔ بس کامل ایمان ہونا چاہیے۔ جس پر پیچھے سے جس انسان

کے نام کی چٹ لگ کر آئی ہو۔ وہ اُسی کو ہی ملتا ہے۔ آپکو تو مل چکا ہے۔ پھر یقین کیوں نہیں آتا۔“

”یقین اس لیے نہیں آتا۔ کیونکہ ابھی تک میں نے اُسکو نہ قریب سے دیکھا ہے۔ نہ محسوس کیا ہے۔“

”اللہ حافظ وڈی اماں اٹھ گئی ہیں۔“

”تمہیں اللہ پوچھے گا تاہفہ بیگم بول لو جتنے جھوٹ بول سکتی ہو۔۔۔“

اُسکے چہرے پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ فون اُسکی وقت واپس لاک کر کے باہر نکل آئی۔

☆.....☆.....☆

”ستیاناس ہو گیا ہے۔۔۔“

اماں وڈی کی دھاڑ پٹاس نے سہم کرائی جانب دیکھا۔ جو خطرناک تیور لئے اُس کے پیچھے کھڑی تھیں۔

”کیا ہوا اماں وڈی۔۔۔“

”ہائے معصوم تم مجھ سے پوچھتی ہے۔ کیا ہوا؟ کیا تو بھول بھی گئی ہے۔ ہیں نی پہلے مجھے یہ بتا آخر کب سے تو اتنی بھلکڑ ہو گئی ہے۔“

”اماں وڈی قسم لے لیں جو مجھے کچھ اندازہ ہوا آپ کس بات پہ ناراض ہو رہی ہیں۔“

”یہ مجھے میری جتنی پکڑاؤ ناز میں ماروں۔ شائد پھر کچھ یاد آ جائے۔ میں نے کل رات فون سنتے ساتھ ہی تجھے بتایا تھا۔ آج میرا پٹر آرہا ہے۔ سونے سے پہلے میرے کپڑے لے تیار کر کے رکھ دینا۔ مجھے نوازش علی کے ساتھ اپنے پٹر کو لینے جانا ہے۔“

”ہاں جیسے آپ نہ جائیں گی۔ تو آپ کے بیٹے کو گھر کا راستہ نہیں ملے گا۔“

”صبح صبح بکواس کر کے میرا میٹرنہ گھما۔ یہ گز بھر لپی تو تیری زبان ہے۔“

”لائیں ذرا انچی ٹیپ آج میں ماپ ہی لوں۔ اگر میری زبان گز بھر لپی ہے۔ تو اب تک میرا نام ورلڈ بکس آف گینس میں کیوں نہیں آیا۔ میں اُنیس سال کی ہو گئی ہوں۔ اور دنیا کو ابھی تک میری یونیک خوبی کا علم ہی نہیں ہوا۔ بڑا ظلم ہے۔“

”کتنی دفعہ کہا ہے۔ مجھے انگریزی میں گالیاں مت دیا کر۔“

”استغفر اللہ اماں وڈی۔ کیا تھا جو آپ نے چار حرف مجھ سے سیکھ لیے ہوتے۔ بات میں سیالکوٹ کی کرتی ہوں۔ اور آپ کی گاڑی سیدھا ملتان پہنچ جاتی ہے۔“

”آج میرا پٹر آرہا ہے۔ آج کے بعد وہ تجھے میری طرف سے تیری انگریزی گالیوں کا جواب دیا کرے گا۔“

”لو کر لوگل۔۔۔ کاش آپ اتنی بوڑھی نہ ہوتیں۔“

”خبردار جو مجھے بڑھی کہا تو۔۔۔“

وہ جواب دینے ہی لگی تھی۔ مگر اپنی کی جھنجھلاہٹ بھری آواز کان میں پڑتے ہی فٹ اپنے پیر ٹوٹی کے نیچے رکھ دیئے۔ کیونکہ باہر وہ وڈی اماں سے بحث و مباحثہ کرنے کی بجائے وضو کرنے لگی تھی۔

”تافہ اماں جی تو بزرگ ہیں۔ بچوں کی طرح ہر بات پہ لڑنے بیٹھ جاتی ہیں۔ جواب میں تم ہی احساس کر لیا کرو۔ ہر روز میری آنکھ تم دونوں کے جھگڑے پر کھلتی ہے۔ سارا گاؤں آپ کی صبح خیزی کی عادت سے تنگ ہے۔ خود تو سونا نہیں ہوتا۔ دوسروں کو بھی سکون کرتا نہیں دیکھ سکتی ہیں۔“

اب یہ کیسے ممکن تھا۔ پھوپھو نے اپنی ساس سے پنکا لیا ہو۔ اور وہ انہیں بخش دیتیں۔

”شیم پڑا اگر آنکھ کھل ہی گئی ہے۔ تو میری دھی چار سجدے ہی دے لے۔ ہماری اُستانی بننے کے لیے تیرے پاس سارا دن ہوتا ہے۔ صبح صبح تو ہمیں گالیاں دینے کی بجائے۔ اللہ کا نام لیا کرو۔۔۔“

”تو بہ ہے اماں جی میں نے کب آپ کو گالیاں دی ہیں۔ اگر آپ اپنی الماری کے ہینڈل میں لٹکا ہوا ہینگر دیکھ لیتیں تو یہاں کھڑے ہو کر تقریر نہ کرنی پڑتی۔ تافہ رات کو آپ کا لباس تیار کر کے ہی سوئی تھی۔ میں الحمد للہ پانچ وقت کی نمازی ہوں۔ پر آپ کی طرح نمائش نہیں کرتی ہوں۔“

تافہ وضو پورا کر کے اپنی مڑی ہوئی آستین سیدھی کرتی چپ چاپ اندر کو بڑھ گئی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ اماں جی اور اُس کی تکرار پر پھوپھی شیم کا پارا سا توں آسمان پر پہنچ جاتا۔ کبھی تو وہ منہ میں ہی بڑبڑا کر خود کو کنٹرول کر جاتیں۔ پر بعض اوقات میدان میں کود پڑتیں۔ ساس بہو کی آپس میں ذرا نہیں لگتی تھی۔

ساری جائیداد ابھی تک اماں وڈی کے ہی نام تھی۔ جس کی وجہ سے مصلحت پسند شیم بیگم ساس کی کھری کھری سننے پر مجبور تھیں۔ ورنہ کس مائی کے لال کی جرات تھی۔ اُن سے گھر لیتا۔

تافہ سُٹنیں پڑھ چکی تھی۔ جب اماں وڈی چھڑی کی ٹک ٹک سمیت کمرے میں داخل ہوئیں۔

”بس بہت ہو گیا۔ آج سے میں نے اپنی رہائش الگ کر لینی ہے۔ اس کے ساتھ رہتی ہے میری جوتی۔ میڈم جی کو بس رُعب ڈالنا آتا ہے۔ بندہ پوچھے کیا ایک بے زبان غلام کم ہے۔ جو تمہیں دیا ہوا ہے۔ دن رات اُس کے کان کھا کھا کر تم نے میرے بچے کو عمر سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ اُس پہ چاہتی ہے۔ مجھے بھی ڈانٹ ڈپٹ کر ایک کونے میں ڈال دے اور پھر آزادی سے اپنی من مانی کرتی رہے۔ میرے جیتے جی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”اب تم نے کیا سو رکعت کی نیت باندھ لی ہے۔ مجھے وضو تمہارے فرشتے کروا بیٹگے۔ باہر دن نکل جائے گا۔ پر تمہیں کیا پرواہ ہر روز قسم کھائی ہوئی ہے۔ مجھ سے پہلے اپنی حاضری لگوانی ہوتی ہے۔ کم بخت کو نیند بھی نہیں گھیرتی۔ تیری ہم عمر میری پوتیاں مردوں سے شرط لگا کر سوتی ہیں۔ ایک تجھے جانے اللہ نے کس مٹی سے بنادیا ہے۔“

اُس نے سلام پھیرنے کے بعد جائے نماز کا کونہ موڑا۔ اور اُن کے پاس آ کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

”باہر ابھی گھپ اندھیر ہے۔ کیوں اتنی انرجی ضائع کر رہی ہیں۔ اتنے لمبے سفر پہ جانا ہے۔ راستے میں پھر سردرد کی شکایت ہوگی۔ آجائیں وضو کروادوں۔“

وہ خود بھی بول بول کر تھک گئی تھیں۔ اس لیے خاموشی سے اُس کے ساتھ واش روم کی جانب بڑھ گئیں۔

واش روم کافی کشادہ بنا ہوا تھا۔ جواماں وڈی نے اپنی پسند اور مرضی سے بنوایا تھا۔

اُنکو کرسی پہ بیٹھا کر اُس ٹک میں پانی بھر بھر کر انہیں وضو کرنے میں مدد دی۔

اماں وڈی اپنے لکڑی کے نقش و نگار والے جائے نماز پہ بیٹھ کر نماز کی ادائیگی میں مشغول ہوئیں۔

تاوقتہ نے اپنا بیچ سورہ لیا اور واپس اپنی جگہ پہ بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

جلدی جلدی میں یاسین پڑھی پھر ہاتھ پہ بندھی کھڑی پہ نظر ڈالی۔ ساڑھے چار ہو رہے تھے۔

پوری ٹیم نے درخواست کر رکھی تھی۔ ساڑھے چار سے نہ ایک سوئی پیچھے نہ آگے۔

بیچ سورہ چوم کر واپس رکھا۔ جائے نماز کو تہہ لگا کر دروازے میں ڈال دیا۔

فون چارجر سے ہٹا کر ایک نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ بھی ڈھیٹ بنی لگی رہی۔ دس دفعہ ملا لینے کے بعد بھی جب جواب موصول نہ ہوا تو وہ کمرے سے نکل آئی۔

اور مطلوبہ دروازے کو پیٹ کر رکھ دیا۔

حواس باختہ سی حرا باجی نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔

”کیا وڈی اماں کو کچھ ہو گیا؟“

”جی نہیں آپکے اتنے اچھے دن نہیں آئے ہیں۔ پر اگر اگلے تیس منٹ میں آپ لوگ بستر چھوڑ کر تیار نہ ہوں۔ تو اتر پورٹ صرف اماں وڈی ہی جائیگی۔“

اتر پورٹ کا نام لینے کی دیر تھی۔ کمرے میں کھلبلی مچ گئی۔ تاحفہ کو یوں لگا جیسے بکھرے بالوں والی پھولیں قبروں سے برآمد ہو رہی ہوں۔ لاحول پڑھتی واپس اماں وڈی کے پاس آگئی۔

”اٹھا آئی ہو اُن منحوسوں کو پڑ گئی ہوگی کلیجے میں ٹھنڈ۔ اب ساری فوج جائے گی۔“

”جانے دیں ناں بچیوں کے یہی تو دن ہوتے ہیں ہنسنے کھیلنے کے۔“

”ہاں درست کہہ رہی ہو۔ فرعون کی ہم عمر۔۔۔“

”میرا نام کبھی کسی اچھے انسان کے ساتھ بھی لے لیا کریں۔“

”ہمارے ملک کا سب سے بہا بندہ تو اب صرف ممنون حسین ہی ہے۔ نہ کسی کی چنگی مندی کرتا ہے۔ نہ کسی کے کام میں دخل اندازی کرتا ہے۔ وہ ٹھیک ہے؟“

”بیچارے کے اتنا پیسا ہونے کے باوجود آپ جیسی خالم عورت نہیں بخشیں۔۔۔“

باتوں باتوں میں اُس نے اُنکے کپڑے بدلوادئے۔ کنگھی کر کے نفاست کے ساتھ چوٹی بنائی۔ دروازے پہ دستک ہوئی تو اماں وڈی نے بازو بآواز میں پوچھا۔

”کون آئے؟۔۔۔“

جواب میں نوازش علی کی باوقار آواز میں جواب آیا۔

”امی جی میں ہوں۔ آپ تیار ہیں تو باہر آ جائیں۔ دیر ہو رہی ہے۔“

”اچھا بھڑ منے آئی۔“

”چل تشفی جلدی سے اپنی چادر لو اور مجھے اٹھنے میں مدد دو۔“

اُس نے ہینڈ بیگ میں ساری ضروری چیزیں رکھیں بمعہ اماں وڈی کی دواؤں کے چادر لینے کے بعد بیگ کندھے پر ڈالا اور اُنکا ہاتھ تھام کر باہر لے آئی۔

لڑکیوں پر نظر پڑتے ہی اماں وڈی نے کڑک کر کہا۔

”اُتر پورٹ جا رہی ہو۔ مامے کے ویسے پہ نہیں۔ جلدی سے اپنے رنگے ہونٹ صاف کرو۔ ماؤں نے تو قسم کھائی ہوئی ہے۔ مجال ہے جو کبھی جوان جہان لڑکیوں کے گھلے فیشن۔ پر جو کبھی روک ٹوک کی ہو۔ تاہفہ نے لڑکیوں کے اُترے چہرے دیکھ کر بمشکل مسکراہٹ مچھپائی۔ دل میں سوچا اماں وڈی آپکی اولاد ایویں آپ سے خار نہیں کھاتی۔

اماں وڈی ماں بیٹے نے لڑکوں سمیت مکھن والی لسی کے گلاس اندر پھینکے۔ لڑکیوں نے سیدھا انکار کر دیا۔ اتنی صبح کون ٹھنڈی لسی یاد ہی لے۔ مگر تاہفہ کے پاس یہ سہولت نہیں تھی۔ اماں وڈی کے کبھی نہ ختم ہونے والے لیکچر سے بہتر یہی تھا۔ چپ چاپ اُٹلا حکم مان لیا جائے۔ ایویں تو سب بچے اُسکو اماں وڈی کی چچی نہیں کہتے تھے۔

روانگی کے وقت وڈی چوہدرائیں کی ساری آل اولاد کوچ میں بیٹھی تھی۔ اور تاہفہ اماں وڈی کے ساتھ اُنکی علیحدہ گاڑی میں جسے اُنکا چھوٹا بیٹا چوہدری دھیم چلا رہا تھا۔ سارا راستہ چوہدرانی جی خود تو سوتی رہیں۔ مگر بہو بیٹیوں نے جلے دل کے پھسولے پھوڑے۔ رخشدہ چچی کو یہی بڑا غم تھا۔ ”اماں جی نے کبھی جو گھر کی بچیوں کو اپنے قریب آنے دیا ہو۔ ایک غیر لڑکی کو سارے پوتے پوتیوں پہ فوقیت دیتی ہیں۔“

ہمیشہ بیگم کو بھی موقع مل گیا۔

”میری بھابھی نے ساری عمر میرے بھائی کو تعویذ گنڈے کروا کر قابو کئے رکھا تھا۔ بچارہ مرا تو اُس فریبی عورت سے جان چھوٹی۔ اب یقیناً مفت کی روٹیاں توڑنے کے لالچ میں اماں پہ تعویذ ڈالے ہو گئے۔ ایسے ہی تو ایک بیٹی کی اتنی دھوم دھام سے نہیں شادی کر لی۔“

اُنکی نفرت سے ناک چڑھا کر کی گئی گفتگو پر رضیہ چچی نے مصحوبیت سے سوال کیا۔

”بھابھی جی میں نے تو سنا تھا۔ آپ کی بڑی بھتیجی کسی فیکوی میں ترقی ہو کر اچھی پوسٹ پر بیٹھ گئی ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی تاہفہ سے زیادہ کمالتی ہے۔“

ہمیشہ بیگم نے ناک سے کھسی اڑائی۔ اور حقارت سے بولیں۔

”اللہ ہی جانے۔ یہی ماں بیٹیاں ایسی خبریں پھیلاتی رہتی ہیں۔ ورنہ کوئی اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ اماں
وڈی جتناں خرچ بیٹوں سے لیتی ہیں۔ وہ کہاں جاتا ہے۔“

پچھلی سیٹ پہ بیٹھی باجی حرا اپنی تائی امی کی غلط بیانی پر انہیں ٹوکنا چاہتی تھی۔ پر کچھ سوچ کر خاموش ہی
رہیں۔ ویسے بھی آج تائی امی اپنے اکلوتے سپوت کی آمد کے دن سویرے سویرے چوہدرانی جی سے ہونے والی
منہ ماری کی وجہ سے ابھی تک بد مزہ تھیں۔ بھتیجی اور اسکی ماں کو برا بھلا کہنا تو انکی پرانی عادت تھی۔ وہ کبھی اس کام
سے بھولتی چوکتی نہ تھیں۔

حرا سے چھوٹی صائمہ نے دھیرے سے سرگوشی کی۔۔۔

”ویسے تو تائی امی نے سارے خاندان کے سامنے علی اعلان کہا ہوا ہے۔ کیونکہ گھر میں ہر ایک کی دو چار
لڑکیاں ہیں۔ اور انکا ایک ہی بیٹا ہے۔ ایک دیور سے رشتہ لیا تو دوسری دیورانی ناراض ہوگی۔ دوسری سے لیا تو
تندوں کے ارمان ٹوٹ جائینگے۔ اسلئے سُسرال میں وہ بیٹے کی شادی ہی نہیں کریں گی۔ پھر آگیا انکامیکہ ایک
بھائی کو تو لسٹ میں شامل بھی نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ کونسا زندہ ہے۔ انکی یتیم اولاد تائی امی کو دنیا بھر کی ساشی
اور چلتے باز لگتی ہے۔ دوسرے دونوں بھائیوں کی اولاد ویسے ہی بڑی الزا ماڈرن ہے۔“
رضیہ چچی کی بیٹی مریم بولی۔۔۔

”اچھا تو اگر انہوں نے میکے کی لڑکی بہو بنائی تو سُسرال کو دکھ نہ ہوگا۔ میں تو اس فیصلے کے خلاف اپنی
ماؤں سے دھرنا کرواؤنگی۔ خاندان کے سب سے پیارے لڑکے کو تو میرا بھائی بنا دیا ہوا ہے۔ آج کے بچے جاتے
ہیں۔ غفور اور شکور میں نہیں کرنی ان سے شادی۔۔۔“

پچھلی سیٹوں پر قہقہے گونجنے تو انکی سیٹوں پر موجود عوام نے گردنیں موڑی تھیں۔
درمیاں میں براہجان مائیں ابھی تک اپنی ہی دنیا میں مگن تھیں۔
فضیلہ پھوپھو کی بیٹی بولی۔

”میری تو دُعا ہے۔ فریود بھائی خود ہی اپنی اماں کے سامنے ڈٹ جائیں۔ شادی کرونگا تو تافہ سے ورنہ
کنورا مر جاؤنگا۔“

حرا نے اُسکی کمر پہ ایک دھموکا جڑا

”تمہارے منہ میں خاک کیسی مریں اُسکے دشمن میرے دیر کو تو اللہ عمر خضر عطا کریں۔“

عائشہ اپنا کندھا سہلاتے ہوئے بولی۔

”حرا باجی قسم سے آپکا ہاتھ مرد کی طرح بھاری ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے میرے کندھے پہ کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اور فکر نہ کریں اگر فریود بھائی نے ایسا کوئی مطالبہ کیا تو ممانی نے تافہ کو کالے پانیوں میں پھینکوا دینا ہے پر شادی نہیں ہونے دینی۔“

”تم یہ بھول رہی ہو۔ فریود بھائی بیٹے کس کے ہیں۔ حد سے زیادہ ماں کا فرما بردار۔ اُن سے تو اُمید ہی نہ رکھو کبھی ایسا کوئی سُخارا کچڑھے گا۔ جدھر اماں کہیں گی۔ چُپ چاپ اُسی کھونٹے سے بندھ جائیگی۔“

یہ خیال چھوٹی پھوپھو کی قاطعہ کا تھا۔ جس پہ عائشہ بولی

”ویسے مزاحی آجائے اگر وہ باہر سے اپنی اماں کے لیے بہو لے آئیں۔ قسم سے ممانی کی ساری اکڑ نکل جاتی ہے۔ نہ گوری کو انکی سمجھ آتی ہے۔ نہ انکو گوری کی۔ گھر میں کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا کرے گا۔ اور سارے علاقے میں ہماری مفت کی مشہوری ہوتی ہے۔ چوہدریوں کا بیٹا باہر سے گوری بیاہ کر لایا ہے۔ میں نے تو اُس پر ٹکٹ لگا دینی ہے۔ جو بھی دیکھنا چاہے سو روپیہ فی دیدار کیسا؟۔۔۔“

حرا نے تاسف سے سر ہلایا۔۔۔

”جیسی تم خود ہوشوں شرک ویسے ہی تمہارے خیالات ہیں۔ دادی نے بیچاری گوری کو گھر کی دہلیز بھی پار کرنے نہیں دینی۔ یاد ہے ناں بکوسائی نے ٹرے حویلی سے لا کر گھر پہ دی تھی۔ دادی نے اُس ٹرے کو دس دفعہ کلمہ پڑھوا کر دھلایا تھا۔“

”حرا باجی سب سے لگی آپ ہیں۔ واسع بھائی ہر وقت نظروں کے سامنے رہتے ہیں۔ رخصت ہو کر بھی گھر کے ایک حصے سے دوسرے میں جاتا ہے۔ دوپہر کا کھانا میکہ میں کھایا رات کا سُسرال میں ایک منٹ پہلے اپنی ماں کے پلو سے لگی بیٹھی ہوتی۔ دوسرے پل ساس کی چالپوسی کریں گی۔ تندوہ ہے جو پہلے ہی آپکے منگوں سے ڈرتی ہے۔ دُعا کریں میری ماں کا داماد بھی ایسا ہی نکلتے۔“

ایک دفعہ پھر قہقہے گونجے۔۔۔

حرا نے چوری چوری ایک نظر واسع پر ڈالی جسکی اس طرف پشت تھی۔ وہ تو ایک گھر میں ہوتے ہوئے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

حرا بولی۔۔۔

”تمہاری ساس تم پہ مرتی ہے۔ نند منہ پھٹ ہے۔ اور رہا میرا بچا رہ بھائی کرم نواز اُسکا تو نام ہی کرم ہے۔“
”ہاں بس نام کا ہی کرم نواز ہے۔ کبھی پچاس روپے تک کا ایزی لوڈ تو کروایا نہیں۔“
”جانے دو جانے دو کل کی بھابھی آج کی کزن۔ جب سے میرے بھائی کے پلے پڑی ہو۔ بچارے کی اتنی سی شکل نکل آئی ہے۔“

عائشہ کے جتانے پر فاطمہ نے اپنی نند کا گھر پورا کرنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ صائمہ نے اُسکے منہ میں جھونگلم ڈال دی۔

”عائشہ بات تو سچ ہے۔ مگر بات ہے رسوائی کی۔۔۔“

صائمہ کا اشارہ فاطمہ کی بات بے بات زُعب ڈالنے کی عادت کی طرف تھا۔ کیونکہ اپنے گھر میں اُس نے اپنے سے چھوٹے دونوں بہن بھائی کو آگے لگایا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی امی کے ساتھ بھی ایک دن میں نہ جانے کتنی دفعہ گرما گرمی ہوتی۔ جس پر قیصرہ پھوپھو اُکٹا کر اُسکو کہیں تم میری ماں نہ بنو۔
عائشہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”حرا باجی ویسے مذاق کے علاوہ ایک بات سچ بتائیں۔ کیا آپ کو اُس لڑکی کا نام معلوم ہے۔ جس کے ساتھ فریود بھائی شادی کرنا چاہتے تھے۔ جس پر چاچو نے اُنکو مارا بھی تھا۔ اُنکو سزا کے طور پر باہر اپنے دوست کے پاس بھیجا۔ امی نے ایک دن بتایا تھا۔ فریود بھائی تو جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔“
حرا چونک کر بولی۔

”یہ بات تمہیں بڑی یاد ہے۔ چھ سال ہو گئے ہیں۔ گھر میں تو اب کبھی ذکر بھی نہیں ہوا۔“
”ہاں تو ذکر کرنے والے کو شیم چچی کچا جائیگی۔ بڑی مشکل سے بیٹا واپس اپنے ہاتھ میں کیا ہے۔“

پورے چھ ماہ فریود کے ساتھ گزار کر اُسکی برین واشنگ کر کے اُسکو باہر بھیج پائی تھیں۔ تبھی تو اب اتنی مطمئن ہیں۔“

”پر میرا سوال اپنی جگہ ہے۔ وہ کون لڑکی تھی؟“

”آئے ہائے بھئی نام تو مجھے بھی نہیں معلوم بس یہ سنا ہے۔ دوسرے گاؤں سے تھی۔ ایک دن وڈی اماں کہہ رہی تھیں۔ اب تو اُسکی شادی ہو چکی ہے۔“
حرا کے بتانے پر صائمہ نے آہ بھری۔۔۔

”ہائے بچارہ فریود چائیلڈ ہڈ پیار تو نہ ملا۔ پراتنا ٹکڑ ہے۔ یہ راہِ راست پر آ گیا ہے۔ نہیں تو اس کے ساتھ لڑائی اُسکے ساتھ لڑائی بیس سال کی عمر تک پہنچے پہنچے ناک کہ ہڈی خودائی ایک دفعہ بازو فیکچر کروایا۔ ہائے اللہ اور جب چھت سے گرا تھا۔ تو بہ تو بہ مجھے وہ دن جب بھی یاد آتا ہے۔ تو رو ٹکٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“
”ویسے مجھے لگتا ہے۔ جب بچوں کو زیادہ محبت اور توجہ ملتی ہے۔ اُنکی ہسٹری ایسے کاموں سے بھری ہوتی ہے۔“

سیالکوٹ ہائی پاس پہنچ کر جب کوچ لونیال والا کوٹھڑی جہاں سے لونیاں ولا ہائی پاس سے سیدھی جی روڈ پہ چڑھ گئی۔

روشنیاں دیکھ کر عائشہ نے مصومیت سے اونچی آواز میں پوچھا۔ واسع بھائی کیا ہم پہنچ گئے ہیں۔“
واسع نے ایک نظر گردن موڑ کر کہا۔
”ہاں میری بہن نکلو باہر اور ایک ایک بتی کے گلے ملو۔ چپ کر کے سو جاؤ جب پہنچو گی۔ پتا لگ جائے گا۔“

☆.....☆.....☆

”مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔“

”کیا تم اُنکے جاننے والے ہو؟“

”جی نہیں اُنہوں نے اخبار میں ایک ایڈ دیا تھا۔ آئی ٹی ایکسپرٹ چاہیے۔ جو مووی میکر بھی ہو۔“
”اوہاں۔۔۔ یاد آیا۔ ہم نے ایسا ایڈ دیا ہوا تھا۔ مگر یہ تو کوئی چار ماہ پہلے کی بات ہے۔ اب تو ہم کو کوئی

ضرورت نہیں ہے۔“

داڑھی والے لڑکے کی سرے سے بھری آنکھوں میں مایوسی جاگی۔

”دیکھئے میں بہت مجبور ہوں۔ مجھے نوکری کی اشد ضرورت ہے۔ آپ چاہے مجھے کم تنخواہ پر ہی رکھ لیں۔“

رہنمائی پر موجود لڑکے نے اُس ضرورت مند کو سرتا پیر دیکھا۔

ڈھیلی سی روایتی شلوار قمیض پہنے پیر میں گھلے سینڈلز میں کالی جرابیں پہنی ہوئی تھیں۔ سر کے بالوں کو تیل لگا کر درمیان میں مانگ بنا تھا۔ آنکھیں گچھ تو تھیں ہی اتنی لال انگارہ اوپر سے ڈوئی بھر بھر کر سر مہ ڈالا گیا تھا۔ داڑھی بھی خوب گھنی تھی۔ ایک دفعہ جب نظر اٹھا کر دیکھتا رہنمائی بچارہ نظر پڑا لیتا۔

”اگر یہاں نوکری چاہتے ہو۔ تو پھر پہلے ان جرابوں سے جان تھوڑانی ہوگی۔ دوسرا اس سرے سے۔ تو بہ کیا آئٹم لگ رہے ہو۔ یہ تمہاری آنکھیں کیوں اتنی لال ہیں؟ کیا کوئی نشہ لیتے ہو؟“

”یہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں۔ صاحب جیب میں روٹی کے پیسے نہیں ہوتے۔ نشہ کیا کرنا ہے۔ پر کبھی جو موقع مل جائے تو اپنی فقط ایک ہی عیاشی ہے۔ سگریٹ پینا اور وہ میں دل کھول کر پیتا ہوں۔“

رہنمائی نے پُرسوج آنکھوں سے ایک دفعہ پھر اُسکا جائزہ لیا۔

”تمہارا کیا نام ہے؟“

”میرا نام موتی۔“

”پڑھ لکھے ہو؟“

”آہو جی کمپیوٹر میں ڈپلومہ کیا ہوا ہے۔“

”کہاں سے؟“

”علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے۔“

”اچھا اچھا کیا پہلے کہیں نوکری کر چکے ہو؟“

”کی تو ہے۔ مگر بتا نہیں سکتا کہ کدھر کی ہے۔“

”کیوں ایسا کیوں ہے؟“

موتی نامی لڑکے نے ارد گرد کسی اور کی موجودگی نہ ہونے کی تصدیق کرنے کے بعد بڑے راز دارانہ انداز میں سرگوشی کی۔

”ایک سی ڈی والی دکان پر دو سال لگائے ہیں۔“

”اس میں اتنی شرمانے والی کیا بات ہے۔“

”شرمانے والی نہیں جی خطرے والی بات ہے۔ سمجھا کریں۔“

موتی نے آنکھ ماری۔۔۔

سوال پوچھنے والے کی آنکھوں میں چمک جاگی۔ پوری توجہ سے بولا۔

”مجھ سے کیا خطرہ۔ تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو۔“

”او جناب جی آپ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ میں تو اس بات سے ڈر رہا ہوں۔ کہیں کوئی مریض نہ اپنی

گفتگو سن رہا ہو۔ خواہ مخواہ لینے کے دینے پڑ جائے ہیں۔“

”کیوں سی ڈیز کے کام میں کونسا کوئی کرپشن ہوتی ہے۔“

موتی ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنسا۔

”آپ بھی بھولے بادشاہ ہی ہو۔ جناب جی یہ جو آپکے سامنے موتی شہزادہ کھڑا ہے نا۔ بڑے کام کا آدمی

ہے۔ اسکو ایویں کیویں نہ سمجھا جائے۔ آپ کے اور میرے درمیان۔۔۔ میں انٹرنیٹ کی ساری فٹش ویب

سائٹس سے وڈیوز ڈاؤن لوڈ کرنے کے بعد سی ڈیز بھر بھر کر مارکیٹ میں سستے داموں بیچتا تھا۔“

اب تو سامنے والا دل ہی دل میں اُسکو داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔

”تو پھر وہ کام کیوں چھوڑا؟۔۔۔“

”چھوڑنا کیا تھا جناب جی بس غلطی ہو گئی۔ دو نمبر آدمی پر بھروسہ کر کے اُسکے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا تھا۔

سرمایہ اُسکا تھا۔ محنت میری تھی۔ جگہ کا کرایہ دونوں مل کر دیتے تھے۔ کام چل نکلا وہ بے ایمان ہو گیا۔“

”ایسا کرو۔ اس پیپر پر اپنا نام اور فون نمبر لکھ جاؤ۔ میں منجر سے مشورہ کر کے تمہیں بتا دوں گا۔“

موتی نے پیپر پین ہاتھ میں لیا۔ اور اپنا نمبر لکھ دیا۔

”فون کرو گے بھی یا ویسے ہی ٹال رہے ہو۔ اگر ٹالنا ہی ہے۔ تو ابھی بتا دو تو تاکہ میں کہیں اور ٹرائی ماروں۔ اس مہینے نوکری ڈھونڈنا ضروری ہے۔ ورنہ میرا بجلی کا میٹر کٹ جانا ہے۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔“

”کہا تو ہے۔ انتظار کرنا ایک آدھ دن میں فون آجائے گا۔ ایک بات بتاؤ اگر نوکری کسی دوسرے شہر میں ہوئی تو کیا تم کر لو گے۔“

”یار چاند پہ بھی ملتی ہے۔ تب بھی کر لوں گا۔ بس کوئی کام دلوا دو۔“

”ٹھیک ہے۔ جلد ہی رابطہ کریں گے۔“

”یعنی اب میں جاؤں؟“

”ہاں جی آپ واپس جاسکتے ہیں۔“

”اتنا بڑا دفتر ہے۔ کیا تم لوگ آنے والوں کو چائے پانی کا نہیں پوچھتے؟“

”سپیشلسٹ کے ماتھے پہ تیوری آئی۔“

”چائے پانی کا آفر ہم اپنے خاص مہمانوں کو کرتے ہیں۔ ہر ایرے غیرے کو نہیں۔“

”چلو جی یہ بھی اچھی ہے۔ انہی کو کھلاتے ہو۔ جو پہلے سے بھرے پیٹ آتے ہیں۔ کبھی کسی غریب کا بھی بھلا کر دیا کرو۔ اچھا اچھا گھورنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چار رہا ہوں۔ فون کرنا نہ بھولنا۔ ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے۔ موتی بڑے ہی کام کا آدمی ہے۔“

موتی باہر لوٹکل گیا۔ دوسرا آدمی سر جھٹک کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری سرور مرحوم ایک زمیندار تھا۔ جسکا تعلق ڈسکہ کے قریب ایک گاؤں سے تھا۔ جنت بی بی سے شادی ہوئی تو اللہ نے بھاگ لگا دیئے۔ دونوں میاں بیوی انتہا کے محنتی ثابت ہوئے۔ کھیتی باڑی کا کام پھیلتا چلا گیا۔ ماں باپ تو اتنے امیر نہیں تھے۔ مگر چوہدری سرور نے گاؤں میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ زمانے بھی بھلے تھے۔ روٹی کی خاطر ہی کئی لوگ کام میں ہاتھ بٹانے آ جاتے۔ کیونکہ گھر میں چوہدرائے جنت بی بی ہاتھ کی گھلی

کی طرف آجائیں۔ اُنکی اولاد بھی اب جوان ہے۔ جس میں سب سے بڑا کرم نواز اُس سے چھوٹی ہادیہ اور سب سے چھوٹا حق نواز جو ابھی میٹرک میں تھا۔

چوہدرائُن کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کی طرف سے بڑا ڈکھ ملا تھا۔ جب وہ عین جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ماں بیٹی کو اُسکے بچوں سمیت اپنے گھر لے آئی۔ علیحدہ رہائش بنا کر دی۔ ہر ماہ گھر چلانے کو ایک مخصوص رقم اُنکی لگی ہوئی تھی۔ اُسکے علاوہ بچوں کی پڑھائی وغیرہ کا خرچ بھی نانی خود دیتی تھیں۔ قیصرہ کی سب سے بڑی بیٹی کا نام خدیجہ ہے۔ جسکی شادی اُنہوں نے برادری سے باہر کر دی۔ وہ اپنے گھر میں خوش باش ہے۔ اُسکے بعد فاطمہ ہے۔ جسکا رشتہ اُسکے خالہ زاد کرم نواز سے کیا گیا ہے۔ سب سے چھوٹا عاقب جو تقریباً حق نواز کا ہی ہم عمر ہے۔ چوہدرائُن کو اپنے بچوں سے پیار تو بہت ہے۔ مگر اُنہوں نے کبھی اُنکو سر پہ سوار نہیں کیا۔ تینوں بیٹوں کو علیحدہ کر کے اُنکے درمیان جائیداد تقسیم تو کر دی ہوئی تھی۔ مگر ملکیت اُنکے نام نہیں کی تھی۔ سب سے بڑے بھائی نے ڈیری فارم بنایا ہوا تھا۔ جس میں چار سو سے زیادہ گائے بھینسیں تھیں۔ سارے علاقے میں اُنکا دودھ جاتا تھا۔ نوازش علی کا اپنا شیلر تھا۔ وہ ہر سیزن پر چاول اور گندم بڑے پیمانے پر خرید کر باہر ایکسپورٹ کرتے تھے۔ سب سے چھوٹے دھگیہ کے پاس ساری زمین کی دیکھ بھال کا کام تھا۔ ساتھ میں اُنہوں نے کٹائی والی مشینیں رکھی ہوئی تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس گھرانے پر اللہ کا خاص فضل ہے۔ تو غلط نہیں ہوگا۔

☆.....☆.....☆

”سر کیا آپ میرے آفس میں آسکتے ہیں؟“

”کیا سب ٹھیک ہے؟“

”مجھے آپ کو کچھ دیکھانا ہے۔“

”ابھی آیا۔“

اُس نے انٹرکام واپس رکھا۔ اپنا لیپ ٹاپ بند کرتا ہوا اپنے کیبن سے نکل آیا۔ میٹھیوں سے گزرتے ہوئے نیچے والی بلڈنگ میں داخل ہوا۔ سیدھے ہاتھ پہ پہلا کیبن منیر کا تھا۔ ہلکا سا ناک کر کے اندر آ گیا۔

”آئیں سر۔۔۔“

منیر چار بڑی بڑی سکرینز کے سامنے کمر پہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اپنے ہاس کے قریب آنے پر اُس نے ہاتھ سے سکرین کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ سارا کنٹینٹ دو منٹ پہلے اپ لوڈ کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کا سب اُسی ویب پہ ڈالا گیا ہے۔ جس پہ پچھلے ہفتے ڈالا گیا تھا۔“

ہاس کے چہرے پہ حد سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ کچھ لمبے سکرین کو غور سے دیکھنے کے بعد اُس کے منہ سے بڑی گندی گالی نکلی تھی۔

”کہاں سے اپ لوڈ کیا گیا ہے۔ اسکا آئی پی چیک کیا؟“

”سر آئی پی مل گیا ہے۔ میں کل تک اسکی پوری تفتیش کر کے آپکو تفصیل سے آگاہ کر دوں گا۔“

”کیا یہ ایک ہی فرد کا کام ہے؟“

”سر لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“

”سر کیا کرنا ہے۔ یہ سب یونہی رہنے دیا جائے؟ یا ہٹا دوں۔“

”جس ویب سائٹ پہ سارا مواد ڈالا گیا ہے۔ وہاں سے ہٹا دو۔“

”جی سر۔۔۔“

”نظر رکھو۔ کچھ بھی نیا آتا ہے۔ اطلاع کرو۔ اور ہاں نادرا کو ان سارے چہروں کی تصویریں بھیج کر انکی عمر اور آئی ڈی نکلواؤ۔ میں فرید کو کہتا ہوں۔ وہ کورٹ سے وارنٹ نکلوا لے گا۔“

”جی بہتر سر۔۔۔“

”اس چیز کا ختم ہونا بہت ضروری ہے۔ منیر یہ چیز زہر بن کر میری آنے والی نسلوں کو نگل جائے گی۔“

”سر آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے جو بھی کارروائی ہوئی ہے۔ وہ زیادہ تر بڑے شہروں میں تھی۔ اس دفعہ ایسا نہیں ہے۔ کوئی چھوٹا شہر ہے۔ ا۔“

”یوزر کے ہارڈ ڈرائیو تک رسائی حاصل کرو۔“

”جی سر۔۔۔“

وہ ماتھے پہ ٹھکرات کا جال لئے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے پلٹ کر بولا۔
 ”ان وڈیوز میں جتنی لڑکیاں موجود ہیں۔ اُن کے چہرے کی بسٹ کلو زاپ تصویریں لیکر مجھے فارورڈ کرو۔“
 ”جی سر“

”پھر جیسے ہی نادرا کی جانب سے جواب آئے مجھے بتاؤ۔“

”ایسا ہی کرونگا سر۔“

”شکر یہ منیر بلاشبہ تم ایک مہنتی لڑکے ہو۔“

”بہت نوازش سر۔“

وہ سر کو ذرا خم دیکر باہر نکل آیا۔

ایک نظر تمام کیمبرز کے بند دروازوں پہ ڈالی۔ میڑھیوں کی طرف آنے کی بجائے ٹیرس پہ نکل آیا۔ جو کچھ وہ ابھی اندر دیکھ کر آیا تھا۔ ایسا نہیں تھا۔ کہ اُس نے اس قسم کی کوئی چیز پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ مگر ہر دفعہ ایسی صورتحال کا سامنا ہونے پر اُس کے دل پہ گہری اُداسی چھا جاتی تھی۔

وہ ہمیشہ ایک ہی بات سوچتا۔ ”انسان اور جانور کے درمیان فرق کیا ہے؟“

ابھی وہ مزید سوچ کے گھوڑے دوڑاتا مگر فون کی سیپ نے یہ سلسلہ فی الحال ملتوی کر دیا۔

کالر آئی ڈی نے بتا دیا اُس کے افسر کا فون تھا۔

فون کان سے لگا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس اپنے آفس کو چل پڑا۔

”سر مجھے بس کورٹ وارنٹ کا انتظار ہے۔ میں اور میری ٹیم کارروائی کے لیے بالکل تیار ہیں۔“

”تم جانتے ہوتاں اُس آدمی کے پاس ڈوئل نشانی ہے۔ میری تازہ ترین اطلاعات کے مطابق وہ بیرون

ملک جانے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اگر وہ یہاں سے کامیابی کے ساتھ نکل گیا۔ ہمارا بہت بڑا نقصان ہوگا۔“

”سر میں ایسا ہونے نہیں دوںگا۔ میرے بندے چوبیس گھنٹے اُس پہ نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ایف آئی اے کو

میں نے اُس کی تفصیل مہیا کی ہوئی ہے۔ اگر خدائے خواستہ وہ میرے آدمیوں کو جھانسدیکر یہاں سے نکل بھی جاتا

ہے۔ تب بھی ائر پورٹ پر پکڑا جائے گا۔“

”وہ ایک بہت پیشہ ور مجرم ہے۔ اُس کے پاس ایک سے زیادہ نام کی آئی ڈی ہو سکتی ہے۔ اور یقیناً ہونی ہیں۔ جو رپورٹ تم نے مجھے پچھلے ہفتے دی تھی۔ اُس کے مطابق اُس آدمی کے پاس وہ ڈیوائس ہیں۔ جن سے پچاس فیصد ڈیٹا اپ لوڈ ہوا ہے۔ اُسکا ہمارے ہاتھ آنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر ثبوت کے ہم عدالت میں اپنا کیس نہیں لے جاسکتے۔“

”سر میں نے نادرا سے اُس کا ڈیٹا نکلوایا ہوا ہے۔ آپ میرا یقین کر سکتے ہیں۔ تو بڑی مہربانی ہوگی۔ کیونکہ میرے پاس سب ثبوت ہونے کے باوجود میں وارنٹ کے بغیر اسکواریسٹ نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ آدمی اس سارے گروہ کا سربراہ نہیں ہے۔ سربراہ تک پہنچنے کے لیے مجھے بڑی صفائی سے کام کرنا پڑے گا۔ تاکہ میں اس کے ساتھیوں کو محتاط نہ کر سکوں۔ سر اس سارے گند کے پیچھے بہت سے شرفا کی پشت پناہی کے ثبوت بھی مل رہے ہیں۔ اگر میں سر عام کارروائی کرتا ہوں۔ ہمارا کیس کہیں نہیں جائے گا۔ آپکو اور مجھے خریدنے کی کوشش کی جائے گی۔ جب ہم بکلیں گے نہیں تو ہمیں گولی مروادی جائے گی۔ یا ہماری فیملی کے ذریعے بلیک میل کر کے اس سارے کام سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ میں ہر قدم بہت سوچ کر اٹھا رہا ہوں۔ نادرا اور ایف آئی اے میں اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے ساری معلومات لے رہا ہوں۔ میں نے کوئی بھی کام پراپر چینل سے نہیں کیا۔“

”مجھے اگر تمہارے پراعتماد نہ ہوتا تو میں تمہیں اس کیس پر کبھی بھی کام نہ کرنے دیتا۔ تمہیں جہاں کہیں میری مدد کی ضرورت ہو۔ میں حاضر ہوں۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ اللہ حافظ۔۔۔“

”بہت شکریہ سر اللہ حافظ۔۔۔“

☆.....☆.....☆

سفیدی پوری طرح پھوٹ چکی تھی۔ راستے میں کہیں بھی رُکا نہیں جاسکا۔ کیونکہ فلائٹ پہنچنے والی تھی۔ وہ لوگ پہلے ہی لیٹ ہو رہے تھے۔ مگر جو فی گاڑیاں ائرپورٹ کو جانے والے راستے کو مڑیں دادی والی گاڑی تو سیدھی آگے نکل گئی۔ پر کوچ کو وہیں روک دیا گیا۔ سیکورٹی پہ مامور افسر آگے آیا۔ کوچ کے کھلے دروازے سے اندر دیکھتے ہوئے سامنے بیٹھیں خواتین کو

مخاطب کر کے بولا۔ ”آپ سب کے سب کہیں جا رہے ہیں؟“

”رخشندہ نے فوراً ہاں میں جواب دیا۔

”کیا میں آپ سب کے پاسپورٹ دیکھ سکتا ہوں۔“

”وہ کیوں۔۔۔؟“

”صرف ایک کارروائی ہے۔“

”مگر ہم میں سے تو کسی کا بھی پاسپورٹ نہیں بنا ہوا۔“

رضیہ چچی کی مصومیت دیکھنے لاق تھی۔ بولیں۔

”ہائے بھائی جب میرے ابا جی حج کر کے آئے تھے۔ پوری بس اُنکو لینے آئی تھی۔ تب تو کسی کا بھی

پاسپورٹ نہیں مانگا گیا تھا۔ آ خراب کیوں؟“

”محترمہ اگر آپ کے پاس پاسپورٹ ہی نہیں ہے۔ تو آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟“

اس سے پہلے کہ وہ دونوں دوبارہ سے کوئی جواب دیتیں۔ واسع اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر آچکا تھا۔

”دیکھئے جناب ہم یہاں اپنے بھائی کو لینے آئے ہیں۔“

”آپ ساری کوچ بھر کر فقط ایک آدمی کو لینے کے لیے آئے ہیں؟“

”جی سر۔۔۔“

”جسکو لینے آئے ہیں وہ کون ہے؟۔ اور کہاں سے آ رہا ہے؟“

”میرا چھوٹا بھائی ہے جناب۔ امریکہ پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ آج واپس آ گیا ہے۔“

سیوریٹی والے کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”آپ لوگ کہاں سے ہیں؟“

”ڈسکہ سے آئے ہیں۔“

باتوں کے دروان واسع نے دو ہزار ہزار کے نوٹ آفر کی مٹھی میں رکھے۔ اُس نے پچائیک کھلوادیا۔

واسع وہیں کھڑے کھڑے اپنی فیملی پر نظر ڈال کر بولا۔

”یہ پہلی اور آخری دفعہ میں نے آپ لوگوں کی خاطر رشوت دی ہے۔ چل پڑتی ہیں منہ اٹھا کر۔“

”تو اب کیا منہ گھر پہ چھوڑ کر آیا کریں؟“

واسع نے مُردہ کا شہ کو گھورا۔

”جتنی تمہاری زبان ایسی باتوں میں چلتی ہے۔ اگر پڑھائی کی جانب دھیان دو تو کوئی فائدہ بھی ہو۔“

”ہائے ہائے واسع بھائی کم از کم آپ تو سب کے سامنے بے عزتی خراب نہ کیا کریں۔“

”میں صرف تم سے ہی نہیں ساری پلٹون سے مخاطب ہوں۔“

”اوہ تو آپس پر وہ آپ اپنی زوجہ سے مخاطب ہیں۔“

”جی نہیں۔“

”کھائیں قسم۔۔۔“

”کوئی ضرورت نہیں سمجھتا ہوں۔ الٹی سیدھی قسمیں کھانے کی۔“

کوچ ایک جگہ رُکی سب نے شکر کیا۔ پہلے لڑکے باہر نکلے۔ اونچے لمبے قد، سادہ شلوار قمیضیں، پیاری صورتیں، پیارے رنگ، صحت مند چہرے، پھر لڑکیاں باہر آئیں۔ روایتی لباس، لمبے لمبے دوپٹے، کھلتے ہوئے رنگ، گچھ شرماتی ہوئیں۔ گچھ آنکھیں پھاڑ کر جائزہ لیتی ہوئیں۔ مائیں آئیں نفیس مہنگے لباس، ہاتھوں، کانوں، کلائیوں پہ سونا۔ چہروں پہ مُردہ باری رکھ رکھاؤ۔

انہیں دیکھ کر ہی انسان سمجھ جاتا تھا۔ کہ چوہدرائُن کو جو اتنا غرور ہے۔ خواہ مخواہ نہیں ہے۔ اُس نے واقعی اپنے خاندان کو سمیٹ کر رکھا ہوا ہے۔ جس پر اُسکو بڑا ناز ہے۔ وہ بڑی ہڈ سکون رہتی ہے۔

ابھی یہ سب چلتے ہوئے بیرونی ملک آمد والے ٹریمل کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ چوہدرائُن پہلے سے ہی اپنی اسٹنٹ ٹافف اور بیٹے زمان کے ساتھ موجود تھیں۔

لڑکیاں سیلفیاں لینے میں مگن ہو گئیں۔ لڑکے ادھر ادھر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے۔

آہستہ آہستہ لوگ آتے گئے آتے گئے۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ جسکو لینے کے لیے یہ لوگ یہاں آئے تھے۔ پہلے اُلجھن ہوئی، پھر پریشانی۔

اتنے میں واسع کے فون پہ کال آگئی۔

”مجھے پتا چلا ہے۔ آپ لوگ مجھے لینے آئے ہیں۔ پر نظر تو کہیں نہیں آرہے؟“

”یار ہم لوگ ادھر انتظار کر کر کے اکٹڑ رہے ہیں۔ تم باہر تو آؤ۔ ہم ادھر ہی ہیں انٹرنیشنل اریئول کے باہر۔“

”میں آتا ہوں۔“

واسع نے چوہدرائن کو فون کا بتایا سب کی سانس میں سانس آئی۔

دس منٹ بعد ہی وہ باہر آتا دیکھائی دیا۔

خاکی کے اوپر کالی شرٹ، خاکی بھاری بوٹ، بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اور کندھے پہ ایک ٹریولنگ بیک تھا۔ باقی دو بڑے سوٹ کیس ٹرائی میں رکھے تھے۔

سب سے آگے اُسکو زمان تاپا اور واسع ہی نظر آئے۔ بڑی خوش دلی سے ملا۔

مگر پیچھے موجود ساری فیملی پر نظر پڑتے ہی ماتھے پہ تیوری لیے بولا۔

”ساری بارات آئی ہے۔ ڈھول والے کو بھی لے آتے۔“

”اُف اللہ فریاد دو سال پردیس کی چکی بھی تمہیں نہیں بدل سکی۔ آتے ہی رُعب ڈالنا شروع ماں سے تو ملو۔ دن رات تمہیں یاد کرتی ہیں۔“

رخشندہ کے کہنے پر وہ ماں کے آگے ٹھکا۔ ہاری ہاری سب سے سلام دُعا ہوئی۔

دو چار منٹ کی کوفت کے بعد چہرے پہ مسکراہٹ نے جگہ بنا لی۔ سب سے اینڈ پہ وہ سیٹ پہ بیٹھی چوہدرائن کے پاس آیا۔

اُنہوں نے دونوں ہاتھوں میں اسکا چہرہ بھر کر پیشانی چومی ہاتھ سے اُسکے بکھرے ہوئے شرارتی بال سنوارے۔ اور بولیں۔۔۔

”تم میرے نوازش علی کے بچے ہو۔ مجھے اپنی ساری اولاد کی طرح عزیز ہو۔ اسی لیے بیماری کے باوجود تمہیں لینے کو خود آئی ہوں۔“

”بہت مہربانی۔ مگر اب اگر مجھ سے یہ توقع کی گئی کہ سب کے ساتھ مل کر اسلام آباد اور مری کی سیر کر کے ہی

گھر واپس جاؤں۔ تو بھول جائیں۔“

پھر اُسکی نظر تاشفہ پر پڑی۔

وہ تو پہچانا ہی نہیں۔

وڈی اماں نے اُسکے چہرے کی اُلجھن دیکھتے ہوئے تعارف کروادیا۔

”یہ تاشفہ ہے۔ تمہارے چھوٹے ماموں کی بیٹی۔ یہ میرے پاس نوکری کرتی ہے۔“

فریود نے سر تا پیر غور سے اُسکا جائزہ لیتے ہوئے۔ سر ہلا کر سلام لی۔

جواب میں تاشفہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے دیا۔ اُسکو فریود کی نظروں سے انتہائی کوفت

ہوئی۔ جو بیٹے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

”یہ فریود تو ہی بدتمیز ہے۔ اسکے بارے میں جتنی باتیں مشہور ہیں۔ تھینا سب کی سب سچ ہی ہیں۔“

اُس نے جواباً گھوری سے نوازا۔ فریود کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ ابھری ساتھ ہی اُس نے نظروں کا

زاویہ بدل لیا۔

اُتر پورٹ سے نکل کر قافلے نے فیصل مسجد کا رخ کیا۔ فریود اپنے تایا کے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ اس دفعہ

اُسکی امی بھی گاڑی میں موجود تھیں۔

ایک تو بیٹے کے قریب رہنے کی خواہش دوسرا تاشفہ سے دور رکھنے کی شعوری کوشش۔ سارا راستہ وہ اُس سے

سوال و جواب کرتی رہیں۔

وڈی اماں چونکے سب سمجھ رہی تھیں۔ اسلئے ناگواری سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ بڑا دیتیں۔

فیصل مسجد گھومنے اور بہت سی فیملی تصویریں لینے کے بعد اُن لوگوں نے شکر پڑیاں کا رخ کیا۔ راستے میں

پیک کروایا گیا کھانا بھی وہیں بیٹھ کر کھایا۔

سارے انجوائے کر رہے تھے۔ سوائے فریود کے جو گاڑی میں سو گیا تھا۔ اُسکے خیال میں اتنی لمبی فلائٹ کے

بعد اُس میں ذرا ہمت نہیں تھی۔ پکنک منانے کے لیے کسی اور دن کا انتخاب کر لے گا۔

سارے ٹولیوں کی شکل میں بکھر گئے۔ تاشفہ آج بھی آن ڈیوٹی تھی۔ مگر اُسکا اور اماں وڈی کا تعلق ان دو

سالوں میں اس نوعیت کا ہو چکا تھا۔ اب وہ دوست زیادہ تھیں۔ ماکن اور ماتحت والی بات کم ہی رہ گئی تھی۔
اس وقت بھی اُنکا ہاتھ تمام کرساری سیر کرواتے ہوئے وہ بولی۔
”ایک مشورہ دوں۔“

”دئے لو بھی مشورہ سننے پر میں کونسا فیس چارج کرتی ہوں۔“
”آپ فیس چارج کر بھی نہیں سکتی ہیں۔ ہر وقت تو خود دوسروں کو نصیحتیں کر رہی ہوتی ہیں۔“
”بول بھی چکو۔۔۔“

”آپ اپنے لیے وہیل چیر بنوالیں۔“

”واہ کیا مشورہ دیا ہے۔ یعنی تم چاہتی ہو۔ یہ جو میری ہڈیوں میں تھوڑا دم خم رہ گیا ہے۔ وہیل چیر کی محتاجی
لیکروہ بھی گنواں لوں۔ بڑی عقل کی بات کی ہے۔“
”یہ بات نہیں ہے۔ دیکھیں اتنی لمبی لمبی واک سے تھک بھی تو بہت جاتی ہیں۔“

”تھکاوٹ کا کیا ہے۔ فائدہ بھی تو دیکھو رات کو بڑی بے سکون نیند آتی ہے۔ کل ٹی وی شو پر ایک لڑکی کہہ رہی
تھی۔ جتنا ہم چلتے پھرتے ہیں۔ بڑی عمر میں آکر ہمارا جسم اتنا ہی سہولت میں رہتا ہے۔ جو ایک دفعہ دل چھوڑ کر
بیڈ پہ لیٹ جاتے ہیں۔ کبھی اُنھ نہیں پاتے۔ میرے لیے تو کتنے ہی لوگ انتظار میں ہیں۔ مائی کل کی مرنی آج
مرے تاکہ اپنی زندگی اپنی مرضی اور اصول سے گزاریں۔ میری بات لکھ کر رکھ لو ادھر میری آنکھیں بند ہونی ہیں۔
ادھر تمہاری پھوپھی نے اپنا مال اسباب اٹھا کر شہر کا رخ کر لیا ہے۔ بڑی دفعہ باتوں باتوں میں جتا چکی ہے۔
اُسے گاؤں اور گاؤں کا ماحول پسند نہیں۔ اپنے بیٹے کی ہر مئی عادت کو بھی وہ گاؤں کی صحبت کا اثر سمجھتی ہے۔“
”آپ نے بات چھیڑی ہے۔ تو مجھے یاد آیا۔ کیا آپ مجھے کچھ عرصہ کی چھٹی دے سکتی ہیں؟“

”کیا ماں بہنوں سے اُداس ہو؟“

”نہیں ابھی پچھلے ہفتے مل کر جو آئی تھی۔ اُداس تو اتنی نہیں ہے۔ پر آپ کہ بہو کا بیٹا آ گیا ہے۔ آپکو تو علم ہے
۔ وہ ہم لوگوں سے کس قدر نفرت کرتی ہیں۔ اُنکے بیٹے میں تو ذرا شرم حیا نہیں یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے
تھے۔ اگر یہی عالم رہا۔ پھوپھی نے مجھ پر الزام لگا دینا ہے۔ کہ میں اُنکے بیٹے پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔“

”اپنی عمر دیکھو اور جو بات ابھی تم نے کی ہے۔ اُس پہ غور کرو۔ جو میں تمہیں فرعون کی ہم عمر کہتی ہوں۔ ایویں تو نہیں کہتی۔“

”سخت بُرا لگتا ہے۔ جب آپ مجھے فرعون کی ہم عمر کہتی ہیں۔“

”لگتا ہے۔ تو لگتا رہے۔ اور میری بہو سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہاں میری مددگار کے طور پر نوکری کرتی ہو۔ اُسکے گھر نہیں رہتی ہو۔ میں تمہیں تنخواہ دیتی ہوں۔ اُسکے باپ کا کیا جاتا ہے۔ اُس کے اندر اگر اتنا ہی نخرہ ہے۔ تو اپنے بیٹے کو قابو کرے۔ دوسروں کی بچیوں پر اُننگی نہیں اٹھانے دوں گی۔ میری زندگی میں یہ نہیں ہوگا۔“

”وہ ہر بات آپ کے سامنے نہیں کرتی ہیں۔ مگر میں کہہ رہی ہوں۔ فریود کے سامنے اُنہوں نے نکل وقت اپنی نظریں مجھ پہ ہی رکھنی ہیں۔“

”میں فریود کو سمجھا دوں گی۔ تم مجھ سے پہلے جانے کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ تمہارے بغیر تو اب میرا ایک دن نہیں گزرتا۔ نہ کسی کو تم جیسے کپڑے استری کرتے آتے ہیں۔ نہ تمہاری طرح سر میں مالش کر کے چوٹی بنانا جانتی ہے۔ کچھلی دفعہ تمہاری غیر موجودگی میں خرا کو میں نے کہہ تو دیا میری چوٹی بنا دو۔ مگر اُس نے کھینچ کھینچ کر سر درد لگا دی۔“

”جیسے مجھے پیسے دیتی ہیں۔ اُنکو بھی دے دیا کریں۔ تب وہ بھی آپکا کام دل لگا کر کریں گی۔ اُنکو تو کھری کھری سنا کر خود سے دور کیا ہوا ہے۔“

”آئے ہائے یہ سب باتیں ہوتی ہیں۔ جھلی دھی۔۔۔ جن کے دل میں چاہت ہو وہ ماؤں کی لعن طعن سُن کر بھی منہ نہیں موڑتے۔ وہ اپنی رحمت بی بی کو دیکھا ہے۔ اُسکو ذرا کچھ ہو جائے۔ بیٹے منہ چومتے ہیں۔ میرے بیٹے دروازے میں دور سے کھڑے ہو کر ہی حال احوال پوچھ کر بڑا احسان کرتے ہیں۔“

”جانے دیں۔ کچھلی دفعہ جب آپکی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ سارا گھرا تپا پریشان تھا۔ کھانا تک کھانے بنانے کا کسی کو ہوش نہیں رہا تھا۔“

”تم تو ہو ہی گوند سے بنی جوڑنے کی تمہیں بڑی عادت ہے۔ رشتے ہوں یا دل۔۔۔ ورنہ جانتی ہوں۔ سب کیوں پریشان ہو گئے۔ مائی مر گئی تو جائیداد کی تقسیم میں کتنا مسئلہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے۔ میں نے اپنی بچیوں اور

بیٹوں کا جائیداد میں جو جو حصہ رکھا ہے۔ اپنی وصیت میں لکھ چھوڑا ہے۔ کہیں ایک پیسے پہ لڑائی نہیں ہوگی۔“
 بہت خوبصورت موسم اوپر اے اسلام آباد کی ہوائیں اور منظر سب مل کر بڑا اچھا تاثر چھوڑ رہے تھے۔ وہ
 دونوں ساتھ چلتے ہوئے۔ لمبا راؤ ٹڈلگا کرسی پارک دیکھ آئیں۔ حرا لوگ میوزیم کے اندر گئی ہوئی تھیں۔
 سارے لڑکے گروپ کی شکل میں بیٹھے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اماں وڈی پہ نظر پڑتے ہی
 واسع اپنی جگہ سے اٹھا۔

”چوہدری صاحب مانا کہ آپ جوان ہیں۔ پر پھر بھی تھوڑا ہولار کھیں۔ آج کی جوان نسل سے ہی کچھ سیکھ
 لیں۔ گاڑی سے نکل کر ادھر آئے تھے۔ ابھی تک ادھر ہی جھے ہوئے ہیں۔“
 وہ واسع کی خالی کی کرسی پہ بیٹھ گئیں۔

پانی کا ایک گھونٹ لیکر بولیں۔
 ”بھئی تم لوگ تو یہاں لڑکیاں تاڑنے آئے ہو۔ میں تو کھومنے آئی ہوں۔“
 لڑکے ٹھاٹھا کر کے ہنسے۔

”قسم لے لیں۔ جوان گناہگار آنکھوں نے جس کو بھی دیکھا ہو اُس نے جواب میں مسکراہٹ نہ بھینکی ہو۔
 یہاں تک کہ نمبر مل جانے کا چانس بھی پورا ہے۔ پر اپنے حاجی صاحب اجازت ہی نہیں دیتے۔“
 عدیل کا اشارہ واسع کی جانب تھا۔ وہ عمر میں سب لڑکوں سے بڑا تھا۔ انتہائی شریف اور سلجھا ہوا ہونے کی
 وجہ سے لڑکے اُسکو حاجی بولتے تھے۔ کچھ اُس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ نماز روزے کا پابند نہ خود کوئی گری ہوئی
 حرکت کرتا۔ نہ ہی اپنی بھائیوں کو کرنے دیتا۔ وہ ہر لڑکے کی سرگرمی پر نظر رکھتا تھا۔ بڑی بات یہ کہ سب اُسکی
 سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے اسکے رُعب میں آ جاتے تھے۔

ہاماں لڑکیوں کو نکالیں کیونکہ تھوڑا وقت دامن کوہ چلتے ہیں۔ پھر واپس گھر کہ راہ لیں گے۔“
 زمان علی نے آکر کہا تو اماں وڈی واسع کی جانب دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

”زمان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ واسع جاؤ تم لوگ اُنکو لے آؤ۔ میں گاڑی کی جانب چلتی ہوں۔“
 ”جی اچھا۔“

اس دفعہ زمان علی نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ساتھ لیکر چل پڑے۔

تاہفہ بھی پیچھے پیچھے تھی۔ واسع لوگ دواری جانب نکل گئے۔

موبائل واہیرٹ ہوا۔ تصویریں لینے کی نیت سے ابھی تک موبائل ہاتھ میں ہی پکڑا ہوا تھا۔
لاک کھول کر میج دیکھا۔

”میں صبح والے مطالبے پر ابھی تک قائم ہوں۔“

تاہفہ کو ہنسی آئی۔ فوراً شیر بن کر جواب لکھا۔

”میں اپنی پھوپھی کی فیملی کے ساتھ اُنکے بیٹے کو لینے آئی تھی۔ اس وقت گھر سے باہر ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔ اسلام آباد میں ہو۔ یہاں پر تو ملاقات کرنا اور بھی آسان ہے۔“

تاہفہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ بھی تو نہیں تھا۔

”نہیں ہم اب واپس جانے والے ہیں۔ ملاقات کا وقت نہیں ہے۔“

”ملاقات کا یہی وقت ہے۔ اور آج کی تاریخ میں ہی ہوگی۔ بتادوں میں اس وقت پارک میں تم سے چند گز

کی دوری پر موجود ہوں۔ کیا تم میرے پاس آ سکتی ہو؟“

”ہرگز بھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں خود آ جاتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ پلیز آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو میں آئندہ بات تک نہیں

کروں گی۔“

”اور اگر تم میرے اتنے قریب ہو کر ملے بغیر نکلیں تو میں جو کروں گا۔ اُس کا تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے۔“

”آپ کیا مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“

”نہیں جانے من مطلق کر رہا ہوں۔ اپنے پیچھے دیکھو۔۔۔“

میتا کی انداز میں مڑی اور اُسکو چند قدم کی دوری پر کھڑا پایا۔ ہاتھ سے فون چھوٹے چھوٹے بچا۔ گھبرا کر

اماں وڈی اور اُنکل زمان کی جانب دیکھا۔

اسکے رُک جانے کی وجہ سے وہ تھوڑی آگے جا چکے تھے۔ وہ بھی فوراً بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے ہوں۔ اُس نے گردن موڑ کر ایک دفعہ اُس سمت دیکھا جہاں وہ کھڑا تھا۔
چند پل کو نظر ملی۔ تاشفہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سر دلہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ سنجیدہ چہرہ لیے بغیر پلکیں جھپکائے یک ٹک اُسکو دیکھے جا رہا تھا۔ تاشفہ کو لگا اگر مزید دو سیکنڈ بھی یہاں رُکی تو کبھی مل نہیں سکے گی۔ اس لیے ہمت کر کے بڑے بڑے ڈگ بھرتی اماں وڈی کے پیچھے بھاگ گئی۔
دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ آج اُس نے پہلی دفعہ اُسکو رو برد دیکھا تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر اُس نے مُردہ دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہ آیا۔ مگر واسع لوگ آرہے تھے۔
”تم اماں وڈی کی بجائے ہمارے ساتھ تھوڑا گھوم پھر لو گی۔ تو مرنے نہیں جاؤ گی۔“
عائشہ کے کہنے پر اُس نے اپنی نظریں اُس کے چہرے پر رکھیں۔
”اُنکو چلنے میں مدد چاہیے ہوتی ہے۔ اس لیے اُنکے ساتھ کسی کا ہونا ضروری ہے۔“
”ہاں تو امی اُنکا ساتھ دے دیتی ہیں۔ امی جائیں آپ اماں وڈی کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ تاشی کو میں اپنے ساتھ بیٹھا رہی ہوں۔ اماں وڈی کو بتا دیجئے گا۔“
وہ تاشفہ کا ہاتھ پکڑ کر کوچ میں لے گئی۔
جہاں سب سے پچھلی سیٹ پر فریود چادر اوڑھے بے خبر سو رہا تھا۔
”فریود بھائی آخر کتنے دنوں کی نیند پوری کر رہے ہیں۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ باہر دیکھیں تو سہی اسلام آباد کی شام کا خُسن پورے جو بن پر ہے۔“
وہ اس مداخلت پر آنکھیں مسلتا ہوا۔ اُٹھ بیٹھا۔
”میرے حصے کا تم ہی دیکھ لو۔ تمہارے پاس کھانے پینے کو کچھ ہے؟“ پوچھ وہ عائشہ سے رہا تھا۔ مگر دیکھ اپنی مغرور سی نظر آنے والی کزن کو رہا تھا۔ جواب بھی بھی اُڑے ہوئے رنگ سے باہر دیکھنے میں مصروف تھی۔
فریود کی آواز سُن کر ہی اُسکی والدہ ا یکٹیو ہو گئی تھیں۔ فٹ آگے سے آواز آئی۔

”فریود چندہ ادھر آ جاؤ۔ میں نے تمہارے لیے پانی وغیرہ لیا تھا۔ آؤ کچھ کھاؤ۔“
عائشہ کی زبان میں کھلی ہوئی۔

”چھوٹی تائی نالڑکیوں کی طرح آپکا خیال رکھتی ہیں۔ ہماری مائیں مجال ہے جو کبھی ہماری ٹینشن لے جائیں۔ کیا کھا رہی ہو۔ کس سے لیکر کھا رہی ہو۔ کس سے بات کر رہی ہو۔ پر آپکی اماں آپ باہر بھی تھے۔ تو بس یہی وظیفہ کرتی رہی ہیں۔ یا اللہ میرا بیٹا کسی لڑکی کے چکر میں نہ پڑ جائے۔“

”تم جیلس ہو کہ تمہیں اتنی توجہ نہیں ملتی۔ یا پھر مجھے میری ماں کے خلاف بھڑکانا چاہ رہی ہو۔“

بھاری سوئی ہوئی آواز میں بولا تو عائشہ کے علاوہ ساری لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

”ہاں تو جیلس ہونا بنتا ہے ناں۔ کیوں ملے آپکو اتنا پروڈوکال ہم کیا کسی سے کم ہیں؟۔“

”سارا پروڈوکال لے لو۔ میں ہاتھ جوڑ کے بنتی کرتا ہوں۔“

فریود آ جاؤ بیٹا شوارمہ منگوا یا ہے۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”ممائی میں نے بھی شوارمہ کھانا ہے۔ بلکہ ہم سب نے کھانا ہے۔“

فاطمہ نے نعرہ لگایا۔ فریود جانتا تھا۔ جب تک امی کے پاس جا کر نہیں بیٹھے گا۔ وہ اُسکو آوازیں دیئے جائیگی۔ اس لیے اُٹھ کر آگے آ گیا۔ اکلوتا بچہ ہونے کے کبھی کبھی منہ منہ بھی ہوتے ہیں۔ وہ وہی نتائج بھگت رہا تھا۔ گاڑی میں ہی سب کے لیے شوارمہ آ گیا۔ سارا راستہ کھاتے اور گیس لگاتے گزرا۔

”اب گھر چلنا ہے۔ یا ابھی کہیں رکنے کا پروگرام ہے؟۔“

”دامن کوہ جاتے تو بہت اندھیرا ہو جائے گا۔ اس لیے اب صرف راولا ڈیم رکیں گے۔ اُسکے بعد واپس

گھر۔“

واسع اور فریود باتوں میں مصروف ہو گئے۔

تاشقہ شوارمہ ختم کرنے کے بعد ٹشو سے اپنا منہ صاف کر رہی تھی۔ جب فون نے دائیہر بیٹ کیا۔ سب کی باتوں کے شور میں کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ اُس نے ہاتھ بیگ میں ڈال کر فون آف کر دیا۔
عائشہ وغیرہ کیسا منہ فون کے میسج دیکھنا تو ممکن ہی نہیں تھا۔

اُس نے سیٹ کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔ تو آنکھوں میں ہونے والی جلن سے پانی جمع ہو گیا۔ کبھی کبھی اپنے مرحوم والد سے ہلکا سا شکوہ جاگتا تھا۔ جو جانے سے پہلے اُسکی زندگی کو ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال گئے ہوئے تھے۔ اُسکا اپنی زندگی پہ کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ امتحان یا تو اُسکی جان لینے والا تھا۔ یا پھر عزت کا جنازہ ہی نکلتا تھا۔ اور دونوں باتیں خطرناک تھیں۔ بڑی باجی کی شادی کے بعد اب وہی اپنی ماں اور چھوٹی دونوں بہنوں کی کفالت کر رہی تھی۔

اُن دنوں وہ کسی سکول میں نوکری ٹھونڈنے میں مصروف تھی۔ کیونکہ اُنکے علاقے میں آ جا کر یہی ایک کام نظر آتا تھا۔ یا پھر اپنا سالون کھول لیتی۔ اُس کے لیے بھی اُس نے ڈیڑھ سال لگا کر بیوٹیشن کا کورس کیا۔ مگر ایک مہینہ کسی اور کے بیوٹی پارلر میں ٹرائل دیکھنے کے بعد اپنا سالون کھولنے کا ارادہ بدل گیا۔ وہ مختلف لوگوں کے چہروں کے مساج اور منہ سے نکلنے والی باس برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ویسے بھی اُس وقت وہ اتنا گھر سے باہر نہیں آتی جاتی تھی۔ اور پارلر میں صبح سے شام تک ایک کے بعد ایک نئی عورت سے ملنا وہ بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملتا۔ جب کے تب وہ کسی کی سلام کا جواب تک نہ دے پاتی تھی۔ ابو کی سالانہ برسی پہ پھوپھو اپنی ساس کے ساتھ آئی ہوئیں تھیں۔ چاچو اور تایا ابو بھی موجود تھے۔ جب امی نے ذکر کیا۔

”بھائی صاحب اگر کسی سکول میں نوکری مل جائے تو تافہ کے لیے کوشش کیجیے گا۔ ڈسکہ میں دو جگہ انٹرویو دیکر تو آئی ہے۔ مگر آپ تو جانتے ہیں۔ یہ زیادہ فری نہیں ہوتی فی ای کسی پر اعتبار کرتی ہے۔ تو اگر کسی اپنے جاننے والے کے سکول میں نوکری مل جائے تو مجھے اسکی جانب سے تسلی رہے گی۔“

امی نے کہا تو تایا اور چاچو سے تھا۔ مگر دو دن بعد جواب چوہدرانی کی جانب سے آیا۔ تافہ کے اپنے گھر فون کی سہولت نہیں تھی۔ مسائی نے آ کر پیغام دیا۔ تمہاری پھوپھی شیم کی ساس کا فون آیا ہے۔ اُس نے باجی کوثر کو بلایا ہے۔ امی جا کر فون سن آئیں۔ سوچوں میں ڈوبی واپس آئیں۔ تافہ سے بڑی سیما کے پوچھنے پر اُنہوں نے ساری بات کھول کر بتادی۔

”چوہدرانی کہہ رہی ہیں۔ اُنکو اپنے ذاتی کاموں کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔ جو حساب کتاب بھی

جانتی ہو۔ تاکہ انکا بینک اکاؤنٹ وغیرہ دیکھ سکے۔ سلیقے مند ہوتا کہ اُن کے کپڑوں وغیرہ کا خیال کرے۔ اخبار پڑھ کر سنا سکے۔ اور بڑی بات یہ کہ اُسکو رہنا بھی اُنکے ساتھ ہوگا۔ رہائش اُنہی کے کمرے میں ہوگی۔ اس سب کے بدلے میں مہینے کی تیس ہزار تنخواہ دینے کو تیار ہیں۔“

بتانے کے دوران وہ تاشفہ کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

سیماب سمجھتے ہوئے بولی۔

”کیا یہ آفر اُنہوں نے تاشی کو کی ہے۔؟“

”ہاں۔۔۔ کہتی ہیں اگر تاشفہ راضی ہو تو میں اُسکے کھانے پینے پہننے اوڑھنے کا سارا خرچہ اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔“

”میں وہاں کام نہیں کروں گی۔“

”ایسے ایک دم سے تو انکار نہ کرو پاگل لڑکی۔“

”آپ پھوپھی کے گھر جا کر رہنا چاہیں تو رہ لیں۔ مجھے وہ اس قدر نفرت سے دیکھتی ہیں۔ جیسے مجھے اچھوت ہے۔ اُنکے دیکھنے پر ہی اُنکو بیماری لگا دوں گی۔ میں ہرگز بھی ایسی جگہ نہیں جاسکتی جہاں وہ ہوگی۔“

”پر میری جان تمہیں کونسا اُسکے منہ لگنا ہے۔ ایسے گھر میں بند ہو کر بھی تو گزارا نہیں ہو سکتا۔ تمہارے باپ کی جو تھوڑی بہت پر اپرٹی ہے۔ تمہارا تایا رو دھو کر کرایہ دیتا ہے۔ سیماب بھی اتنی محنت کے بعد صرف دس ہزار کمپاتی ہے۔“

”میں ہی کیوں اگر یہ آفر اتنی ہی اچھی ہے۔ تو باجی کو کروالیں۔ میں ہرگز وہاں نہیں جاؤں گی۔“ پھوپھی کے گھر کا سوچ کر ہی جان نکل رہی تھی۔ وہاں جا کر رہنے اور نوکری کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

”وہ پہلے ہی فیکٹری میں لگی ہوئی ہے۔ وہاں پہ ترقی کا چانس بھی ہے۔“

”امی میری طرف سے نہ سمجھیں۔ میں کوشش مزید تیز کرتی ہوں۔ جہاں بھی ہاں ہوئی اُسی سکول میں لگ جاؤں گی۔ چاہے تنخواہ اچھی نہ بھی دیں۔“

”بیٹی بڑے اچھے سکول بھی اپنی اُستانوں کو زیادہ سے زیادہ دس ہزار دے رہے ہیں۔ تمہاری تو تعلیم بھی

واجبی سی ہے۔ کسی انگلش میڈیم میں تو نوکری ملنی نہیں ہے۔ کسی عام سے گلی کوٹنے میں کھلے سکول میں مل بھی جائے تو سارا دن سر کھپائی کے بعد مر کے ہزار دو ہی ملتا ہے۔ اور ہمارے گھر کے حالات ایسے ہیں جن میں ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے۔ تیس ہزار منہ سے کہہ دینا آسان ہے۔ ہم لوگ کئی ماہ کی محنت کے بعد بھی اتنی رقم نہیں بنا سکتے۔“

سیماب نے بھی سمجھاتے ہوئے مشورہ دیا۔

”بہتر یہی ہے۔ فٹ سے جواب دینے کی بجائے سوچ سمجھ کر جواب دو۔ پھوپھو کے گھر میں اُنکی ساس کی ہی بات چلتی ہے۔ اُنکی تنقید اور طعنے صرف ہمارے لئے ہی ہیں۔“

”باجی وہ مجھے وہاں برداشت نہیں کریں گی۔ ادھر چند گھنٹوں کے لئے آتی ہیں۔ وہ بھی مہینوں سالوں بعد۔۔۔ میرے سلام کا جواب نہیں دیتی ہیں۔ میرے ہاتھ کا دیا پانی کا گلاس تک پینا برداشت کرتیں۔ اور آپ کہہ رہی ہیں۔ میں چوبیس گھنٹے اُنکی نفرت بھری نظروں کے تیر کھانے کے لیے اُنکے گھر ہی جا بیٹھوں۔“

”ہاں تو اچھا ہے ناں اُنکے سینے پر بھی مونگ دلی جائے گی۔ ساس کے سامنے چوں بھی نہ کر پائیگی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو سارے بدلے لینے کا یہ سنہری موقع کبھی نہ گنواؤ۔“

اگلے دو دن تک وہ انتظار کرتی رہی۔ جن سکولوں میں انٹرویو دیا تھا۔ وہاں سے جواب آجائے مگر مکمل خاموشی رہی۔

اگلے دن صبح ہمسائی آئی۔ تاحفہ تمہاری سہیلی کا فون ہے۔ تاحفہ کو اُمید جاگی دوست کسی کا تو نہیں ضرور سکول والوں کا فون ہوگا۔ اُنہی لے پاس نمبر دیا تھا۔ دوست کسی کو تو آج تک نمبر دیا ہی نہ تھا۔

بڑے جوش سے جا کر ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو۔۔۔؟“

”اسلام علیکم۔۔۔ تاحفہ؟۔۔۔“

”وعلیکم اسلام جی بول رہی ہوں۔“

”کیسی ہو؟۔۔۔“

”میں ٹھیک ہوں۔ مگر آپ کون ہیں؟۔“

”تمہارا کوئی بہت اپنا کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟۔۔۔“
”جی نہیں۔“

”آف کاش میں رو برو کھڑے ہو کر تمہیں یہ الفاظ ادا کرتے دیکھ سکتا۔“
تافہ کے دماغ میں کچھ کلک کیا۔

”آپ۔۔۔؟“

”ہاں میں۔“

اس کے بعد دونوں جانب خاموشی چھا گئی۔ وہ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے بمشکل فون
تھامے کھڑی تھی۔ ماتھے پہ پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

”تافہ۔۔۔؟“

”جی۔۔۔؟“

”کبھی میری یاد آئی ہے؟۔۔۔“

”وہ کیوں؟۔۔۔“

اُس کے سوال پر دوسری جانب محفوظ سی ہنسی کی آواز اُبھری۔۔۔

”مجھے تم بہت یاد آتی ہو۔ ہر وقت ہر پل ہر لمحہ۔۔۔“

”آپ کی با۔۔۔ بات مکمل ہو گئی ہو تو میں جاؤں؟۔۔۔“

”کیا تمہیں میرا فون کرنا اچھا نہیں لگا؟۔“

”پتا نہیں۔۔۔“

”تم بہت معصوم ہو۔“

تافہ کا دل دھڑک اُٹھا۔

”نہ نہیں ہوں۔ میں سب کچھ ہوں۔ پر معصوم نہیں ہوں۔“

وہ ناخن سے دیوار کا پینٹ اکھیڑنے لگی۔ آواز میں ضد تھی۔ دہ دہ سا غصہ تھا۔

”کسی کو خود سے کبھی علم نہیں ہوتا وہ معصوم ہے یا نہیں۔ جب میں کہہ رہا ہوں۔ تم معصوم ہو۔ تو مان لو کہ تم معصوم ہی ہو۔“

”آپ یہ کہنے والے کون ہوتے ہیں۔ اور کیوں میں آپ کی بات کا یقین کروں۔ آپ میرے ہیں ہی کون۔“
دوسری جانب خاموشی میں گہری سانس خارج کی گئی۔ پھر بڑے تحمل سے بولا۔

”اپنی معصومیت کا اس سے بڑا بھی کوئی ثبوت چاہتی ہو۔ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ میں تمہارا کون ہوں؟۔ اُتو سنا جانے من میں تمہارا سب کچھ ہوں۔“

”آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔“

”شوق سے رکھو۔ پر جو نوکری کی آفر آئی ہے۔ اُسے قبول کر لو۔“

”اگر نہ کروں تو؟۔۔۔“

”تو میں تمہیں مہینے کا خرچ گھر بیٹھے ہی بھیج دیا کروں گا۔ کہیں بھی نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ کال کاٹ کر گھر آ گئی۔ ٹھکر ہوا۔ ہمسائی پاس اپنی چھت پر کپڑے ڈالنے لگی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ سو سوال کرتی تھی۔ کس کا فون تھا۔ یہ وہ۔۔۔

چوہدرانی کا دوبارہ فون آیا تو امی نے انکار کر دیا۔ اگلے ماہ چھوٹی بہن کو ہیضہ ہو گیا۔ اُسکے علاج کے لیے ماں کے پاس پیسے نہ تھے۔ تاحق سے دیکھا نہ گیا۔ ماں کو پریشانی میں گھر ادیکھ کر اپنا آپ مجرم لگنے لگا۔

خود کو تنہائی میں بیٹھ کر سمجھایا اگر ماضی میں میرے ساتھ کوئی بُرا واقعہ ہوا ہے۔ اُس میں میری بہنوں کا کیا قصور؟۔ میرے ساتھ ساتھ یہ کیوں سزا بھگتیں؟۔ اگر میں اپنی ماں کے کندھوں سے تھوڑا سا بھی بوجھ ہٹانے

میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہوں۔ تو میں کیوں نہ ماں کی مدد کروں؟۔ آخر یہ وہی ماں ہے۔ جس نے مجھے تڑپتے دیکھ کر کئی دن تک پانی کا ایک گھونٹ تک لیوں سے نہیں لگایا تھا۔ میرے اور دنیا کے درمیاں ایک دیوار بن کر کھڑی

ہو گئی تھی۔ شیرنی کی طرح میری طرف بڑھنے والی ہر زبان کو کاٹنے دوڑتی تھی۔ میں اس کا حق کیوں کراوا کر سکتی ہوں۔ اس کی جھولی میں پہلے ہی بڑے غم ہیں۔ اولاد دکھونے کا دکھ۔ سہاگ کے اُجڑنے کا دکھ وہ آخر کتنے زخم

سینٹ سکتی ہے۔ میری طرح عام گوشت پوست کی انسان ہی تو ہے۔

تہائی میں بیٹھ کر آنسو بہائے خود ہی پونچھ لئے۔۔۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے۔ جو لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے اشک صاف کرنے کی بجائے کسی کے انتظار میں رہتے ہیں۔ آنسو کبھی بھی اُنکا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ جیسے کوئی اور انسان آپ کے لیے اُس تڑپ اور لگن سے دُعا نہیں کر سکتا جیسے آپ خود اپنے لیے اپنے رب سے مانگ سکتے ہیں۔ اسی طرح اپنے اشک بھی خود سے صاف کرنے کا ہنر ہر خاص و عام کو آتا ہونا چاہیے۔

اُس نے امی کو بھیجا وہ جا کر پی سی او سے چوہدرانی کو فون کر کے آئیں۔ کیا اب بھی وہ تافہ کو اپنے ساتھ رکھنے اور نوکری دینے پر تیار ہیں۔

دوسری جانب سے ہاں میں جواب آیا۔ دوسرے ہی دن ڈرائیور ایڈوانس کی رقم لیکر آ گیا۔ جو تافہ کی ماں کے حوالے کی اور تافہ کو لیکر روانہ ہوا۔ حالانکہ تافہ کا تعلق پسرور سے تھا۔ مگر سات سال پہلے وہ لوگ سیالکوٹ شفٹ ہو گئے تھے۔ باقی کا اُسکا سارا دھڑیل لاہور میں تھا۔ ابونکھہ ذراعت میں ملازم تھے۔ مگر بھری جوانی میں دل بے وفائی دے گیا۔ وہ سولہ سال کی تھی۔ جب ابواس دنیا سے چلے گئے۔ زندگی پہلے ہی امتحان تھی۔ مگر باپ نے اپنے پروں میں مچھا کر رکھا ہوا تھا۔ اُنکے جاتے ہی لگا کسی نے ٹھنڈی میٹھی چھاؤں سے نکال کر کڑی دھوپ میں جلنے کو پھینک دیا ہو۔ مگر کہتے ہیں ناں جسکا کوئی نہ ہو۔ اُسکا اللہ ہوتا ہے۔ اللہ پاک نے وقت کے ساتھ صبر دے ہی دیا۔ جینے کا ہنر بھی سیکھا دیا۔ مگر ہُانے روگ آج بھی دل کے تہہ خانے میں مجور قہص تھے۔

چوہدرانی نے اُسکے تمام خدشات غلط ثابت کر دئے۔ یہاں کسی کو بھی اُسکو حکم دینے یا بُد اسلوک کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اُنہوں نے پہلے ہی دن اپنی بہوؤں کو خبردار کیا۔

”تم لوگ بھی بیٹیوں والی ہو۔ اور مجھے یقین ہے۔ تم میں سے کوئی بھی بچوں کے سامنے تافہ کا بچپن نہیں کھولے گی۔ جس دن اس گھر میں اُس بچی کی ذات کا مذاق اُڑایا گیا۔ یا اپنی ذاتی عدوت کا شکار کیا۔ میں یہ گھر چھوڑ دوں گی۔“

شیم نے اُس وقت بھی اپنا احتجاج ان لفظوں میں نوٹ کروایا تھا۔

”آپ جانتی ہیں۔ اُسکا ہمارے گھر میں رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ جوان ہوتی لڑکیوں پر کیا اثر پڑے گا۔“

دوسرا لڑکوں سے بھرے گھر میں ایسی لڑکی کو لا بیٹھا سراسر حماقت ہے۔ کیا آپ کو نوکروں کی کمی ہے؟“

چوہدرائے نے واضح کر دیا کہ وہ کسی کے سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہے۔ کسی اور پر جب کوئی زور چلتا نظر نہ آیا تو تلافی کے گھر آنے سے پہلے ہی شیم نے بیٹے کا بندوبست کر دیا۔

بظاہر آج تک گھر کے سارے فرد یہی سمجھتے تھے۔ شیم نے فریودگی کسی لڑکی میں دلچسپی کا بھوت اُسکے سر سے اتارنے کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی۔ انہوں نے بیٹی سے بیٹے کو محفوظ کیا تھا۔ وہ فریودگی کو تلافی کے ساتھ ایک ہی گھر میں دیکھ ہی نہیں سکتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

گرمی میں نیند ویسے بھی بہت آتی ہے۔ خاص کر صبح کے وقت کوئی ماں کالال ہی منہ اندھیرے بیڈ چھوڑ کر روزمرہ کے دھندے کے لیے نکلتا ہے۔ کیونکہ جوں جوں دن نکلتا ہے۔ ویسے ہی نیند زیادہ طاقت کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے۔

پر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کے اوپر قدرے پیچھے کو سیٹ لٹا کر نیم دراز آدمی اس وقت صبح کے پونے پانچ بجے وقت ہونے کے باوجود پوری طرح چوکس تھا۔

اُس نے سر کے اوپر جو ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ اُسکو جان بوجھ کر آگے کو ٹھکا رکھا تھا۔ نظریں مسلسل بیک ویو مرر کے ذریعے فٹ پاتھ کو گھور رہی تھیں۔ اُس کو بڑی بے چینی سے کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ پچھلے کئی دنوں کی محنت کے بعد وہ اس آدمی تک پہنچا تھا۔ اور آج پوری کوشش تھی۔ وہ یہ کام کر ہی جائے گا۔

فٹ پاتھ پر منظر بد لنے کی دیر تھی۔ اُس کے جڑے کی ہڈی میں تھر تھراہٹ پیدا ہوئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر نکلا۔ گاڑی کی اگلی جانب بونٹ کھول کر بظاہر یہ تاثر دینے لگا جیسے گاڑی میں کوئی فالٹ ڈھونڈ رہا ہو۔ مگر توجہ اسی جانب تیزی سے بڑھتے آتے قدموں کی جانب تھی۔

جیسے ہی فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ جو گنگ کرتا ہوا ایک ادھیڑ عمر آدمی اُسکی گاڑی کے قریب آیا۔ انجن کا کور بند کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلنے والے کے ساتھ کندھائی مس کیا تھا۔ اب یہ تو کوئی بہت باریک بینی سے جائزہ لے رہا ہوتا۔ تو جان پاتا کندھے مس ہونے کے عمل کے دوران گاڑی والے لڑکے کے ہاتھ میں پکڑی سرنج میں

بھرا مانع مواد اس ادھیڑ عمر آدمی کے بازو میں خٹل کر دیا گیا تھا۔

سوئی کی پنجن محسوس کرتے ہوئے۔ وہ آدمی اس جوان کی جانب مڑا۔ جواب با آواز بلند گنتی گن رہا تھا۔
”ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ چار۔۔۔ پانچ۔۔۔“

ابھی وہ پانچ پر آیا ہی تھا۔ جب جوگنگ کرنے والا لڑکھڑایا۔ اس سے پہلے کے وہ زمین بوس ہوتا۔ گاڑی والے جوان نے اُسکے کندھوں میں دونوں جانب بازو ڈال کر کھینچ کر اپنی گاڑی کی فرنٹ بینجر سیٹ پر بیٹھ دیا۔ مزے کی بات یہ تھی۔ کہ نیم تاریکی میں بھی نظر آ رہا تھا۔ جوگنگ کرنے والے کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یقیناً وہ مدد کے لیے چیخنا چاہتا تھا۔ تاکہ کسی طرح اپنے گھر کے دروازے پہ رُکے گاڑ کو متوجہ کر پائے۔ مگر چیخنا چلانا تو دور وہ ہونٹ تک نہ ہلا پا رہا تھا۔

گاڑی والا لڑکا۔ بڑے اعتماد سے چلتا ہوا آکر اُسکے برابر بیٹھ گیا۔ اللہ کا نام لیکر گاڑی اشارت کر دی۔ جب وہ جائے حادثہ کو بہت پیچھے چھوڑ آیا۔ تو ڈیش بورڈ کے خانے میں سے ایک کالے کپڑے کی پٹی نکال کر اُس آدمی کی آنکھوں پر باندھ دی۔

وہ آدمی بڑی وقت سے فالج زدہ مریض کی طرح بولا۔۔۔
”ت۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔؟“

گاڑی چلانے والے نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ گردن موڑ کر اُسکی جانب دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔
”مجھے۔۔۔ جا جان تے نہیں۔۔۔ ہو۔۔۔“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جان گیا ہوں۔ اب تو اللہ کے فضل سے وہ وقت آیا ہے۔ جب تمہاری جوان اولاد نے تمہارے اندر کی کالک سے واقف ہوتا ہے۔“

وہ آدمی اپنی سیٹ پر ہلنے کی کوشش میں بُری طرح ناکام ہوتے ہوئے پریشانی سے بولا۔۔۔
”مہ مجھے کیا کر دیا ہے؟۔ میرا جسم محسوس کیوں نہیں ہو رہا ہے۔“

”فکر نہ کرو۔ مرو گے نہیں صرف بے ہوشی طاری ہوگی۔ وہ بھی دس سے بیس منٹ کے لیے اُسکے بعد بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

ابھی اُسکی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب برابر سیٹ پر موجود آدمی کا بے جان ہوتا سر پوری قوت سے ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ وہ بالکل غافل ہو چکا تھا۔

گاڑی چلانے والے نے سپیڈ بڑھائی اور گاڑی ہوا سے باتیں کرتی شہری آبادی سے نکل کر آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

راولہ ڈیم پہنچتے پہنچتے اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم وہ نہ جانے کب نیند میں چلی گئی۔

حرا باجی نے متوجہ کیا۔

”تاؤفہ اٹھ جاؤ بھی منزل آگئی ہے۔“

پہلی آواز پہ ہی آنکھیں کھول دیں۔ یوں نیند میں چلے جانے سے حیرت بھی ہوئی کیونکہ اُسکو تو نیند کبھی اتنی جلدی نہ آتی تھی۔ باری باری سب نیچے اتر رہے تھے۔ وہ لوگ چونکے سب سے اینڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سب سے آخر میں ہی باہر آئیں۔ اترتے ہی اُس نے وڈی اماں کی جانب قدم بڑھائے جو ابھی تک گاڑی میں ہی موجود تھیں۔

”کیا آپ سب کے ساتھ نہیں آرہی ہیں؟“

”اب میری یاد آئی بے وقافتہ کی پہلے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔“

”وہ عائشہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ آئیں آپکو باہر آنے میں مدد کروں۔“

”نہیں میرا دل نہیں کر رہا جانے کا۔ تم لڑکیوں کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں اور زمان گاڑی میں ہی انتظار کریں گے۔“

”میرا دل بھی نہیں چاہ رہا ہے۔ میں آپکے ساتھ ہی رُک جاتی ہوں۔“

”ارے یہ کیا بات ہوئی۔ میں تو ٹھہری بوڑھی ہڈیوں والی تم کیوں ایسے زندگی سے بھاگتی ہو۔ جاؤ شاباش

سب لڑکیوں کے ساتھ چلی جاؤ۔ انکی مائیں بھی جا رہی ہیں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”انکی مائیں ساتھ ہیں۔ میری ماں تو اس وقت آپ ہی ہیں۔ بس آپ نہیں جانا چاہتی ہیں۔ تو میں بھی

نہیں جاؤنگی۔ میں کونسا گھومنے پھرنے آئی ہوں۔ میرا کام تو بس آپکا خیال کرنا ہے۔“

”بہت ہی ضدی ہو۔ چلو میں ہی ہار جاتی ہوں۔ کھو لو دروازہ چلتی ہوں۔ بھلا دیکھوں تو آخر کیا ہے اس ڈیم میں جو ہم دیکھنے آئے ہیں۔“

تاشفہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کئی رشتے بڑے بے نام ہوتے ہیں۔ اُننگی پکڑ کر چلنے والے لوگ انہی رشتوں کی بدولت زندگی میں آگے بڑھتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ آپکو جتاتے بھی نہیں۔ مگر آپ کے لیے بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ دوستی بھی انہی رشتوں میں سے ایک تعلق ہے۔

دوستی کی خوبصورتی یہ ہے۔ یہ نہ رنگ و نسل دیکھتی ہے۔ نہ عمروں کا فرق جانتی ہے۔ نہ اسکے فرقے ہوتے ہیں۔ یہ دو دلوں کو باہم جوڑتی ہے۔ عزت اور اعتماد دیتی ہے۔ اچھا مخلص دوست اللہ کی ایک خاص نعمت ہے۔

جو تاشفہ کو چوہدرانی کی شکل میں ملا ہوا تھا۔ بظاہر وہ اُنکے لیے کام کرتی تھی۔ مگر اندر ہی اندر وہ اُسکی شخصیت کو کس طرح مضبوط اور پُر اعتماد بنانے میں لگی ہوئی تھیں۔ یہ صرف دو تین لوگ ہی جانتے تھے۔

خوشی خوشی اُس نے انکا ہاتھ پکڑا اور دونوں چل پڑیں۔ سارے گروپ سے تھوڑا ہٹ کر۔ اپنی باتوں میں مگن ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے کمنٹ پاس کرتیں۔

”اپنی اور میری دو چار تصویریں لو۔ سیما ب کو بھیجیں گے۔“

جھنگلے کے پاس کھڑے ہو کر اماں وڈی نے کہا۔ جہاں پیچھے گہری ڈھلان تھی۔ اندھیرے میں نیچے دیکھتے ہوئے خوف ہی آ جاتا۔

”میں اپنا بیک تو گاڑی میں ہی بھول آئی ہوں۔ اور فون بیک کے اندر ہے۔“

”چلو کام ختم۔ عائشہ تم لو میری اور تاشفہ کی تصویر۔۔۔“

”انہوں نے کہا عائشہ سے مگر فر بود اپنا موبائل آن کر کے آگے آگیا۔

ایک ساتھ کئی تصویری لے ڈالیں۔ رات ہونے کی وجہ سے تمام لوگ ایک ہی گروپ کی شکل میں گھوم رہے تھے۔ تصویروں کا دور چلا تو سب ہی بنوانے لگے۔ فیملی مگن ہوئی۔ تاشفہ اماں وڈی کے انتظار میں نیچے ڈیم کو دیکھتی تھوڑی دور آ گئی۔

اندھیرے میں پورا فوکس کر کے نیچے پانی دیکھنے کی کوشش میں تھی۔ جب اپنے بالکل پاس آواز اُبھری۔

”اسلام وعلیکم۔۔۔“

ایک جھٹکے سے مُڑی۔۔۔ مگر سر کسی کے سینے سے ٹکرا گیا۔ تافہ کا دل حلق میں آ گیا۔
کئی پل تو وہ سمجھ نہ پائی کیا کرنا چاہیے۔ سلام کا جواب بھی نہ دیا گیا۔

سر مُوڑ کر دیکھا اماں وڈی وہاں نہیں تھیں۔ دم تھینا اُس کا پیچھا کرتے ہوئے موقع تاک کر آیا تھا۔

”میں نے کہا تھا نا ہماری ملاقات آج کی تاریخ میں ہی ہوگی۔ یہ دیکھ لو بارہ بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔“ اُس نے اپنی کلانی پر بندھی گھڑی کا ڈائل تافہ کے سامنے کیا۔

”کیا سلام کا جواب بھی نہیں ملے گا؟۔۔۔“

”وسلام۔۔۔“

وہ جھٹکے پر ہاتھ رکھ کر دونوں طرف سے تافہ کو گھیرے میں لیے کھڑا تھا۔

”کیسی ہو؟۔۔۔“

کان کے پاس سرگوشی کی گئی۔

تافہ نے کسی شناسا چہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کوئی نظر نہ آیا۔

”مجھے جانا ہے۔“

اُس کے اندر اُٹھک بیٹھک جاری ہو گئی۔ مگر بڑا تھل رکھ کر بول رہی تھی۔ پھر بھی لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

”چلی جانا میں کونسا تمہیں لیکر کہیں بھاگ رہا ہوں۔“

”میں صرف تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔“

”میں تو کبھی بھی آپ سے ملنے کی خواہش مند نہیں رہی ہوں۔“

تافہ کا لہجہ سخت اور انداز بے لچک ہو گیا۔

”میں تمہیں بہت یاد کرتا ہوں۔ تم میری تنہائی کی ساتھی ہو۔ تم محفل میں میرے ساتھ ہوتی ہو۔ جس دن

سے تمہیں پایا ہے۔ آج تک تم نے کبھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔ مجھے اس مُڑی طرح سے قید کر کے اپنی دفعہ کہتی ہو۔

تمہیں کبھی میری خواہش نہیں رہی؟۔۔۔“

اپنی پیشانی اُسکی گردن پہ ٹھکا کر وہ سرگوشیوں میں بول رہا تھا۔

”اگر آپ اپنی حد سے نکل کر یوں سر راہ مجھے تنگ کریں گے۔ میرا تماشا بنائیں گے۔ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ تو اس صورت میں آپ میری ناپسندیدہ ترین ہستی ٹھہریں گے۔“

وہ لوگ جنگل کے ساتھ کھڑے تھے۔ جہاں پر نزدیک کوئی پول نہ ہونے کی وجہ سے قدرے تاریکی تھی۔ اور اگر کوئی پیچھے سے آکر دیکھتا بھی تو اُسکو غور سے دیکھنے پر ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہاں ایک نہیں دو لوگ موجود ہیں۔

”ہوش میں تو ہو؟۔۔۔ میں تمہیں نقصان پہنچاؤں گا۔۔۔ میں۔۔۔؟ جانتی بھی ہو کہ کیا رہی ہو؟۔ تم میری ہو۔ صرف میری۔۔۔ کیا کوئی اپنی عزیز از جان ہستی کو بھی تکلیف دے سکتا ہے؟۔“

”آپ کا میرے جسم کو چھونا مجھے شعلوں پہ دھکیل رہا ہے۔ مجھ سے فاصلے پر کھڑے ہو کر بات کریں ورنہ۔۔۔“ تاؤفہ کے الفاظ اُسکو جذبات کے بہاؤ سے باہر کھینچ لائے۔

”میں نے تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا تم چھونے کی بات کر رہی ہو۔ میرا قریب آنا تمہارے لیے اتنا ناگوار کیوں ہے؟۔ اور اس ورنہ کا کیا مطلب ہوا؟۔۔۔“

”میری بات مذاق میں مت لیں۔ اگر اسی لمحے آپ مجھ سے دور نہ ہوئے تو میں نیچے پانی میں کود جاؤں گی۔“ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ جنگل کو پکڑا ہوا تھا۔

”تم اتنا منفی رد عمل کیوں دیکھا رہی ہو؟۔ میں تمہارا غیر تو نہیں ہوں۔“

”آپ میرے کچھ نہیں لگتے۔ براہ کرم مجھ سے دور ہو کر کھڑے ہوں۔ نہیں تو میں نیچے چھلانگ لگا دوں گی۔“

آپ مجھے نہیں جانتے ہیں۔ مجھے موت سے قطعاً ڈر نہیں لگتا۔“

”تم مجھ پہ موت کو ترجیح دیتی ہو؟۔“ اُس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

”مجھ سے دور ہو جائیں۔“

”میں کیوں دور ہو جاؤں؟۔۔۔ تم کسی بچے جیسا رویہ اپنا رہی ہو۔“

”مجھے آپ جیسے لوگوں سے نفرت ہے۔ جہاں کہیں موقع ملا وہیں اپنے ہوس کی پیاس بجھانے شروع ہو گئے۔“

یہ الفاظ نہیں پگھلا ہوا سیسا تھا۔ جو اُس کے کانوں میں پڑا الفاظ سے زیادہ تاحفہ کا انداز چوکا نے والا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ جھنگے پہ سے ہٹا کر تاحفہ کی کمر میں جمائل کیا۔ وہ ایسے تڑپتی جیسے نگلی بجلی کی تاروں نے چھو لیا ہو۔ اپنے دونوں پاؤں جھنگے کے پائپ کے اوپر رکھ کر پورے زور سے آگے کو تھک گئی۔ یہ صرف پلک جھپکنے کا کھیل تھا۔ اگر تاحفہ کی کمر میں اُسکا بازو نہ ہوتا تو اس وقت وہ کئی فٹ کی اونچائی سے نیچے گہرے پانی میں کود چکی ہوتی۔

اُسکا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسا بھی کر جائے گی۔ اور آخر کیوں؟ کس لیے؟ صرف اس لیے کہ وہ اُسکے قریب کھڑا ہے؟۔

دونوں کی سانس اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔ تیزی سے ہوا کو اندر کھینچتا وہ تاحفہ کو اُسی طرح اپنے ساتھ لگائے رکھ کر جھنگے سے دور لے گیا۔ پیچھے سے تاحفہ کی کمر میں ایک بازو ڈال کر اُس کو مضبوطی سے تھامے کھڑا تھا۔ جیسے ابھی بھی ڈر ہو وہ کہیں کھو جائے گی۔ ایک ہاتھ تاحفہ کی پیشانی پہ رکھ کر اُسکا سراپے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ ہونٹ اُسکے بالوں سے مس ہو رہے تھے۔ بولا تو آواز میں دھمکی اور غصہ تھا۔

”ایسی گھٹیا حرکت آئندہ کبھی مت کرنا۔ ورنہ میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا گھونٹ دوں گا۔“

ایک جھٹکے سے اُس کو چھوڑ دیا۔

”جاؤ چلی جاؤ یہاں ہے۔“

وہ ابھی تک بے یقینی سے اُسکو دیکھ رہا تھا۔ جو ساکت کھڑی لب کاٹ رہی تھی۔

دونوں کی نظریں اک پل کو ملیں تو دونوں کی نظروں میں صرف ایک دوسرے کا عکس تھا۔ وہ مزید الجھ گیا۔ بولا تو اس دفعہ لہجے میں غلطی تھی۔

”وہ جس کے لیے میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔ آج کم از کم یہ تو واضح ہوا۔ اُسکی نظر میں میرا مقام کیا ہے۔ میرے ساتھ چند پل کھڑے ہو کر بات کرنے سے بہتر موت ہے۔ اپنے آپ کو اس وقت دنیا کا احقر ترین

انسان محسوس کر رہا ہوں۔ میں تو سراب کے پیچھے بھاگتا آرہا ہوں۔ بہت شکر یہ۔۔۔ اللہ حافظ۔“

وہ شکوہ بھر نگاہ ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

جوں جوں اُسکے چوڑے شانے نظروں سے دور ہوتے گئے۔ توں توں تافہ کے آنسوؤں میں تیزی آتی گئی۔

☆.....☆.....☆

سر سپیٹ آن داموڈ ہے۔ پر سر ایک مسئلہ ہے۔
”کیسا مسئلہ؟“

”سر قد کاٹھ وہی ہے۔ مگر حلیہ اور ظاہری شکل میں تبدیلی لائی گئی ہے۔ جس کہ وجہ سے سو فیصد یقین سے نہیں کیا جاسکتا کہ یہ وہی آدمی ہے۔“
”تم ایک ٹیم کو اُسکی رہائش پہ ہی چھوڑ کر دوسری ٹیم کے ساتھ اسکا پیچھا کرو۔ اور جیسے ہی اسکی منزل واضح ہو مجھے مطلع کرو۔“

”جی سر۔۔۔“

اُس نے فون واپس رکھا۔ اور دوبارہ اپنے کمپیوٹر کے کی بورڈ پہ تیزی سے اٹھکیاں چلانے لگا۔
سکرین پہ مختلف ڈیٹا کوڈ شو ہو کر بڑی سپیڈ سے غائب ہوتے جاتے۔ دس منٹ بعد دوبارہ پھر فون بجا۔
”جی۔۔۔؟“

”سر وہ انٹرپورٹ کی جانب روانہ ہے۔“

اُس نے اُسی لمحے کمپیوٹر بند کیا۔ اور اپنے آفس کی گرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
”زبردست یار۔۔۔ میں آگے اپنے بندوں کو رابطہ کر لیتا ہوں۔ اس کو یہیں پکڑو۔“
”جی سر۔۔۔“

”کیا پورا کنفرم ہے کہ یہ ہی ہمارا ٹارگٹ ہے؟“

”سر لگ تو یہی رہا ہے۔ پر دوسری ٹیم کی جانب سے بھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ سر سو فیصد یقین اب بھی نہیں ہے۔“

”جو بھی ہو۔ تم اسکو انٹرپورٹ پہ چیک ان پہ پکڑ لیتا۔“

”جی سر میں آپکو اپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔“

”اللہ حافظ۔۔۔“

وہ اپنے پیچھے اپنا آفس لاک کر کے باہر کو نکل رہا تھا۔ جب دوبارہ فون بجا۔

”ہیلو؟۔۔۔“

”ہیلو سر ٹیم براؤڈ سیکلنگ۔۔۔“

”ہیلو۔۔۔“

”سر اُسی عمارت سے ایک اور آدمی اپنے ساتھ کافی زیادہ سامان لیکر گاڑی پہ روانہ ہوا ہے۔“
اُس کے قدم تھم گئے۔

”مجھے دونوں سیکلنگس کی تصویریں میل کرو۔ کیا تم اُسکا پیچھا کر رہے ہو؟۔“

”جی سر میں نے اپنے ساتھی کو پیچھے ہی چھوڑا ہے۔ اور خود پیچھا کر رہا ہوں۔“

”تمہارے پاس اسلحہ ہے؟۔۔۔“

”جی سر۔۔۔“

”کیا اُسکو تمہاری موجودگی کا علم ہے؟۔“

”نہیں سر جیسے وہ جا رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا اُسکو شک بھی ہے۔ میرے خیال میں پہلا آدمی ہمیں ڈنچ دینے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔“

”بہت خوب تم اس کے ساتھ ہی رہو۔ مزید آگے یہ کدھر کو جاتا ہے۔“

”جی سر میں اسکی جان نہیں چھوڑنے والا۔“

”بہترین۔۔۔ مجھے تصویریں بھیج دو۔“

”جی سر۔۔۔“

فون بند کر کے ابھی دوسرا نمبر ملانے کا سوچ ہی رہا تھا۔ جب کال آگئی۔ نمبر دیکھتے ہی اُس نے آسمان کی جانب دیکھا۔ اور کال اٹھائی۔۔۔

”سر۔۔۔؟۔۔۔“

”تمہیں میں کہتا رہا ہوں۔ اُس خبیث انسان کو پکڑو۔ تم نے میری ایک نہیں سنی۔ اب تمہاری دو ٹیمیں لگی ہوئی ہیں۔ اور دونوں کو ہی یقین نہیں ہے۔ کہ یہ وہی آدمی ہے۔ نہ ہی وہ یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں۔ آیا وہ آدمی اُس پتے پہ موجود بھی تھا یا نہیں۔ مجھے لگتا ہے۔ گیم تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔“

”اللہ معافی دیں سر ایسی بات نہیں ہے۔ جہاں تک رہی اریسٹ نہ کرنے کی بات تو سر میری تحقیق کے مطابق آج تک جو بھی ڈیٹا اپ لوڈ کیا گیا ہے۔ اُسکے آئی پی پہ موجود لوکیشن اور ڈیوائس کی کنفرمیشن تو ہو گئی ہے۔ مگر سر سارا مواد بنایا اس جگہ نہیں جاتا۔ بن کر کہیں اور سے آتا ہے۔ یہ آدمی صرف انٹرنیشنل سرورز کو مواد فراہم کرتا ہے۔ میں اسکے ذریعے انکے مین ونگ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”اگر آج وہ ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ تو تم کیا کرو گے؟۔۔۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“

”تم نے دو دن پہلے بھی مجھے یہی بول کر تسلی دی تھی۔ مجھے تسلیاں نہیں چاہیے ہیں۔ مائے بوائے مجھے عمل چاہیے۔ میں اس بات پر پکچھتا نا نہیں چاہتا ہوں۔ شاید میں یہ کیس تمہاری بجائے کسی اور کو دے دیتا تو کامیاب رہتا۔“

”سر مجھے بس تھوڑا وقت دے دیں۔ میں مایوس نہیں کروں گا۔“

”وقت ہی تو نہیں ہے۔“

”انشا اللہ سر ایسا ہی ہوگا۔۔۔“

”مجھے پل پل کی خبر چاہیے۔ جیسے ہی کوئی کامیابی ہو۔ مجھے بتاؤ۔“

”جی سر انشا اللہ۔۔۔“

لائن بند ہو گئی۔ ایک سیکنڈ وقفے کے بغیر دوبارہ بتل ہوئی۔

”جی۔۔۔؟۔۔۔“

”سر میں یعقوب بات کر رہا ہوں۔ شبیر نے مجھے گھر پہ نظر رکھنے کا بولا تھا۔ پر سر ابھی ابھی گھر سے ایک آدمی

چھوٹا سا بیک ہاتھ میں لیے گھر سے برآمد ہوا ہے۔ مجھے کیا حکم ہے؟۔۔۔“

اُس کی آنکھوں میں سنجیدگی مزید گہری ہو گئی۔

”گلتا ہے۔ وہ ہماری اپنی جانب توجہ سے واقف ہو گیا ہے۔ اور اب کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔ کیا تمہارے

پاس اپنی سواری ہے؟“

”جی سر میں موٹر سائیکل پہ ہوں۔ مگر وہ آدی پیدل ہی جا رہا ہے۔ سر سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے۔

تینوں مشکوک آدمیوں کا حلیہ بہت تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔“

”تم اسکے پیچھے جاؤ۔“

”جو حکم سر۔۔۔“

وہ ٹھلی منزل میں موجود منیر کے کیمین کی جانب بڑھ گیا۔ ابھی تین مختلف لوگ تین مشکوک لوگوں کا پیچھا کر رہے تھے۔ اور اسلوا گلے کچھ گھٹنے منٹ یاد نیک ابھی مزید انتظار کی کوفت سے گزرتا تھا۔

فیکسٹ میج کی ٹون پر اُس نے ایک نظر سکرین پر آنے والے نوٹیفیکیشن کو دیکھا۔ سامنے موجود نام دیکھ کر ہی جڑ سختی سے بھینچ گیا۔

سیڑھیاں اترنے کی سپیڈ میں کمی ہوئی۔ پھر فون بند کر کے جیب میں رکھا۔ اور تیزی سے نیچے آ گیا۔ چہرے پہ ہلکا ہلکا غصہ جھلک رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر نعیم نے اپنے چھوٹے بھائی کی رائے پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ موتی کو نوکری دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس کا چھوٹا بھائی فہیم جو کہ اُسی کے کلینک منیجر تھا۔ ساتھ میں ڈیپٹسٹ کا کلینک چلاتا تھا۔

موتی کو پہلے ٹیسٹ کے طور پر کام دیا گیا۔ پورے ہفتے کا کام اُس نے دو دن میں ختم کر کے اور کام مانگا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جاتا اور جو جو فائل آن لائن اپ لوڈ کرنے کو دی جاتی۔ اندھا دھند اپ لوڈ کئے جاتا۔ پہلے پہل منیجر اُس کے سر پہ کھڑا ہو کر کام لیتا رہا۔ موتی کو ہر گز بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ کوئی بھی فائل کھول کر جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ نہ یہ پوچھنے کی اجازت تھی۔ یہ سب مواد کہاں سے آرہا ہے؟۔ کیوں آرہا ہے؟ اُس کو بس

ویب سائٹس کی تفصیل مہیا کی گئی تھی۔ جس پر سارا مواد ڈالنا ہوتا۔

ایک دن منیجر نے پوچھ ہی لیا۔۔۔

”موتی تم نے کسی قسم کی حیرت یا تجسس کا اظہار نہیں کیا۔ اسکی کیا وجہ ہے؟“

موتی نے فائل کے اپ لوڈ کی سپیڈ پر نظر رکھتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

”کس بارے میں جی؟۔۔۔“

”یہی کہ ہم ان ویب سائٹس پر کیا ڈالتے ہیں۔ نام اور لوگوں کو تو تم دیکھ ہی لیتے ہو۔ تصویریں بھی صاف

نظر آرہی ہیں۔“

”جناب جی میں ایک آدھو ڈیو بھی دیکھ چکا ہوں۔ اور یہ بھی بتا دوں۔ ان کی کوالٹی بڑی خراب ہے۔ روشنی

کم ہے۔ پرنٹ انتہائی نکلا۔ آپ لوگوں نے اگر کام کرنا ہی ہے۔ تو ذرا ڈھنگ سے کریں۔“

وہ منہ میں سگریٹ رکھ کر ہاتھوں سے ٹاپ کر رہا تھا۔ دھواں برابر کمرے میں پھیلتا جاتا۔

منیجر کا منہ گھلا رہ گیا۔ وہ کم از کم اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

”تمہیں کیسے پتا کہ پرنٹ خراب ہے۔ پاروشنی کا سسٹم ٹھیک نہیں؟“

”او جناب جی رٹ ناؤ موتی ازوا موسٹ ایکسپریٹینڈ بندہ ان دا ہول پاکستان جی۔“

”رٹ نہیں ہوتا جاہل آدمی رائٹ بولتے ہیں۔“

”آہوا ہو جی وہی۔۔۔ رٹ ہو یا رائٹ کیا فرق پڑتا ہے۔ گل تو آچکے سمجھ آ گئی نا۔“

”تو تمہارے خیال میں ہم اس میں مزید بہتری کیسے لاسکتے ہیں۔“

”اگر میرا مشورہ چاہیے تو اسکی میں اضافی فیس لوٹگا۔“

”لے لینا فیس کون انکار کر رہا ہے۔“

”یہ ہوئی نا بات۔۔۔ ہاں تو جی پہلا مشورہ یہ ہے۔ آپ لوگ انتہائی ناقص کیمرے استعمال کر رہے ہیں۔ کم

از کم بھی ہو تو دس میگا فیکسل ہونا چاہیے۔ اور آپ لوگوں کی ویڈیو دیکھ کر صاف لگتا ہے صرف دو میگا فیکسل استعمال

ہوا ہے۔“

نیجراتے میں ہی قائل ہو گیا۔ وہ لوگ موتی کی صلاحیتوں سے کئی درجے کم کا کام لے رہے تھے۔ نوکری شروع کرنے کے دوسرے ہفتے ہی موتی کا تبادلہ ہیڈ کوارٹر میں کر دیا گیا۔ جہاں اُس نے پورا ایک ہفتہ تو کوئی بھی نیا کام کرنے نہ دیا۔ ساری مشنری بدلوادی۔ جس میں کم از کم ڈیڑھ کروڑ کا خرچ آ گیا۔ کیونکہ وہ صرف ایک جگہ ہی استعمال نہیں ہوتی تھی۔

موتی کی زیر نگرانی بننے والے کام اور پہلے کے کام میں فرق جب ڈاکٹر نعیم کے سامنے آیا۔ اُس نے خوش ہو کر موتی کو تمام امور کا ہیڈ بنا دیا۔

موتی جیسے ضمیر فروش کو اور کیا چاہیے تھا۔ کہاں گھر کی بجلی بھی کٹنے والی تھی۔ اور اب کہاں دو لاکھ مہینے کی آمدنی۔ وارے نیارے ہو گئے تھے۔ وہ بہت زیادہ خوش تھا۔ اب صرف ایک خواہش باقی رہ گئی تھی۔ وہ جو دن رات سپنوں میں آتی تھی۔ جس سے بات کئے بغیر ایک دن نہ گزرتا تھا۔ جسکو دیکھنے کے لیے آنکھیں بے تاب رہتیں تھیں۔ اب وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ کہ وہ اُس کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس لے آتا۔ اُس نے پیسے جمع کرنے شروع کر دیے تھے۔ تاکہ ایک عدد اپنا گھر لے سکا۔

گھر تو پہلے بھی تھا۔ مگر وہ گھر اُس کے شایان شان نہیں تھا۔ اگر اللہ نے اُسکو ہیرا لڑکی دے دی ہے۔ تو وہ گھر بھی ضرور دے گا۔ اُسکو اللہ پہ پورا یقین تھا۔

کس دل سے خود کو روکے ہوئے تھا۔ یہ وہی جانتا تھا۔ آخر وہ اُسکی پہلی اور شاید آخری محبت تھی۔

☆.....☆.....☆

کیا آپ نے ایک بات نوٹ کی؟۔۔۔

”کس بارے میں؟۔۔۔“ عائشہ کے پوچھنے پر اپنی قمیض کے گھیر پر کڑھائی کا کام کرتی صائمہ نے سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”یہی یا اپنے فریود بھائی کے بارے میں۔“

”اُنکے بارے میں کیا نوٹ کرنا ہے۔ ہاں چچی کل ایک نئی جگہ رشتہ دیکھنے جا رہی ہیں۔ چچی تم نے اُنکے لہجے کا غور نہیں دیکھا۔ صبح میں رشتے کروانے والی کوفون پہ بتا رہی تھیں۔ میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ بہو بھی مجھے

اس کے ہم پلہ چاہیے۔ باہر سے پڑھ کر آیا ہے۔ جانے سے پہلے جس کہنی کے لیے کام کرتا تھا۔ واپس آتے ساتھ ہی اُس کہنی نے دوبارہ سے جاب کی آفر دے دی۔ تنخواہ پہلے سے چار گنا زیادہ ہے۔ باپ کے کاروبار میں بھی ہاتھ بٹاتا ہے۔ اب بس شادی کرنی رہ گئی ہے۔ اگلے چند ماہ میں اس کام سے بھی فارغ ہونا چاہتی ہیں۔“

”باجی صائمہ آپ کیسے ایک وقت میں دو کام کر لیتی ہیں۔ باتیں بھی کئے جارہی ہیں۔ اور کڑھائی بھی جاری ہے۔“ فاطمہ کو جواب صائمہ کی بجائے عائشہ نے دیا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ صائمہ باجی تو ایک اُنٹلی پہ فٹ بال گھما سکتی ہیں۔ گیند کو ایک بلا مار کر وہ چاچے غفور کی حویلی کے اُس پار پہنچا سکتی ہیں۔ ایک نائروالا سائیکل چلا سکتی ہیں۔“

”بس کر دئے بہن میں کسی سرکس میں کام نہیں کرتی ہوں۔“

عائشہ گنوائے گئی تو صائمہ نے اُسک آگے ہاتھ جوڑ دئے۔

حرانے ایک نظر سب لڑکیوں پر ڈالی۔ شدید گرم دن تھا۔ اوپر سے لائٹ بند اس لیے سب کی سب کمروں سے نکل کر باہر صحن میں لگے درختوں کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ گرمی کہ شدت تو کم نہیں ہوئی تھی۔ مگر اندر کے مقابلے میں باہر پھر بھی سکون تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے پسینہ نہیں آرہا تھا۔

حرانے گوندھے ہوئے میدے میں سے تھوڑا سا آٹا لیا۔ باقی کو اُسی طرح طمل کے رومال میں اچھی طرح لپیٹ کر پیالے میں رکھ کر اوپر اپنا نیا کور چھابا رکھ دیا۔

پہلے اُس چھوٹے سے پیڑے کو اچھی طرح ہاتھ میں مسلا پھر لمبی سی سکینٹی کے سائز کی تار بنالی۔ جسے اپنے دونوں ہاتھ کے انگوٹھوں کے درمیان سپیڈ اور مہارت کے ساتھ مسل مسل کر چھوٹی چھوٹی سیویاں توڑ توڑ کر چھابے میں پھینکتی جارہی تھی۔

ایک رنگے پائے والی چار پائی پہ صاف سُتھری گہرے رنگوں کی چادر بچھی تھی۔ جس پہ وڈی اماں براجمان تھیں۔ اُنکے سامنے بھی ایک نیا چھابا پڑا تھا۔ جس میں سیویاں بنارہی تھیں۔

رضیہ چچی ہمسائی کی بیٹی کا فراک کاٹ رہی تھیں۔ اُنکے ہاتھ کی صفائی سارے گاؤں کیا سارے خاندان میں مشہور تھی۔ سبھی لڑکیوں کے کپڑے ڈیزائن بھی وہی کرتی تھیں۔ کپڑے کے معاملے میں اُنکی پسند اور معیار

بڑا منفرد تھا۔ اس لیے جو بھی وہ بنا دیتیں ہزار خروں والی لڑکیاں خوشی خوشی پہن لیتیں۔ عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے دوپٹے کا پلو پکھے کی طرح جھلاتے ہوئے دہائی دی۔

”ہائے وڈی اماں بڑی گرمی لگ رہی ہے۔“

”تو وڈی اماں کیا کرے۔ بارش بھی نہیں مانگ سکتی۔ کیونکہ تیرے باپ کی گندم ابھی تک باہر کھیتوں میں پڑی ہے۔ جا کر واسع کوفون کر کسی لڑکے کو بھیج کر تمہارا سڑاجر نیٹر بنو ادے۔“

رخشدہ نے ساس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

”اماں رہنے دیں۔ مواجر نیٹر خراب پڑا ہے۔ جب ہی تو یہ نواب زادیاں ذرا باہر نکلی ہیں۔ ورنہ چوبیس گھنٹے اے سی میں بیٹھ بیٹھ کر بالکل ہی ٹکی ہوتی جا رہی ہیں۔ نہ انکو کسی کے کپڑے دھونے کی فکر نہ کھانے پکانے کی۔ مانیں ہی ابھی تک چولہوں میں کھیتی ہیں۔ انکی عمر میں ہم نے سارے گھر کی ذمہ داری اٹھائی ہوتی تھی۔ امی جی کو بس چار پائی پہ بیٹھا دیا تھا۔“

”ہاں تو غلط کیا نا آپ نے۔ بیٹوں نے نانی اماں کو کام کرنے کی عادت رہنے ہی نہیں دی۔ اور ممائی کو کوئی کام آتا نہیں تھا۔ بھاری نانی اماں کے لیے کتنا مشکل ہوا تھا۔ اگر آپ اپنی امی کا خیال کرتیں تو بھابھی اتنی مختلف بیک گراؤنڈ کی نہ لائیں۔ نانی اماں تین تین پور تندور پہ اکیلی لگا لیا کرتی تھیں۔ اور ممائی اب بڑی مشکل سے سالن گھر بناتی ہیں۔ روٹیاں باہر سے لگواتی ہیں۔ ماڈرن اور روایتی ماحول کا کیا خوبصورت منظر ہے۔“

صائمہ کی بات پر رخشدہ کے جیسے زخم ہرے ہو گئے۔ فوراً بولیں۔۔۔

”ہائے ہائے ہمیں کیا پتا تھا۔ بھابھی اتنی نازک مزاج نکلتے گی۔ وہ تو بس ایک کام ہی جانتی ہیں۔ سارے ہاتھ پیر کان ناک پہ پٹیج کیسے کرتی ہے۔ اب بھائی بھی ہمارا ایک ہی ایک ہے۔ دو چار ہوتے تو امی دوسرے بیٹے کے ساتھ رہ لیتیں۔ اس بہو کی نوکرانی تو نہ بنتیں۔“

”تو رخشدہ اسی بھائی کی دو شادیاں اور کروادو۔ ماشا اللہ جوان جہان ہے۔ رزق اللہ نے دیا ہوا ہے۔ اُسے کیا مشکل تین بیویاں آسانی سے رکھ سکتا ہے۔“

اماں وڈی کے مشورے پر رخشدہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”آئے ہائے اماں وہ شوہر کو ویسے ہی گنجا کر دے گی۔ وہ تو اسکا بہنوں کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرنی کجا کہ ایک اور عورت برداشت کرے گی۔ اب تو اولاد ماشا اللہ سے جوان ہو گئی ہے۔ اللہ انکو گرم ہوا بھی نہ چھوئے۔“

”شوہمی جھلی۔۔۔!! دیکھو ذرا اسکو ابھی بھر جائی کی زیادتیاں یاد کر رہی تھی۔ اب اُسی کی اولاد کو دُعائیں دے رہی ہے۔“

”اماں میرے بھائی کی اولاد ہے۔ بھابھی بھی بدید ہے۔ تو ہمارے ساتھ ہی ہے۔ اپنے شوہر کا خیال تو کرتی ہی ہے۔ اور ہمارا کیا ہے۔ کبھی کبھار جانا ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی ماں کے دم کو۔ بس دکھ آتا ہے۔ جب ماں کو مشقت کرتے دیکھتی ہوں۔ ساری عمر انہوں نے کام ہی کیے ہیں۔ آخری عمر تو آرام ملے۔“

”نائی اماں ابھی خود ہی تو کہہ رہی تھیں۔ آپ نے اپنی امی کی بڑی خدمت کی۔“

”مَتر ہم نے تو کی۔ اب تو بیٹے کی باری ہے۔ پر ہر کوئی ہماری اماں وڈی کی طرح خوش قسمت نہیں ہے۔ جنگی اولاد بوڑھی ہو گئی پر آج بھی ہر کام میں اپنی ماں کو آگے رکھتے ہیں۔“

”میری دمی یہ اُس ڈنڈے کا کمال ہے۔ جو آج تک میں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ ورنہ میرے گھر میں بھی کیسی کیسی تحریکیں جنم لے چکی ہیں۔ تم واقف ہی ہو۔“

اماں وڈی نے اندر سے آتی شیم کی جانب آنکھ سے اشارہ کر کے بتایا تو رخشندہ سمیت سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

شیم نے سوئس لان کا ہلکے رنگوں کا خوبصورت پرنٹ پہتا ہوا تھا۔ سلیقے سے سجاد و پٹہ صاف ستھرے ہاتھ پیر ایک کلائی میں سونے کے کڑے دوسری میں راڈو کی گولڈن گھڑی، سفیدی مائل سانولا رنگ، وہ بلاشبہ ایک بڑی وضعدار خاتون تھیں۔

”اماں میری ابھی رشتے والی سے بات ہوئی ہے۔ اُس نے بتایا ہے۔ لڑکی کو دو دن کی چھٹی ملی ہے۔ کل اپنے گھر آ رہی ہے۔ ہم لوگ بھی کل ہی جا کر اُسکو دیکھ آئیں۔“

”اچھی بات ہے۔ کدھر جانا ہے؟۔۔۔“

”لاہور گلبرگ میں ہوتے ہیں۔ اُنکی طرف سے ایک مطالبہ ہوا ہے۔“

”رشتہ ابھی ہوا نہیں ہے۔ پہلے ہی مطالبے شروع ہو گئے۔ کیا کہتے ہیں؟“

”لڑکی کی بہنیں وغیرہ کہہ رہی ہیں۔ ہم لڑکے کو ساتھ لیکر ہی آئیں۔“

”ہم اکیلے لڑکے کو ہی بھیج دیتے ہیں۔“

”وہ کہہ رہی ہیں۔ اس طرح سے وقت کی بچت ہوگی۔ لڑکی ایک پرائیویٹ ہسپتال میں نوکری کر رہی ہے چونکہ ابھی نوکری نئی ہے۔ روز روز چھٹی نہیں مل سکتی۔ اس لیے اگر پہلی ملاقات میں ہی لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند یا نا پسند کر دیں۔ تو دونوں خاندانوں کا وقت بچ جائے گا۔“

رضیہ چچی بولیں۔

”مان گئے بھئی پڑھے لکھے لوگ کتنے سیانے ہوتے ہیں۔ کتنا وقت کا خیال کر رہے ہیں۔ ایک ہم ہیں دس دس دفعہ ایک جگہ رشتہ دیکھنے جاتے ہیں۔ اینڈ پر نہ بول کر واپس آ جاتے ہیں۔“

”بیٹھی رہو تم اتنی سیانی۔۔۔ دیکھ پرکھ کر ہی رشتے کرنے چاہیں۔ اور ایک ملاقات میں کسی کی اصلیت نہیں گھسکتی ہے۔ پتا تو تب ہی چلتا ہے۔ جب لڑکی گھر آ جاتی ہے۔ پھر رنگ گھسکتے ہیں۔ لڑکے کی ماں کے بھی اور نئی آنے والی کے بھی۔“

اماں وڈی کو درمیان میں ٹوک کر شیم نے استفسار کیا۔

”اماں کیا پھر آپ کی اجازت ہے۔ میں اٹھو کل کے لیے ہاں کر دوں؟“

”اپنے بیٹے سے پوچھو، شوہر سے مشورہ کرو جنہوں نے جانا ہے۔“

”آپ نے بھی تو جانا ہے۔ اور بڑی تو آپ ہی ہیں۔ جیسے آپ کہیں۔۔۔“

”میں کیسے جاسکتی ہوں۔ تاوقت چھٹی پر گئی ہوئی ہے۔ تمہیں علم ہی ہے اُسکے بغیر میں کہیں نہیں جاتی۔“

”جی جانتی ہوں۔ آپ نے خواہ مخواہ خود کو اُس لڑکی کا محتاج بنایا ہوا ہے۔ کرتی ہی کیا ہے آپ کے لیے جو پچاس ہزار تنخواہ رکھی ہوئی ہے؟۔۔۔ یہ پورا ماہ تو اُس نے ماں کے ساتھ ہی گزارا ہے۔ تنخواہ کاٹ لیجئے گا۔“

”دیکھ دھیے میں کسی کو اجرت پر پچاس ہزار دوں۔ لاکھ دوں یا مفت میں ہی دو چار دے دوں تم فکریں نہ پالا کرو۔ یہ میری ذاتی کمائی ہے۔ جس میں سے اپنی مددگار کو اُسکا حصہ دیتی ہوں۔ پورے دو مہینے زمین مجھے

باپ کی جانب سے تر کے میں ملی ہے۔ میں ایک چھوڑ چار لوگ اپنی مدد کے لیے رکھ لوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے؟“ بادلچو استہ شمیم کو ہاں ملانی پڑی۔

”جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اُسکوفن کر دیں۔ کل صبح تک آجائے۔“

”ہمارے پیچھے کوئی پولیس تو نہیں لگی ہوئی۔ کہ ابھی کے ابھی لڑکی والوں کی بات مانی جائے۔ اور وہ بن باپ کی بچی جیسے میرے فون کے ہی انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ اور تو اُسکو کوئی کام نہیں ہے۔ تمہاری سگی بھتیجی ہے۔ ہم سب اُس دن سے کہہ رہے ہیں۔ بیمار ہو کر چھٹی پر گئی ہے۔ اللہ شفا یاب کریں۔ تم اتنی پتھر دل ہو۔ اتنا نہیں ہوا۔ ایک دفعہ فون کر کے خیریت ہی پوچھ لو۔ جن سے دن رات رابطے میں رہتی ہو وہ اگر بھائی بہن ہیں۔ تو یہ بھی تمہارے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے۔ اسکا تم پر زیادہ حق ہے۔“

”اماں میرے سامنے اُس منحوس کا نام مت لیا کریں۔ باپ اور بھائی کو نگل گئی ہے۔ میرے تو بس میں ہی نہیں۔ ورنہ میں اُسکا سایہ بھی اپنے گھر پر نہ پڑنے دوں۔ آپ کو بھی یہی کہوں گی۔ اُس سے جان بچو والیں۔ ایسے قلیظ انسانوں کو تو موت بھی نہیں آتی ہے۔“

”استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ۔۔۔ استغفر اللہ شمیم تم اپنا غرور کنٹرول کرو۔ اللہ کو ایسے بے درد دل ذرا بھی پسند نہیں ہیں۔ کبھی قرآن کو ترجمے کے ساتھ پڑھ کر تو دیکھو۔ اللہ کہتا ہے۔ جب ان پر اپنی نوازشیں کروں تو کہتے ہیں۔ یہ سب ہماری اپنی کمائی ہے۔ اور جب ذرا تکلیف میں مبتلا کر دوں۔ تو دہائی دھاڑے دیتے ہیں۔ کہتے ہیں اللہ نے ہم پر مشکل ڈال دی۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ یہ جو تم قیہوں کے ساتھ بھلائی نہیں کرتے۔ غریبوں کا نہیں پوچھتے اُسکے بدلے میں اللہ تم پر مشکل ڈالتا ہے۔“

”اپنے بھائی کے بچوں کے لیے دل اتنا تنگ۔۔۔ مجھے اگر ساتھ لیکر جانے کی خواہش ہے۔ تو جان لو میں تو اُس بچی کی محتاج ہوں۔ وہ میرا بڑا خیال کرتی ہے۔ اللہ اُسکو دو جہان کی خوشیاں عطا کریں۔ قیامت والے دن وہ اپنے ماں باپ کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہو۔ بڑی صابر بچی ہے۔“

”اپنی سگی اولاد کو بھی کبھی اتنی دُعا ئیں دے دیا کریں۔“

”ایک ماں اپنی اولاد ہی کیا کبھی کسی غیر کے لیے بھی بد دُعا نہیں کرتی۔ پر کئی لوگ ایسے ملتے ہیں۔ آپ کی

”ڈبان اُٹھو عاٹیں دیتے نہیں تھکتی۔“

”میں لڑکی والوں کو ہاں کر دوں؟۔۔۔“ ”شیم نے ناک چڑھا کر پوچھا۔

”بولاتو ہے۔ اپنے شوہر اور بیٹے سے پوچھ لو۔“

”وہ دونوں میرے کہے کا انکار نہیں کرتے ہیں۔ صرف آپ کی جانب سے ڈرتھا۔ اسی لیے آپ سے ہی

پوچھ رہی ہوں۔“

”میرے سعادت مند بچے۔ اگر وہ مرد ہو کر تم سے اختلاف کی جرات نہیں رکھتے تو میری کیا مجال ہے۔ جاؤ

کہہ دو ہم کل آ جائیگے۔“

شیم ساس کے طہر پر آنکھیں گھماتی ہوئیں چلی گئی۔

اُنکے وہاں سے جانے پر اماں وڈی با آواز بڑبڑائیں۔ یہ عورت نہیں بدل سکتی۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر

کیوں نہ ہو جائے۔ عاشو پتر چاڈرا تا شی کا نمبر تو ملا۔“

”جی دادو۔۔۔“

☆.....☆.....☆

ڈکھ لکھے، میں چاہتی ہوں کوئی میرے اندر کا ڈکھ کاغذ پہ لکھے۔ کیا بھلا میرا ڈکھ دیکھ کر پڑھ کر کوئی محسوس

کرے گا؟۔ کسی کو احساس ہوگا میں کس قدر اذیت میں ہوں۔ کیا صرف پڑھ لینے سے میرے ڈکھ کی گہرائی

ماپی جاسکے گی؟۔

جسم پہ روگ ہوا انسان ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ جزل ڈاکٹر کو سمجھ نہ آئے تو سپیشلسٹ کے پاس جاتا ہے۔

جب روح روگی ہو جائے۔ خود اپنے آپ سے نظر نہ ملائی جائے۔ کہیں امان نظر نہ آئے۔ زندگی کی ساری

رنگینی کو کالے پینٹ کا برش مار کر سیاہ کر دیا جائے۔ تو انسان کیا کرے؟۔۔۔ کس طبیب سے رابطہ کرے؟ کس کو

نبض دیکھائے۔ کیا خوشی کہیں دکان سے ملتی ہے۔ جو انسان ایک کلو کے حساب سے خرید لائے اور گھر آ کر پانی

کے ساتھ نگل لے۔ اُسکے اندر باہر کا موسم بدل جائے۔ جب تک دوا کی تاثیر رہے انسان سارے غم بھول

جائے۔

مگر یہ ممکن ہوتا تو دنیا میں انسان کو چاہیے ہی کیا تھا۔ اپنے اپنے درد ایک باکس میں بند کرتے دریا میں بہا دیتے۔ خود خوش رہنے کی دوا کھا کر مست ہو جاتے۔

اُس نے ہتھیلی پہ رکھی گولیوں کو ایک بار پھر گھورا۔ نیلی پیلی سفید سُرخ پوری چار گولیاں تھیں۔ اُسکو انکے ڈالتے سے کب کی نفرت ہو چکی تھی۔ مگر اس کے باوجود جب ضرورت پڑتی وہ فوراً سے اپنا باکس کھول کر دوا پھانک لیتی۔

وہ اپنے صحن میں لگے جھولے پر گردن اٹھکائے بیٹھی تھی۔ دونوں بازوؤں کے گھیرے میں جھولے کہہ رہی تھی۔ مگر وہ جھولا جھول نہیں رہی تھی۔ ایسے ہی سر اٹھکا کر بیٹھے تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ پہلے جھولے پر چھاؤں تھی۔ مگر جوں جوں سورج سوانیزے سے اتر کر دوسری جانب جا رہا تھا۔ سایے لمبے ہونے سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ جھانکنے لگی تھی۔

اُسکی چھوٹی بہن پانچ منٹ پہلے ماں کے کہنے ہر اُسکو دوا اور پانی کا گلاس پکڑا کر گئی تھی۔ ساتھ خاص تاکید کے کھالو۔ مگر وہ ابھی تک ویسے ہی بیٹھی گولیوں کو دیکھے جا رہی تھی۔

”ناشی آپی آپکا فون بج رہا ہے۔“

جس بے تابی سے وہ اٹھ کر اندر کو بھاگی تھی۔ دوا ہاتھ سے گر گئی۔ پانی کا گلاس فرش گیلیا کر گیا۔ ماں نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ اپنے کمرے میں تک وہ بھاگتی ہوئی گئی تھی۔ فون چوبیس گھنٹے ہاتھ میں لیے گھومتی تھی۔ اس وقت چار جر پر لگا ہوا تھا۔ کانپتے ہاتھوں میں فون تھام کر کالر کی آئی ڈی دیکھی۔

وڈی اماں کا نام دیکھتے ہی اُس نے غصے سے فون فرش پر دے مارا فون کی بیٹری اور باڈی الگ ہو کر کمرے کے کھلے دروازے سے باہر جا گری۔

اُس نے اپنے حلق سے نکلتی چیخوں پر بند باندھتے ہوئے جلدی سے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

اور منہ پہ دوپٹہ رکھ کر اپنے آپ کو آنسوؤں کے حوالے کر دیا۔

”صرف ایک میسج ہی کر دیتے۔ یہ بتانے کو ہی میسج کر دو کہ اب تم سے محبت نہیں رہی۔ میں ایک مہینے سے پل پل مر رہی ہوں۔ کیا تم تک میرے دُکھ کی آواز نہیں جاتی ہے؟“

”اگر مجھے ایسے ہی چھوڑنا تھا۔ تو کیوں اتنے قریب آئے۔ مجھے اپنا عادی کیوں بنایا۔ دواؤں کے سہارے جی رہی تھی نا۔ میں جینا سیکھ لیتی تم نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔ دن رات اپنی جانب متوجہ رکھا۔ میری آنکھوں میں خواب سجائے۔“

”نہیں قصور تمہارا بھی نہیں سارا قصور میرا ہے۔ تم تو میرے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں ہو۔ تم جس لڑکی سے آج تک محبت کرتے آئے ہو۔ وہ میں کب تھی۔ وہ تو نہ جانے کب کی مرگئی۔ تم سے ملنے سے پہلے ہی مر گئی ہوئی ہے۔ میں ہی غلط ہوں۔ ظاہری بات ہے۔ میری اصل شخصیت جاننے کے بعد تم نے کب مجھ سے تعلق رکھنا تھا۔ اچھا ہوا جو بھی ہوا۔“

کرسی پر دونوں گھٹنوں میں سر دیئے خود ہی شکوئے اور خود ہی دلیلیں دے رہی تھی۔ دروازے کا لاک باہر سے کھولنے کے بعد خالدہ اندر آئیں۔ کان کے ساتھ تاشفہ والا ہی فون لگایا ہوا تھا۔ چہرے پر پریشانی ہی پریشانی تھی۔ ”میں تو خود سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ اسکو اچانک سے ہو کیا گیا ہے۔ جس دن سے گھر آئی ہے۔ دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے کھلا رہی ہوں۔ یہی سمجھیں زبردستی کر کے اسکے پیٹ میں ایندھن بھیج رہی ہوں۔ ڈاکٹر کے پاس جانے سے بھی منکر گئی تھی۔ میں خود ہی جا کر اسکی حالت بتا کر اُس سے دوا لے آئی تھی۔ وہ بھی یہ تین وقت لینے والی گولیاں دن میں بمشکل ایک دفعہ لے رہی ہے۔ ساری رات نہیں سوتی ہے۔ میں بار بار اٹھ کر دیکھتی ہوں۔ آیا نیند آگئی ہوگی۔ پر ویسے ہی بیٹھی ہوتی ہے۔ آنکھوں کے گرد ہلکے حد سے گہرے ہو گئے ہیں۔ وزن بھی کم ہو گیا ہے۔ میں بڑی ڈکھی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا میں مزید کیا کروں۔ مجھے اپنی بیٹی جتنی عزیز ہے۔ اتنا ہی اسکی زندگی مشکل ہے۔“

”خالدہ بیٹی میری بات سُنو۔“

”چوہدرانی جی میرے میں اب حوصلہ نہیں رہا ہے۔ آجا کر اسی کو دیکھ کر جیتی ہوں۔ اور جب یہ کسی چیز کو سر پہ سوار کر لیتی ہے۔ تب قطرہ قطرہ یہ نہیں مرتی۔ میں مرتی ہوں۔“

وہ خود بھی رو رہی تھیں۔

تاشفہ ویسے ہی سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔ آنسو قلم گئے تھے۔ آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ کاش کسی کا بھی

سامنا نہ کرنا پڑے۔

”خالدہ ہمت سے کام لو بیٹی۔ اور تم نے مجھے پہلے یہ سب کیوں نہیں بتایا۔ میں اس پریشانی کی جڑ تک جاتی۔ یہ تو آج میں نے خود فون کر لیا ہے۔ ورنہ میں تو بے خبر ہی رہتی۔ اُسکوفون دو میں اسکی خبر لوں۔ بڑھاپے میں ماں کا خون جلارہی ہے۔ جھلی لڑکی۔۔۔“

خالدہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے اُسکو مخاطب کیا۔

”ناشو چوہدرانی جی سے بات کر لو۔“

”امی آپ فون رکھ دیں۔ میں بات کر لوں گی۔ آپ یہاں سے جائیں۔“

اُس نے سر نہیں اٹھایا کہ اپنی حالت ماں سے بچھپانا چاہتی تھی۔ دھیمی سی آواز میں شرمندہ سے لہجے میں بول رہی تھی۔

خالدہ نے سر اٹھاتے میں ہلایا اور فون اُسکے پاس رکھ کر ہا ہر کو نکل گئیں۔ چھوٹی مافیہ دروازے میں اُداس چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اُسکو بھی ساتھ لے گئیں۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ جانتی تھیں۔ چوہدرانی اب اُس سے سب اُگلا کر ہی دم لیں گی۔

اُس نے سر اٹھایا۔ آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ بال پسینے اور آنسوؤں سے کیلے ہو کر چہرے پہ چپکے ہوئے تھے۔ اُس نے بال ہٹائے دوپٹے سے چہرہ اچھی طرح صاف کرنے کے بعد فون اٹھایا۔

”ہیلو؟۔۔۔“

”مجھے تم سے یہ ہرگز ہرگز اُمید نہیں تھی۔ تمہارے اور میرے درمیان بہت سال پہلے ایک وعدہ ہوا تھا۔ اور یہ وعدہ تمہارے باپ کی موجودگی میں کیا گیا تھا۔ اپنے باپ کے بعد تمہیں کبھی کوئی پریشانی ہوگی۔ تم سیدھی میرے پاس آؤ گی۔ ہوا تھا یا نہیں؟۔۔۔“

”جی ہوا تھا۔“

”پھر تم نے یہ حرکت کیوں کی ہے؟۔۔۔“

”وہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ پورا مہینہ گُور گیا ہے۔ اُنہوں نے ایک دفعہ بھی میسج نہیں کیا۔ نہ میرے

کسی فون کا جواب دیا ہے۔“

”اتنی سی بات پر تم پریشان ہو۔؟“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اور میں۔۔۔“

آگے آنسوؤں نے آواز بند کر دی۔

”تم یا تو رولو۔ یا میرے سے بات کر لو۔“

اُس نے جیسے تیسے اُنکو ساری بات بتا دی۔

”پاگل لڑکی ملنے کیوں آیا تھا؟ مجھے تب بتایا ہوتا۔ میں جا کر اُسکی دھلائی کر کے آتی۔ فون تک بات کرنے

کی حد تک ٹھیک ہے۔ ملنے ملانے کے چکر میں بالکل نہیں پڑتا۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں۔ جیسے میں نے اُنکو بعد اصرار بلایا تھا۔“

”یہ مبینہ بھر سے بیماری بس اس بات کی ہی ہے؟ یا کچھ اور بھی؟“

”یہ کیا کم ہے؟“

”میں ڈرائیور کو بھیج رہی ہوں۔ تم تیاری پکڑو۔ شام سے پہلے ادھر ہوتا ہے۔“

”میری حالت کام پہ واپس آنے والی نہیں ہے۔ سب یونہی باتیں بتا کیجئے۔ کچھ دن اور ٹھنٹی دے دیں۔“

”میں تو آ نہیں سکتی۔ تمہیں ہی آنا ہے۔ لوگوں کی فکر نہ کرو۔ تم اپنے کمرے تک محدود رہنا۔“

”پرسوں آ جاؤ گی۔“

”نہ کل نہ پرسوں۔ میری الماری دھونے والے کپڑوں سے بھری ہے۔ دوا کی کل دو خوراکیں بھول گئی تھی۔

آج ایک بھی نہیں کھائی۔ میرے بستر میں سے بد بو آنے لگ گئی ہے۔ یہ سارے کام میرے کسی نے نہیں

کرنے۔ جب سے تمہاری ذمہ داری لگائی ہے۔ یہاں تو سب کے سر سے جوں ہی مر گئی ہے۔ ہاں احسان

کر کے دو وقت کھانا پوچھ لیتی ہیں۔ یہی بہت بڑی بات ہے۔“

”آپ کبھی کسی سے خوش نہیں ہو سکتی ہیں۔“

”اچھا اب میرا منہ نہ کھلوانا۔ یہاں کس کو پرواہ ہے مائی کل کی مرنی آج مر جائے۔ ہمیں تو آزادی ملے۔“

”باجی حرا! اُنکے بھائی ’واسع بھائی‘ سب تو آپکا اتنا خیال کرتے ہیں۔“

”رہنے دو تم آئیں بڑی حمایت کرنے والی۔ واسع کے ماں باپ کو بول دیا ہے۔ ایک مہینہ بعد کے دن رکھ کر اپنی بہو کو زخمت کروا کر اپنی طرف لے جائیں۔ یہ کام بھی نمٹے۔ تم تیاری کرو۔ ڈرائیور زمان کے کام سے اُسی طرف نکلا ہوا ہے۔ آتے ہوئے تمہیں لے آئے گا۔ چہرہ اگر زیادہ خراب لگ رہا ہو تو میک اپ کر لینا۔“

”میک اپ مجھ پہ نہیں چلتا ہے۔“

”ہر بات کا جواب تو تمہارے پاس پہلے سے تیار پڑا ہوتا ہے۔ میں فون رکھ رہی ہوں۔ شام کے کھانے پر ملاقات ہوتی ہے۔“

”اللہ حافظ اماں۔۔۔“

”اللہ دے حوالے میری دھی۔“

کال بند کرنے کے لیے سکرین پر نظر ڈالی تو نیا صدمہ ہوا۔ پھٹکنے کی وجہ سے سکرین میں کریک آ گیا تھا۔ فون رکھ کر باہر آئی۔ بغیر کسی کے ساتھ نظر ملائے۔ باورچی خانے سے پانی کا گلاس بھرا اور باہر آ کر نیچے بیٹھ کر فرش پہ گری نیلی پہلی دوا اٹھا کر پانی کے ساتھ پھاٹک گئی۔ اب دس پندرہ منٹ بعد اُسکے اعصاب پُر سکون ہونا شروع ہو جانے تھے۔ دماغ نے کام کرنا شروع کرنا تھا۔ امی کو ڈرائیور کی متوقع آمد کا بتانے کے بعد تیاری کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

”آپ پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کرتے؟ میرا محصوم بچہ نہ جانے کس حال میں ہوگا۔ میں کیسے جیوں؟ میرا کلیجہ کٹ رہا ہے۔ مجھے کوئی کہیں سے میرا بیٹا کیوں نہیں لادیتا۔“

”میں کوشش تو کر رہا ہوں۔ اور کیا کروں؟۔“

”آج پورے دو ماہ ہو گئے۔ کیسی کوشش کر رہے ہو۔ جواب بھی تک اُسکا ہلکا سا بھی سُراغ نہیں لگا پائے ہو۔“

”تم صبر کرو۔ دُعا کرو۔ انشا اللہ تمہارا بیٹا تمہیں واپس مل جائے گا۔“

”میرے میں اور صبر نہیں ہے۔ میں دُعا ئیں کر کر کے تھک گئی ہوں۔ میری کوئی سُواائی ہی نہیں ہے۔ نہ اس

دنیا میں کوئی میرے سُن رہا ہے۔ نہ وہ نیلے آسمان والا میری سُن رہا ہے۔ میں کہاں جا کر فریاد کروں۔ کون میری جھولی میں بھیک ڈال دے گا۔ مجھے میرا بچہ لا دو۔ مراد علی تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ مجھے میرا باہر لا دو۔ اُسکی کس کے ساتھ کوئی دشمنی تھی؟ وہ تو گھر سے کھینے کی نیت سے باہر گلی میں گیا تھا۔ پھر واپس کیوں نہیں آیا؟ ہائے مجھے علم ہوتا میں اُسکو کیوں جانے دیتی۔ میں اپنے چاند کے ساتھ چلی جاتی۔ وہ صرف چار سال کا ہے۔ مراد علی میرا باہر صرف چار سال کا ہے۔ اُس نے تو ابھی دنیا بھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ مئی آج دودھ والی سوئیاں بنا دیں۔ میں بے خبر کملی جھلی سوئیاں بناتی رہ گئی ہوں۔ میرا بیٹا مجھ سے چھن گیا۔“

”کتنا رونا چاہتی ہو۔؟ پچھلے دو ماہ سے رو رہی ہو۔ کیا وہ تمہاری تڑپ سُن کر واپس آ گیا ہے؟۔ میری طرف دیکھو۔ میں زندہ لاش کی طرح چل پھر رہا ہوں۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ مجھے تکلیف نہیں ہے۔ کیا میرا دل نہیں روتا ہے؟۔ میں تمہارے پاس تھوڑا سا حوصلہ اُدھار لینے کے لیے آتا ہوں۔ تاکہ میں دوبارہ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر جاؤں اور مزید جدوجہد کروں۔ اس لیے ایسی باتیں کر کے مجھے درگوندہ کیا کرو۔“

مراد علی نے بیوی کے روتے کانچے وجود کو اپنی بانہوں میں سیٹ لیا۔
لاہور کا رہائشی چالیس سالہ مراد علی ایک سرکاری آفسر ہے۔ اُسکی بیوی افشاں اٹھائیس سال کی ہے۔ دونوں آپس میں کزن بھی ہیں۔

دو ماہ پہلے اُنکا چھوٹا بیٹا باہر علی شام کے وقت گھر پہ ٹیوشن پڑھ کر فارغ ہوتے ہی اپنے بھائی کے ساتھ باہر کھینے کو نکل گیا۔ باہر سے بڑا سعید تو آدھے گھنٹے بعد گھر واپس آ گیا۔ مگر باہر نہیں آیا۔ سعید ماں کے کہنے پر اُسکو لینے کے لیے گیا۔ سارے دوستوں کے گھر پہ دیکھ لیا۔ جس گراؤنڈ میں سب مل کر کھیلتے تھے۔ وہاں دیکھ لیا۔ کہیں نشان نہ ملا۔ ☆

نہ جانے زمین نکل گئی۔ یا آسمان کھا گیا۔ سارا علاقہ چھان مارا مگر باہر علی کا کہیں سوراخ تک نہ ملا۔ کوئی کہتا نہر کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ کوئی کہتا اُس دن ایک بہت بُرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ باڈی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ مگر سارے ہسپتال چھان مارے۔ باہر علی کہیں نہیں تھا۔ ماں رو رو کر نیم دیوانی ہو چکی تھی۔ باپ صبر کا پہاڑ بنا ڈٹا ہوا تھا۔ اپنا پیسہ عہدہ تعلقات سب کچھ استعمال میں لانے کے بعد بھی ابھی تک کامیابی نہیں ملی تھی۔ یہ تک کا

علم نہ تھا۔ آیا وہ زندہ بھی ہے۔ یا۔۔۔؟۔۔۔

بابر سے بڑی ایک بہن اور ایک بھائی ہے۔ ماں نے اُن دونوں کو سکول سے اٹھوایا ہے۔ اُنکو ایک پل اپنی نظر سے دور نہیں ہونے دیتی۔

ہر وقت بابر کی تصویر کو سینے سے لگائے یا تو روتی رہتی ہے۔ یا پھر جائے نماز پر بیٹھ کر لمبے لمبے سجدے دیتی ہے۔ دیکھنے والی آنکھ سے اُس ماں کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ اُسکے ہاڑے سننے والے کان دُعا کرتے ہیں۔ کاش سماعت چھن جائے۔ کیونکہ اُس ماں کا دکھ سنا نہیں جاتا۔ اُس صورت میں جب وہ خود نہیں جانتی تھی۔ زندہ بیٹے کی واپسی کے لیے رو رہی ہے۔ یا وہ چلا گیا ہے؟۔۔۔“

ایسا خیال بھی اُسکو وقتِ نزع جیسی تکلیف دیتا تھا۔ جیسے روح کو جسم میں سے کھینچا جا رہا ہو۔

محمد بخش پٹرمیر نے نہیں پلندے

بھانویں ہو کے مرن فقیر۔۔۔

☆.....☆.....☆

کُرسی پہ ٹیک لگا کر نیم دراز بیٹھے ہوئے اُس نے ٹانگیں سامنے میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں کرکٹ گیند تھا۔ جس کو سامنے دیوار پر اُچھالتا۔ اور گیند کے واپس آنے پر لمبے بازو اوپر کو اٹھا کر اُسے کچک کرتا۔ درمیان میں میز پر گھلے کمپیوٹر پر ایک نظر ڈال لیتا۔ آنکھیں خیند کی کی کیوجہ سے کالی ہو رہی تھیں۔ موبائل کی بیل پر اُس نے گردن موڑ کر سکرین پر آنے والے نمبر کو دیکھا۔ چہرے پر اُلجھن آئی۔ اگلے پل ٹانگیں میز سے اُتار کر فون اٹھاتا ہوا۔ باہر بالکونی میں نکل آیا۔

”بڑی بات ہے۔ آج بڑے لوگوں کو ہماری یاد تو آئی۔“

”یاد کے کچھ لگتے۔ میں نے تمہاری خبر لینے کے لیے فون کیا ہے۔“

چوہدرانی کی گرج پر وہ دھیرے سے مُسکراتے ہوئے بولا۔

”خیر خبر یا بس خبر خبر۔۔۔؟۔۔۔“

”کیا تم تاشقہ سے ناراض ہو؟۔“

”اوہ۔۔۔ تو سفارشی بن کر آئی ہیں۔“

”نہیں اُسکی بڑی بن کر آئی ہوں۔ تم اُسکو ملنے کیوں آئے تھے؟“

”میرا اور اُسکا تعلق کتنا ہڈا ہڈا ہے؟ کیا آپ اس بات سے ناواقف ہیں؟“

”نہیں میں جانتی ہوں۔ تم ایک دوسرے کو پانچ سال سے جانتے ہو۔“

”تو پھر بھی یہ سوال کر رہی ہیں۔ کہ میں اُس سے ملنے کیوں آیا؟۔۔۔“

”تم نے اگر اُس سے ملنا تھا۔ تو مجھے بتا کر آتے میری موجودگی میں ملتے۔“

”میں کیا دودھ پیتا بچہ ہوں۔ جو سُر ویزن کے بغیر ایک لڑکی کو مل بھی نہیں سکتا۔“

”دودھ پیتے بچے ملاقات کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔“

”میں بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ آپ اس وقت میرے پر حملہ کر کے اُسکی غلطی کو مٹھانے کی کوشش کر

رہی ہیں۔“

”اُس نے کوئی غلطی نہیں کی۔“

”ہاں آپ کہہ سکتی ہیں۔ مگر مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے۔“

”کیا تم اُسکے ساتھ غلط ہو؟ یا ناظم پاس کر رہے ہو؟“

اس بات پر غصے سے لوہے کی گرل پر گرفت مضبوط ہو گئی۔

”کیا آپ جانتی بھی ہیں؟ وقت گزاری کے لیے بے تعلق کیسے ہوتے ہیں؟ وقت گزاری کے لیے بنائے

گئے تعلق آپ کی رات رنگین رکھتے ہیں۔ دن میں عیاشی کرواتے ہیں۔ میری طرح دل کے روگ نہیں بنے

ہوتے۔ آئینہ سوچ سمجھ کر بولے گا۔“

چوہدرانی یوں دب جانے والی ہوتیں۔ تو چوہدرانی کیوں ہوتیں۔

”پھر تم اپنے ماں باپ کو اُسکے گھر بھیجو۔“

”پہلے تو شاید ایسا ہی کرتا۔ مگر اب نہیں۔“

”اب کیوں نہیں؟۔۔۔“

”یہ آپ اُس سے پوچھئے گا۔ جس نے مجھے ہوس کا مارا ہونے کا طعنہ دیا ہے۔“

”اچھا تو اب تم اتنی سی بات پر تعلق توڑ دو گے۔“

”تعلق نہیں ٹوٹ سکتا ہاں اُس کی طرح میں بھی بے حس ہونے کا سوچ رہا ہوں۔“

”آج کل اُسکی جو حالت ہے۔ کیا اُس سے واقف ہو؟“

”میرا خیال ہے۔ ہمیشہ کی طرح مزے میں ہوگی۔ اب تو اُسکو دن رات کوئی تنگ بھی نہیں کرتا۔“

”وہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”اُسکا کیا مطلب ہوا؟“

”تمہارے یوں ناراضگی دیکھانے کی وجہ سے وہ شدید ڈپریشن میں ہے۔“

وہ بے یقینی سے اپنی جگہ تھم گیا۔ جبکہ وہ مزید بتا رہی تھیں۔

”اُسکی ماں بہت پریشان ہے۔ تاہم ڈپریشن برداشت نہیں کر سکتی۔ اُسکی انگڑائی اتنی بڑھ جاتی ہے۔ وہ

راتیں جاگ کر گزرتی ہے۔ اگر وہ تمہارے لیے واقعی کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ تو اُس کے ساتھ اپنا رابطہ بحال

کرو۔ ورنہ ایک دو ماہ اور گزر جائیں تو اُسکی جنازے میں شرکت کو آ جانا۔“

کال بند ہوگئی۔ اور اُسکے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھیں۔

بس ایک ہی جملے کی بازگشت رہ گئی۔

”اگر وہ تمہارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔“

دور افق کی روشنی میں دیکھتے ہوئے یوں لگا جیسے دل نے اسنے دنوں بعد آج اسی پل دوبارہ دھڑکنا سیکھا

ہے۔ بے اختیار اُسکا سیدھا ہاتھ اپنے دل پر گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ اندر کوئی چیز پگھل کر قطرہ قطرہ ٹپک رہی

ہو۔

☆.....☆.....☆

تین آدمیوں کی تصویریں اُسکے مانیٹر کی سکرین پر موجود تھیں۔ دو کی تصدیق نادرا والوں نے کر دی تھی۔ ایک

کی ابھی نہیں ہو پائی تھی۔

”منیر جو تیسرے بندے کا پیچھا کر رہا ہے۔ اُس کا نمبر ملاؤ۔“

”جی سر۔۔۔“

منیر نے نمبر ملا کر کارڈ لیس اُسکے حوالے کر دیا۔ وہ ایک بڑے سے بورڈ پر لگے نقشے کے اوپر مختلف شہروں کو ہائی لائٹ کر رہا تھا۔

”جی سر؟۔۔۔“

”کہاں پہنچے ہو؟۔۔۔“

”سریہ آدمی بس اسٹیشن کی جانب نہیں گیا۔ نہ ہی اپنی سواری کروائی ہے۔ سرعام سی چنگ چلی پر جا رہا ہے۔ مجھے شک یہی ہے۔ یہ ٹرین اسٹیشن پر جا رہا ہے۔“

”تم اُسکے ساتھ ہی رہو۔ جیسے ہی کہیں پرزکرتا ہے۔ مجھے بتاؤ۔“

”جی سر۔۔۔“

اُس لائن کاٹ دی۔ ساتھ ہی پہلی ٹیم کی کال آگئی۔

”بولو کیا اپ ڈیٹ ہے؟۔“

”سرٹارگٹ انرپورٹ پر گرم ہو گیا ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا تم لوگ اُسکے ساتھ نہیں تھے؟۔“

”سر ہمارے سامنے ہی تھا۔ چیک ان ڈیک سب معروف تھے۔ اسی لیے ہم ذرا ہٹ کر انتظار میں بیٹھ گئے۔ سر وہ اچانک ہی غائب ہو گیا ہے۔“

اُس نے گالی دیتے ہوئے کہا۔

”بیٹا اگر وہ غائب ہوا ناں تو تم لوگوں کو میں غائب کر دوں گا۔“

”سر ہم کوشش کر رہے ہیں۔“

”مجھے کوشش نہیں چاہیے ایوب صاحب مجھے ہر حال میں وہ آدمی چاہیے۔“

”سر ایک اور اہم بات بتانی تھی۔“

”بولو۔“

”سروہ کسی بیرونی ملک سفر نہیں کر رہا ہے۔ وہ اندرون ملک جانے والی پروازوں کا پلان پڑھ رہا تھا۔“
”تم بیرونی اور اندرون دونوں فلائینوں کو چیک کرو۔ میں حکام کو اطلاع کر دیتا ہوں۔ وہ تمہاری مدد کریں گے۔“

”جی سر۔۔۔“

اُس نے لائن کاٹتے ہی منیر سے اگلا نمبر ملانے کا بولا۔

ایف آئی اے کے آن ڈیوٹی ایک آفسر کا نمبر تھا۔

”اسلام و علیکم جناب آپ کا بتایا ہوا آدی ابھی تک تو ایمریشن پر نہیں آیا۔“

”یار سعد میں نے تمہیں ایک نئی تصویر بھیجی ہے۔ یہ آدی کا اصل حلیہ نہیں ہے۔ گیٹ اپ کیا ہوا ہے۔ اب یا تو اس نے گیٹ اپ اتار دیا ہے۔ یا کسی طرح ائر پورٹ سے نکل گیا ہے۔ آخری دفعہ میرے آدمیوں نے اسکو ڈومیسٹک لائنج میں دیکھا ہے۔ اور وہیں غائب ہوا ہے۔ تم سی سی ٹی وی فوٹیج نکالوا کر کہیں بھی اسکا سراغ نکالو۔ یہ بھاگنے نہ پائے۔“

”میں اسی وقت آنے جانے راستے والے راستوں کی فوٹیج چیک کر داتا ہوں۔ ہماری ہر طرف سے چوہیں گھنٹے ریکارڈنگ ہو رہی ہوتی ہے۔ اگر وہ ائر پورٹ کے اندر آچکا ہے۔ تو مجھپ نہیں سکے گا۔ میں نے یہ تصویر سب ڈیسکس پر فارورڈ کر دی ہے۔ جہاں کہیں نظر آیا۔ انشا اللہ پکڑا جائے گا۔“

”نہیں پکڑنا نہیں ہے۔ پہلے میرا یہی پروگرام تھا۔ جیسے ہی یہ ایمریشن پر آئے۔ بہانے سے سائیڈ پر لے جا کر دھریا جائے۔ مگر اب صورتحال بدل گئی ہے۔ اگر یہ اندرون ملک سفر کر رہا ہے۔ تو مجھے اسکو محسوس بھی نہیں ہونے دینا کہ کوئی اسکا پیچھا بھی کر رہا ہے۔ سمجھ آئی میری بات؟۔۔۔“

”ہاں سمجھ گیا۔ تم چاہ رہے ہو۔ یہ اپنا سفر جاری رکھے تاکہ تم دیکھ سکو یہ کہاں جاتا ہے؟۔“

”ہاں بالکل اگر مل جاتا ہے۔ اور اندرون ملک پرواز کرنے کے لیے بورڈنگ کرتا ہے۔ تو اسکے سامان میں یا کپڑوں میں کہیں بھی جی پی ایس چپ لگا دی جائے۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا اسکو شک بھی نہ ہونے

پائے۔“

”انشا اللہ ایسا ہی ہوگا۔ میں کام کر لوں۔ پھر اپ ڈیٹ دیتا ہوں۔“

”او کے اللہ نگہبان۔۔۔“

وہ پُر سوچ لگا ہوں سے اپنے سامنے پھیلے سارے معلومات والے لیٹرز دیکھ رہا تھا۔ اب تک کی گئی ساری تفتیش کی روشنی میں وہ نئے موڑ کو سمجھنا چاہ رہا تھا۔

جب اُسکے موبائل کی بیل بجی۔۔۔

”ہیلو۔۔۔؟“

”سر مجھے آپکو بتانا تھا۔ ابھی دس منٹ پہلے وہ آدمی ایک پیٹرول پمپ پر رُکا تھا۔ موقع ملتے ہی میں نے اُسکی ڈکی میں موجود سامان میں جی پی ایس ٹریکر رکھ دیا ہے۔“

”آخر کار مجھے کوئی ایسی خبر مل ہی گئی جس کا مجھے صبح سے انتظار تھا۔ ویل ڈن۔۔۔ ویری ویل ڈن۔۔۔“

”سر کیا مجھے اسکے ساتھ ہی رہنا ہے؟“

”تم واپس آ جاؤ۔ فی الحال تم نے اپنا کام کر دیا ہے۔“

”جیسے آپ ٹھیک سمجھیں۔“

”تم اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ رابطہ کرو۔ مجھے تینوں سسٹیکس پر جی پی ایس ٹریکر چاہیے۔ یہ تین لوگ مختلف ہیں۔ مگر ایک ہی لڑی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے ایک کو بھی اگنور نہیں کرنا۔“

”جی سر میری بات ہوئی ہے۔ وہ ٹرین شیڈن پر گیا ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں۔ تو میں اُسی طرف نکل جاتا ہوں۔“

”ہاں پلیز ضرور۔۔۔ کیونکہ پہلی ٹیم میں دو لوگ ہونے کے باوجود گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اور یہ تو اکیلا ہے۔“

اُس نے دو چار ضروری ہدایات دینے کے بعد فون بند کر دیا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد اُسکو خوشخبری دی گئی کہ دونوں مشن خوش اسلوبی سے سرانجام دے جا چکے ہیں۔

”منیر نامی لڑکا مسلسل کمپیوٹر پہ موجود تھا۔“

”سرفتیش کے مطابق یہی لگ رہا ہے۔ تینوں لوگ پنجاب کو سفر کر رہے ہیں۔“

”مجھے ہر اُس جگہ کا مکمل ایڈریس چاہیے جہاں بھی یہ لوگ دس سے پندرہ منٹ بھی رُکتے ہیں۔ اگر واقعی پنجاب جا رہے ہیں۔ تو راستے میں انکا جہاں بھی ٹھہرے۔ اپنے لوگ اُدھر بھیج کر پوری چھان بین کرواؤ۔ تیسری اہم چیز میرا اسلام آباد کا ٹکٹ کروادو۔“

”ابھی کے لیے ان پر نظر رکھو۔ آخری منزل واضح ہوتے ہی اگلا قدم اٹھائیے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ کوئی بات ہو مجھ سے کسی بھی وقت رابطہ کر سکتے ہو۔“

اُس نے میز پر رکھا اپنا فون اٹھایا۔ جیب میں گاڑی کی چابی کی تصدیق کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

☆.....☆.....☆

”باجی اس دفعہ پورے ایک مہینے کے لیے تم گھر پہ رہی ہو۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے۔ ہم نے ایک دن بھی کوئی فن نہیں کیا۔ نہ شاپنگ پہ گئے۔ نہ ہی چیزا بنا کر کھایا۔ نہ کوئی مووی دیکھی۔ اور اب آپ واپس جا رہی ہیں۔“ بیک میں اپنا سامان رکھتے ہوئے۔ اُس نے نظر موڑ کر سب سے چھوٹی حرمین کو دیکھا۔ جو بیڈ پہ بیٹھ کر منہ بسور رہی تھی۔

اُس سے پہلے ہی مافیہ بول اُٹھی۔

”حرمین تم آپنی کو تنگ نہ کرو۔ پہلے ہی اُنکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاپنگ پہ تو تم جاتی ہی رہتی ہو۔ سیما اب آپنی آتی ہیں۔ تب بھی تمہاری فرمائشوں کی لمبی لسٹ ہوتی ہے۔ بھوکی لڑکی۔“

”مافی میں تم سے بات نہیں کر رہی ہوں۔ اللہ کرے چوہدرانی جی تاحفہ باجی والی جاب تمہیں دے دیں۔ پھر میں اور تاشی باجی ہر وقت اکٹھے رہیں گے۔ بڑا حرا آیا کرے گا۔“

”تاشی آپنی کے ابھی اتنے بُرے دن نہیں آئے ہیں۔ اور تمہیں میں اتنی ہی بُری لگتی ہوں۔ تو آج سے اپنے کپڑے خود استری کرنا۔ جوتے خود پالش کرنا۔ اور ہوم ورک میں جب مدد چاہیے ہو۔ تو میرے پاس مت آنا۔“ تاحفہ نے حسرت سے اپنی بہنوں کے بے فکر انداز کو دیکھا۔ وہ خود کبھی بھی ایسی نہ بن سکی تھی۔ کسی بہن کے ساتھ ایسی بے تکلفی نہ تھی۔ بہن کیا اُسکی تو کسی کے ساتھ بھی گہری دوستی نہیں تھی۔ فقط ایک اماں وڈی اُسکی زندگی

کا ایسا کردار تھیں۔ جن کے سامنے وہ جو منہ میں آتا بول دیتی۔

”تاہفہ نکل آؤ بچے باہر ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔ اگر آج ہی جانا ہے۔ تو جلدی نکلوتا کہ شام ڈھلنے سے پہلے پہنچ جاؤ اور جا کر مجھے فون ضرور کر دینا۔“

”جی امی۔۔۔“

اپنی چادر ٹھیک کر کے بیگ کندھے پہ ڈالا۔ باری باری بہنوں اور ماں کو مل کر باہر آ گئی۔
ڈرائیور نے اُسکو دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔

چاچا غفور چوہدرانی جی کا پُرانا ملازم تھا۔ جس پہ اُنکا سالوں کا اعتماد تھا۔
گاڑی جو نئی نظروں سے دور ہوئی تو حرمین منہ بھلا کرای کے ساتھ اندر کو بڑھ گئی۔

”امی تاشی باجی ایسی کیوں ہیں؟“

”کیسی ہے؟“

”نہ کبھی گھل کر ہنستی ہیں۔ نہ کبھی گھل کر بولتی ہیں۔ کبھی کسی رشتے دار کے گھر شادی پہ نہیں گئی ہیں۔ نہ کوئی دوست ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انسان کی کوئی دوست ہی نہ ہو۔ میری تو اتنی زیادہ دوست ہیں۔ سکول کی دوست ہیں۔ مدر سے کی دوست ہیں۔ پھر اپنے محلے میں میری دوست ہیں۔ ساری کزنوں سے میری یاری ہے۔ تاشی باجی کی تو ایک بھی دوست نہیں۔ کزنوں سے وہ ملتی ہی کم ہیں۔ دوستی خاک ہوئی ہے۔ بس ایک ہی بوڑھی مائی کے ساتھ وہ تار مل رہتی ہیں۔“

”تم تو بگڑی ہوئی ہو۔ تاشی آپ کی موازنہ اپنے ساتھ نہ کرو۔ وہ سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی ہیں۔ ایویں بول بول کر دوسروں کا سر نہیں کھاتی ہیں۔“

”امی آپ دیکھ رہی ہیں۔ بات میں آپ سے کر رہی ہوں۔ اسکو کیا تکلیف ہے۔ پہلے بھی میں تاشی باجی سے بات کر رہی تھی۔ یہ خواجواہ بیچ میں کود پڑتی ہے۔ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو۔“

”دو پہر جب مل رہے ہوتے ہیں۔ تب اللہ کا نام لیا کرو۔ تم دونوں کی لڑائی ہی ختم نہیں ہوتی۔ چلو دونوں وضو کر کے عصر کی نماز پڑھو۔“

دونوں کی نوک جھوک کا فائدہ اٹھا کر خالدہ نے اُنکی توجہ منتشر کی اور خود مضو کرنے کی نیت سے واش روم چلی گئیں۔ وہ جانتی تھیں مافیہ سمجھدار ہے۔ ہمیشہ بہن کے بارے میں اُٹھنے والے سوالوں پر فوراً اُسکا دفاع کرنے کھڑی ہو جاتی۔ اُنہوں نے اکلوتا خاموش آنسو خاموشی سے صاف کر دیا۔

گاڑی متوازن سپیڈ کے ساتھ ڈسکہ کی جانب گامزن تھی۔ عصر کا وقت ہونے کے باوجود سورج سوانیزے پہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ گاڑی کے اندر توائر کنڈیشنڈ آن ہونے کی وجہ سے سکون تھا۔ باہر سڑک کی دونوں جانب قطار در قطار لگے درختوں نے گھنی چھاؤں کی ہوئی تھی۔ تاحفہ اپنا ہیڈ سیٹ لگائے اُداس نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ جہاں ہر سیکنڈ کے ساتھ منظر بدلتے جا رہے تھے۔ اُسکو بچپن سے ہی یہ کھیل بڑا دلچسپ لگتا۔ ایک درخت کو دور سے دیکھنا شروع کرتی۔ آہستہ آہستہ وہ قریب اور فل سپیڈ کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ مگر آج وہ درختوں کے عقب سے جھانکنے والے تاحفہ نگاہ پھیلے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ گندم کی کٹائی کے بعد کھیت خالی پڑے ہوئے تھے۔ اور کہیں کہیں ابھی تک کٹائی کا کام چل رہا تھا۔

سمجھ یوسف کی آواز میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی۔ اچانک گاڑی رُکنے پر چوگی۔

اس سے پہلے کہ وہ ڈرائیور سے بچ راستے میں رُکنے کا سبب پوچھتی۔ بیک ویو مرر سے نظر کھینچی گاڑی سے نکل کر آنے والے شخص پر پڑ گئی۔

آنکھیں شیشے سے ہٹنے پر انکاری ہو گئیں۔

وہ آتے ہی ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

”کب سے میں پیچھے سے گنجل دے رہا ہوں۔ تم نے گاڑی روکی کیوں نہیں۔“

”میری نظر اب پڑی ہے جی۔“

”بڑے ہی غافل ڈرائیور ہو۔ نکلوا اب میری گاڑی لے جاؤ۔“

تاحفہ دیکھتی رہ گئی۔ ڈرائیور بغیر چوں بچراں کئے گاڑی سے نکل گیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ دوسری گاڑی کو لیکر وہاں سے روانہ بھی ہو گیا۔ تب وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر بیٹھا۔

بیک ویو مرر کو اس اینگل پر سیٹ کیا جہاں سے تاحفہ کی صورت نظر آتی۔

وہ ابھی تک حیرت کے زیر اثر تھی۔ آخر یہ اچانک ہٹکا کہاں سے اور ڈرائیور کے ساتھ کیا پہلے سے ہی تعارف ہو چکا تھا۔ جو وہ یوں خاموشی کے ساتھ منظر سے ہٹ گیا۔ گھبراہٹ الگ حملہ آور ہو رہی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے یک ٹک اُسکو دیکھے جا رہا تھا۔ سفید لٹھے کے شلوار سوٹ پر ہلکی سی سلوٹیس پڑی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ہلکی ہلکی واڑھی اُگی ہوئی تھی۔

تاہم نے کانپتے ہاتھوں سے ہیڈ سیٹ کانوں سے ہٹا دیا۔
 کتنے پل گزر گئے نہ وہ بول رہا تھا۔ نہ ہی گاڑی آگے بڑھائی۔ اب تاہم کی جانب دیکھنا بھی بند کر چکا تھا۔
 تاہم کو سمجھ نہ آئی کیا کرے یا کیا کہے۔ کچھ کہے بھی یا نہیں آخر جو بات ذہن میں بھاگ رہی تھی۔ وہی زبان سے ادا ہو گئی۔

”ڈرائیور چچا مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟“
 ”جب ملاقات ہوگی خود ہی پوچھ لیتا۔“
 ”آپ کو اُنکے بارے میں کس نے بتایا؟ کیا وہ آپکو جانتے ہیں؟“
 ”نہ بھی جانتا ہو۔ تعارف کروانے میں کوئی دیر لگتی ہے۔ تم اُسکی فکر چھوڑو۔ اپنی اور میری بات کرو۔“
 تاہم سانس روکے شیشے میں نظر آتی اُسکی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”تمہیں بتاؤں اس وقت تمہیں دیکھ کر مجھے خوش فہمی سی ہو رہی ہے۔ جو بات مجھے بتائی گئی ہے۔ نہ جانے وہ سچ ہے بھی یا نہیں۔ مگر میرا جی چاہ رہا ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے مان لوں کہ تمہاری یہ حالت میرے نظر انداز کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔“
 تاہم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”نہ نہ رونا مت۔ میں پہلے ہی خود کو بڑی مشکل سے روک کر بیٹھا ہوں۔ ورنہ میرا جی چاہ رہا ہے۔ جس لڑکی کی گلاب رنگت فقط میری ناراضگی کا سوچ کر پہلی پڑ گئی ہے۔ جو اتنی سی بات پر ہی برسوں کی بیمار نظر آرہی ہے۔ چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی ہیں۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ اُسکو اس دنیا سے چڑا کر بہت دور لے جاؤں۔ اور تمہیں دکھی کرنے کے قصور میں اپنے آپ کو بہت بُری سزا دوں۔ جس سے انسان محبت کرتا ہو۔ اُسکو

ڑلانے کا سبب تو نہیں بن سکتا۔ میں بھی تو پچھلے طویل عرصے سے اس بات کا دعویدار ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ ابھی ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے میں پہلے امتحان میں ہی فیل ہو گیا ہوں۔ تم۔۔۔“

بات کرتے کرتے وہ درمیان میں ہی پُپ کر گیا۔ وجہ تافہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی وہشت تھی۔ وہ اپنے سیدھے ہاتھ کے ناخن چباتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے گاڑی کے بند دروازوں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ میکا کی انداز میں اپنی سیٹ پر پوزیشن بدل کر پیچھے کو مڑا۔ جہاں سے براہ راست اب اُس ہرنی کی آنکھوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔

”کیا تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

تشویش نہ صرف اُس کی آواز سے ظاہر تھی۔ بلکہ چہرے پر بھی رقم تھی۔ اُسکو احساس بھی نہ ہوا کہ اب اُس نے تافہ کا ہاتھ اُسکے چہرے سے ہٹا کر اپنی گرفت میں لیا۔

تافہ نے اُسی تیزی سے اُسکا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور زہر خندا آواز میں بولی۔

”میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔ آپ کی چلا کی کو آپ کی مصیبت سمجھتے ہوئے۔ اتنے دن سے اپنی جان کو سولی پہ لٹکایا ہوا ہے۔ بہت خوب پلاننگ کی ہے۔ مبارک ہو آپ اپنے من پسند نتائج حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔“

وہ ناگہی سے اُس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آئی۔“

”مگر مجھے آپ کی نیت کی سمجھ آ گئی ہے۔“

”اچھا بتاؤ پھر میری کیا نیت ہے؟“

”مجھے بدنام کرنا چاہ رہے ہیں۔ اور کیا۔۔۔“

وہ کتنے ہل اُسکی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔ اندر اس قدر اشتعال اُٹھ رہا تھا۔ کہ ایک ہل میں تافہ کو اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دئے۔

جب بولا تو لہجہ ادھیما اور انداز سرد تھا۔

”تو تمہیں لگتا ہے۔ میں تمہیں بدنام کرنا چاہ رہا ہوں؟“

”آخر اس طرح راستے میں روک کر ملنے کا اور کیا مقصد ہے؟ کیا آپ میرے ماں جائے ہیں؟ جویوں اکیلے تنہا میرے ساتھ گاڑی میں موجود ہیں۔ وہ ڈرائیور سب کو جا کر بتائے گا۔ کسی کو نہ بھی بتائے تب بھی اُس کے دل سے میری عزت تو جاتی رہی ناں۔ اسلام آباد والی بات کا اچھا بدلہ لیا ہے۔“

”اچھا۔۔۔! تو کیا میں یہاں تم سے بدلہ لینے آیا ہوں؟“

”تو اور کس لیے آئے ہیں؟“

پہلے ہر روز لڑکی سے فون پر بات کرو۔۔۔ اپنا عادی بناؤ پھر ملنے کا مطالبہ کرو۔ اور میں پاگلوں کی طرح اس سازش کا شکار ہو گئی۔“

وہ اپنا ٹھکانہ ضبط کر گیا۔ اور بڑے محل کے ساتھ اگلی سیٹ چھوڑ کر پیچھے اُسکے برابر پھیل کر بیٹھتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”ہاں اب بولو کیا کہہ رہی تھیں؟۔۔۔“

تافہ کا ہاتھ لاک کی جانب بڑھا ہی تھا۔ جب دوسرے فریق نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے گاڑی اندر سے لاک کر دی۔

اُسکے اور اپنے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کے چکر میں تافہ کی پشت دروازے سے جا لگی۔

”اگر آپ نے مجھے ہاتھ بھی لگایا ناں تو میں آپ کا منہ نوچ لوں گی۔“

لہجہ کا نپٹا ہوا ہی سہی مگر انداز دو ٹوک تھا۔ جواب میں سامنے والا سنجیدگی سے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”دونوں دفعہ ہی میں تمہیں چھونے کی نیت کر کے نہیں آیا تھا۔ یہ تم ہی ہو جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہو۔“

”میں نہیں بُرائی آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ورنہ آپ کبھی بھی ایک اجنبی لڑکی سے تنہائی ملاقات کے متمنی نہ ہوتے۔“ اس دفعہ وہ بولا تو آواز بلند تھی۔

”نہ میں تمہارا اجنبی ہوں۔ نہ ہی نامحرم ہوں۔ یہ بات تم بھی جانتی ہو۔ پھر کیوں یہ فضول بکواس کئے جا رہی ہو۔“

”اگر یہ بات ہے۔ تو چوروں کے طرح تنہائی میں بیٹھ کر بولنے کی بجائے۔ ساری دنیا کے سامنے اقرار کریں۔“

”جب وقت آئے گا۔ وہ بھی کر لوں گا۔“

”پھر جب ہی مجھے ملنے آئے گا۔ ابھی آپ جا سکتے ہیں۔“

”کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“

”مرد ذات اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہوتے ہیں۔“

تاہم کی آواز میں نفرت ہی نفرت تھی۔

سامنے والے نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ وہ کسی بے جان و وزن چیز کی طرح اُس کے ساتھ ٹکرائی۔ اس اچانک حملے پر آنکھیں حیرت و خوف کی زیادتی سے مزید پھیل گئیں۔ زبان گنگ رہ گئی۔

جبکہ وہ اُسکی نگاہوں میں سرد مہری سے دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔

”کیا میں یہ سمجھوں کسی سابقہ تجربے نے مرد ذات سے نفرت کروادی؟“

تاہم شاک رہ گئی۔ وہ کیا بول گیا تھا۔ □

”آپ کو شرم آنی چاہیے ایسے گھٹیا الفاظ کا استعمال کر رہے ہیں۔“

”نہیں شرم کر سکتا ہوں۔ کیونکہ انتہائی بے غیرت واقع ہوا ہوں۔ آج دوسری دفعہ تم مجھ سے اپنی نفرت اور

بیزاری کا اظہار علی اعلان کر رہی ہو۔ اور میں مزے سے بیٹھا بس سن رہا ہوں۔“

اُسکی گرفت سے اپنا آپ آزاد کرواتے ہوئے وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

”میں نے آپ کو کہا تھا۔ مجھے ہاتھ مت لگائیے گا۔“ □

”مجھ پر حکم چلاتے ہوئے احتیاط سے کام لو۔ میں نے زندگی میں ہر وہ کام پوری ضد کے ساتھ کیا ہے۔

جس سے مجھے منع کیا گیا ہو۔“

”تو آپ کیا چاہتے ہیں؟۔ کیسے میری جان چھوٹے گی؟۔“

”مجھ سے جان بچھڑوانے کا اتنا شوق ہے۔ تو پھر میرے ہجر میں رونے کے ڈرامے کیوں کرتی رہی

ہو؟۔۔۔“

”میں پھر سے ہجر میں رونے کے لیے تیار ہوں۔ مگر مجھے یہ قرب ہرگز نہیں چاہیے۔“

اندر سے وہ بہت زیادہ تشویش کا شکار ہو گیا تھا۔ نظروں میں گہری فکر کی پرچھائی جھلک رہی تھی۔

اُسکے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں بھر کر اُسکی نظروں میں براہ راست جھانک کر آخری سی کوشش کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”میں اُلجھنا نہیں چاہتا ہوں۔ جبکہ تمہارا رویہ مجھے اُلجھا رہا ہے۔ مجھے دو ٹوک بتاؤ آخر کیا چاہتی ہو؟۔ مجھے ناپسند کرتی ہو؟۔۔۔“

تاشفہ نے ایک دفعہ پھر اُسکے ہاتھ جھٹک دیئے۔ اور دور ہٹتے ہوئے سرد لہجے میں بولی۔ ”میرے پاس آپکے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ مہربانی کر کے ڈرائیور کو واپس بلا دیں۔ مجھے گھر جانا ہے۔“

”اگر میں کہوں مجھے اپنے رویے کی وجہ بتائے بغیر جاؤ گی۔ تو ساری عمر کے لیے مجھے کھودو گی۔ تب بھی جانے کی اتنی ہی جلدی ہوگی؟۔۔۔“

بسی ٹانگیں آگے کو پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس کے لباس سے اُٹھنے والا پرفیوم تاشفہ کو متوجہ تو کر رہا تھا۔ مگر وہ بے بس تھی۔ یہ حقیقت تھی۔ سامنے موجود شخص اُسکا سب کچھ تھا۔ مگر تاشفہ کے دل و دماغ کو بے یقینی اور خوف نے اس بُری طرح سے جکڑا ہوا تھا۔ اس کالی کوٹھڑی میں کوئی راہزن نہ تھی۔ اور وہ تھک چکی تھی۔ وجود بُری طرح کانپ رہا تھا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“

لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔

وہ جو منتظر نظروں سے اُس کو پڑھ رہا تھا۔ گہری سانس کھینچتے ہوئے لاک کھول کر گاڑی سے اُتر گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اشارت کیا ایکسپلیٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے گاڑی کو سڑک پر دوسری گاڑیوں کی ریس میں شامل کر دیا۔

لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ نظریں سامنے روڈ پہ لگی ہوئی تھیں۔

ڈسکہ آگیا۔ مگر اُس نے گاڑی وہیں روک کر ڈرائیور کو ڈھونڈنے کی بجائے گاڑی گاؤں کی جانب ڈال دی۔ تاشفہ کا چہرہ سفید چادر کی طرح بے رنگ ہو رہا تھا۔

بمشکل مری سی آواز میں بولی۔

”مجھے یہیں اتار دیں۔ میں آپکے ساتھ اس گھر تک نہیں جاؤنگی۔ کوئی دیکھ لے گا۔“
مگر وہ کچھ بھی کہے بغیر گاڑی چلا تارہا۔

تاہفہ کو لگا آج بس سب ختم ہو جائے گا۔ اگر اسکی پھوپھو نے دیکھ لیا تو وہ تاہفہ کو جینے لائق کب چھوڑیں گی۔ سڑک سے لیکر گاؤں تک کا دس منٹ کا راستہ اس نے خود کو کوسٹے گزارا کیوں آخر کیوں اس آدمی کے ساتھ ایسا رابطہ بنایا ہے۔ جو آج تاہفہ کی عزت اس آدمی کے اختیار میں جا چکی تھی۔ آنے والے خوفناک لحات کی ساری تصویر اسکی نظروں کے سامنے چل رہی تھی۔ سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

اسکو جی بھر کر خود پہ غصہ آیا۔ نا اُسکے بغیر چین ہے۔ نہ اُسکے ساتھ میں سکون ہے۔ ایسے میں بہتر ہے میں مر ہی جاؤں۔ اپنے بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے ہتھیلی کی پخت کے ساتھ رگڑنے کے بعد بولی۔

”اچھا ہی ہے۔ نہ سنیں میری بات۔۔۔ ویسے بھی آپکا میرا یہ بے نام رشتہ صرف اسی وقت تک ہے۔ جب تک کسی کے علم میں نہیں ہے۔ آج سب کو علم ہو۔ کل آپکے میرے درمیان کچھ نہیں بچے گا۔“

عین گیٹ کے سامنے گاڑی کو بریک لگی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے سرد آواز میں بولا۔۔۔

”تمہارے اور میرے درمیان فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔ جسے آج سے ختم سمجھو۔ جاؤ اندر۔۔۔“

تاہفہ کو علم نہ ہو سکا کیسے گاڑی سے نکلی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اُسکے اترتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ چلا گیا تھا۔ اپنے پیچھے گرد کے بادل چھوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

تاہفہ کو اپنا دل ’دامن‘ اور وجود سب خالی لگا۔

کسی نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا تو وہ کچھ بھی کہے بغیر اندر کو بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک کوٹھری نما کمرہ تھا۔ جس کی دیواریں دھوئیں نے کالی کی ہوئی تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں لوہے کی گُرسی کے اوپر ایک بھاری بھر کم آدمی کو رسیوں سے گُرسی کے ساتھ باندھا گیا ہوا تھا۔ اسکی آنکھوں پر بھی کالی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

کوٹھری کے دروازے پر باہر کی جانب سے دستک ہوئی۔ اندر موجود اسلحہ بردار لڑکے نے دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں آنے والا نووارد بھی ایک نوجوان ہی تھا۔ کالے رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں ایک فائل تھی۔

آتے ہی اُس نے قید آدمی کو مخاطب کیا۔۔۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

جکڑے ہوئے آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نووارد نے اُسکی گری کوزوردار ٹھوکر ماری۔

”تم سے مخاطب ہوں۔ تمہارا کیا نام ہے؟“

”میں۔۔۔ میرا نام سرفراز ہے۔“

”تمہارا پیشہ کیا ہے؟“

”مجھے یہاں کون لیکر آیا ہے؟ میری تم لوگوں کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟“

”اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ میں جو پوچھ رہا ہوں۔ اُن سوالوں کے جواب دو۔ تمہیں تمہارے سوالوں

کے جواب بھی اُسی میں مل جائیں گے۔ اب بتاؤ تم کیا کام کرتے ہو؟۔۔۔“

”پہلے میرے ہاتھ کھولو میری آنکھوں سے پٹی ہٹا۔۔۔“

ابھی اُسکی بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ نووارد کے اشارے پر وہاں پہ موجود تیسرے فرد نے ٹھنڈے برف

والے پانی کی بالٹی اُس آدمی کے چہرے کو فو کس رکھ کر اُس پہ بھسکی۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا۔ ایک دفعہ تو اُسکے چودہ طبق

روشن کر گیا۔

کمرے میں اُسکی چیخیں اُبھریں۔ ابھی پہلے شاک سے ٹکلا نہیں تھا۔ جب ایک اور بالٹی اُس کے اوپر گرائی

گئی۔ اُس کی ہمت یہاں تک ہی تھی۔ اونچی آواز میں بولے گیا۔

”جو پوچھنا ہے۔ میں بتانے کو تیار ہوں۔ میں بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔ میرا نام سرفراز احمد ہے۔ اور میں

ایس ایچ او ہوں۔“

”اگر تم میرے ہر سوال کا جواب یونہی آسانی سے دے دو گے تو ہم دونوں کو ہی فائدہ رہے گا۔ کتنے سال

ہو گئے تمہیں سروس کرتے ہوئے؟“

”پچھلے بیس سال سے۔۔۔“

نہ صرف اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ بلکہ وہ خود بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔

”ہاں تو ایس ایچ اڈسرفراز احمد تم نوکری کس کی کرتے ہو؟“

”سرکار کی۔۔۔“

”تمہارے پیشے کا مقصد کیا ہے؟“

”عام عوام کو تحفظ فراہم کرنا۔“

”کیا تم نے عام عوام کو تحفظ فراہم کیا؟“

”میری بیس سالہ سروس ایک ریکارڈ ہے۔ جس سے مرضی جا کر پوچھ لیں۔ میں ایک ایماندار۔۔۔“

نوادرد نے اُسکو درمیان میں ٹوک دیا۔

”تمہاری بیس سالہ سروس میں سنہری حروف میں تمہاری بے غیرتی کے چرچے لکھے ہوئے ہیں۔ کن کن

حکمرانوں کے تم نے تلوے چائے ہیں۔ کن کن کے دھندوں کو بھٹنے پھولنے میں مدد دی ہے۔“

”یہ یہ سب الزام ہے۔ تم ہو کون؟۔۔۔“

”مجھے اپنا باپ ہی سمجھو۔“

جس لہجے میں کہا گیا تھا۔ سرفراز کو سوچنے پر مجبور کر گیا۔

کیا اُس پر انکوائری لگائی گئی تھی؟ ان لوگوں کا تعلق کس محکمے سے ہے۔؟ اپنے رویے سے کوئی تخریب کار

نہیں لگ رہے تھے۔ انکا انداز انتہائی پروفیشنل تھا۔

وہ صبح پانچ بجے گھر کی قریبی پارک میں چہل قدمی کے لیے آیا تھا۔ جب سے اُس ہلڈ پریشر کی شکایت ہوئی

تھی۔ ڈاکٹر نے صبح نہار منہ سیر کرنے کا مشورہ دیا ہوا تھا۔

پارک کے دروازے پر ہی پہلے سے رُکی ہوئی ایک گاڑی کو بظاہر بونٹ کھول کر دیکھنے والے آدمی نے

سرفراز کے قریب آنے ہر نہ جانے کیا کیمیکل سرفراز کو انجیکشن کے ذریعے لگایا تھا۔ جس نے اُسکو نیم فالج زدہ کر

دیا۔ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہوا تھا۔ اُسکے بعد جب اُسکی آنکھ کھلی وہ اس کمرے میں موجود تھا۔

”تم نے کہا تمہارا کام عام عوام کی حفاظت کرنا ہے۔ ٹھیک۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“

”تین ماہ پہلے تمہارے تھانے میں ایک ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی کا کیس درج کروانے آئی تھی۔ کیا تمہیں یاد ہے؟“

”مجھے کچھ یاد نہیں۔ نہ جانے ایک دن میں کتنے ہزاروں لوگ کیس جمع کرواتے ہیں۔ مجھے ہر کیس تو ازبر نہیں ہو سکتا۔“

”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر وہ کیس تو ازبر رہتے ہو گئے۔ جن میں تمہیں منہ مانگا مالی فائدہ حاصل ہوا۔“

”میں رشوت نہیں لیتا ہوں۔“

”کس کو بتا رہے ہو؟ میں کہہ چکا ہوں۔ مجھے اپنا باپ سمجھو میرے پاس تمہارے اک ایک کر توت کار یکارڈ موجود ہے۔ جو جو نوازشیں تم نے کالے دھندے والوں سے وصول کیں۔ جواب میں تم نے بے قصور لوگوں کا خون چوس کر اپنی حرام کی کمائی حلال کرنے کی پوری جانفشانی کی ہے۔ مگر وہ کیا ہی کہ۔ لوگوں کے فیکس سے ملندہ والی تنخواہ تم مفت میں کھاتے رہے ہو۔ کیونکہ آج تک عوام کو تم سے بھلائی کوئی نہیں ملی۔ اب وہ کمائی حلال کرنے کا وقت ہے۔“

”اب بتاؤ نوید نامی پندرہ سالہ بچے کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ کن لوگوں کا ہاتھ تھا۔ اور جب وہ مدد لینے تمہارے پاس آیا تم نے جواب میں کیا سلوک کیا؟ ساری کہانی حرف بہ حرف دہراؤ جہاں ایک لفظ کا بھی ہیر پھر ہوا۔ میں تمہاری چڑی اُدھڑ کر تمہیں شکاری کتوں کے سامنے پھینک دوں گا۔ کسی کو تمہاری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔“

”تم جو کوئی بھی ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ تم کن لوگوں کے ساتھ دشمنی پالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ تمہاری نسلیں ختم کر دیں گے۔“

”میری زندگی میرے اللہ کی دین ہے۔ موت بھی برحق ہے۔ جو اللہ ہی کی جانب سے آئی ہے۔ میرا صرف ایک ہی مالک ہے۔ جسکا میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ اس لیے اب بہت سوچ سمجھ کر میرے سامنے اپنے زمینی خداؤں کا

نام لینا۔ ورنہ جو چند سانسیں بچی ہیں۔ اُن سے بھی جاتے رہو گے۔“

”بولو نوید والے کیس میں حقیقت کیا ہے؟۔۔۔“

”میں کسی نوید کو نہیں جانتا۔“

نو وارد نے پاس کھڑے لڑکے کو اشارہ کیا اور خود دونوں ہاتھ کمر پہ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

وہ لڑکا سر اثبات میں ہلا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ ایک منٹ بعد واپس آیا تو ایک چار فٹ کے بل پٹ کا بیلٹ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ مگر وہ کتا اتنا طاقتور تھا۔ لڑکے کی پوری طاقت کے باوجود کتا اُسکو کھینچتا ہوا چل رہا تھا۔

ٹھٹھے کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔

ایک دفعہ بھونکا تو وہاں موجود افراد کو اپنے کانوں پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُس نے سرفراز کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھول دی۔ جو پہلے ہی ٹھٹھے کی موجودگی کو محسوس کر کے منتوں پہ اتر آیا تھا۔

اُس کے ایک اشارے پر کتا یوں ٹھٹھے سے سرفراز کی طرف بھاگا اگر پیچھے سے اُسکو فوراً پکڑ نہ لیا جاتا تو یقیناً وہ سرفراز کو دو سیکنڈ میں چیز پھاڑ کر رکھ دیتا۔ کتا غراتے ہوئے اُچھل اُچھل کر سرفراز کی جانب لپک رہا تھا۔ کمرے کا بلب بند کر کے ایسی لائٹ جلائی جا چکی تھی۔ جو صرف ٹھٹھے اور سرفراز کے علاوہ باقی کمرے اور انسانوں کو تاریکی کا حصہ بنا گئی۔

کالی شلوار قمیض والا چلتا ہوا ٹھٹھے کے پاس آیا اور اُسکی فرمیں ہاتھ مار کر چھکی دی۔ کتا اور بھی خوفناک شکلیں بناتا ہوا بھونکنے لگا۔

سرفراز گری پہ بیٹھا خوف سے سفید ہو گیا۔ شلوار گیلی ہو گئی۔

”کیا اب بھی تمہاری یادداشت میں نوید کا نام نہیں آیا؟“

”نوید کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی تھی۔“

اب کی بار سرفراز کسی ربوٹ کی طرح بولتا چلا گیا۔ افسر کے اشارے پر ماتحت نے کتا وہاں سے ہٹا دیا۔ سرفراز بول رہا تھا۔ اور وہ گہری سنجیدگی اور آنکھوں میں نفرت لیے سُن رہا تھا۔

”یہ کام اُسکے اُستاد نے کیا تھا۔ جس اکیڈمی میں وہ ٹیوشن پڑھنے جاتا تھا۔ وہاں پر ایک موجود ایک اُستاد نے اُسکو بلیک میل کر کے بہت عرصہ تک اُسکو اپنی زیادتی کا شکار بنایا تھا۔“

”کیسی بلیک میلنگ۔۔۔؟۔۔۔“

”نوید اپنے گھر والوں سے چوری شراب کی عادت میں مبتلا تھا۔ ایک دن اکیڈمی میں کلاس چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ چھت پر بیٹھ کر شراب پی رہا تھا۔ جب اُس آدمی نے اُن لڑکوں کی وڈیو بنالی۔ بعد میں اُنکو دیکھا کہ دھمکی دی کہ اگر وہ اُسکی بات نہ مانیں گے۔ وہ یہ وڈیو اُنکے والدین تک پہنچا دیگا۔“

”تو اسکا مطلب یہ ہوا ایک نوید ہی نہیں کئی اور لڑکے بھی اس شیطانی عمل کا شکار ہوئے تھے۔“

”ہاں۔۔۔۔“

”تم نے اُن میں سے کتنے لڑکوں کی مدد کی؟۔۔۔“

”میں کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔“

”کیوں؟۔۔۔“

”کیونکہ اکیڈمی کے اُستاد کی ادھر تک پہنچ ہے۔ مجھے اُسکے خلاف کارروائی سے روک دیا گیا تھا۔“

اندھیرے میں سے ایک ہاتھ اُٹھا۔ پٹاخ کو آواز کے ساتھ سرفراز کے منہ پر اپنے انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔ ”میں نے کہا تھا جھوٹ مت بولنا۔“

اُسکے ساتھ ہی اُس نے ایک ایک کر کے کئی تصویریں سرفراز کی گود میں پھینکی تھیں۔ جکو دیکھ کر سرفراز کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

تصویروں میں وہ خود تھا۔ اور اُسکے ساتھ وہی نوید نامی لڑکا تھا۔

”اب آیا کچھ یاد؟۔۔۔“

”یہ ایک بہت بڑا نیٹ ورک ہے۔ جو پورے ملک میں پھیل رہا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے کارندوں کو خاص ٹریننگ دی ہوئی ہے۔ یہ گلی محلوں اور سکول کے بچوں کو ٹارگٹ کرتے ہیں۔ انکا اصل شکار کم سن بچے ہیں۔ یہ انکو ٹریپ کر کے جنسی تشدد کا شکار بناتے ہیں۔ اُن سے اپنے غلط مطالبات منوانے کی خاطر اُنکو بُری طرح مار پیٹ

کرتے ہیں۔ اُن پر اسلحہ تان کر دھمکی دیتے ہیں۔ اگر جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ نہ کیا گیا تو یہ انکو وہیں اُسی وقت جان سے مار دیں گے۔ کئی کیسز میں بچوں کو ایسی وڈیو دیکھائی جاتی ہے۔ جس میں ایک بچے کو گلا کاٹ کر مارتے دیکھایا جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں بچے مجبوراً اُنکی باتیں مانتے چلے جاتے ہیں۔ پہلی دفعہ اُنکو قابو کرنے کے بعد دھمکی دی جاتی ہے۔ اگر اُنہوں نے باہر جا کر کسی سے اس بات کا ذکر کیا۔ یا کسی کو اُنکے خلاف بتایا۔ اُس صورت میں اُنکی وڈیوز پورے سوشل میڈیا پر پھیلا دی جائیگی۔ بچے بدنامی اور جان کیڈر سے کسی کو نہیں بتاتے اور کئی کئی سال تک ان لوگوں کے ظلم کا شکار رہتے ہیں۔ جو اُنکی زندگی کا سب سے بڑا شاک ثابت ہوا۔ نوید سالوں کی برین واشنگ کے نتیجے میں اس قدر بے حس ہو چکا ہے۔ وہ اب اس چیز کو نہ محسوس ہی نہیں کرتا۔ کیونکہ نہ صرف وہ لوگ بچوں کہ وڈیوز بناتے ہیں۔ بلکہ اُنکو پونو گرافک ویب سائٹس دیکھا کر ذہنی طور پر اُنکو مفلوج کر دیتے ہیں۔ جہاں وہ جو کچھ دیکھتے اور اُس کے بعد عملاً کرتے ہیں۔ اُسی کو بچ ماننے لگتے ہیں۔ تم ان کو ختم نہیں کر سکتے ہو۔ ان لوگوں نے معاشرے میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کیا ہوا ہے۔“

”اگر کل کو یہی لوگ تمہارے بیٹے یا بیٹی کو شکار کرتے ہیں۔ کیا تب بھی رشوت لیکر گھر بیٹھ جاؤ گے۔ کیا تب بھی ان لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے ڈالنے کی بجائے اپنے بچوں کو قصور وار گردان کر مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرو گے۔ اور خود بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو نے بیٹھ جاؤ گے۔“

”تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے بچوں کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی۔“

ایس ایچ اڈاندریرے میں اُسکی جانب دیکھتے ہوئے غرایا۔

”کیوں کیا بڑی تکلیف ہوئی ہے؟۔“

”کیونکہ یہ تمہارے بچوں کی بات ہے؟۔“

”اُن معصوم روحوں کی عصمت گری جو تمہارے اختیار کے نیچے ہوئی۔ اللہ کے سامنے کیا جواب دینا ہے؟۔“

کبھی سوچا ہے؟۔۔۔“

”محشر تو کل برپا ہوتا ہے۔ مگر میں پوری کوشش میں ہوں۔ تمہاری باقی زندگی ہی ایک عبرت بن جائے۔ مگر

میں تمہیں چانس دے رہا ہوں۔“

سرفراز احمد جو ہر وقت اس زعم میں رہتا تھا۔ وہ ایک پولیس آفسر ہے۔ کس مائی کے لال میں ہمت ہے۔ جو اُسکے سیاہ و سفید پر سوال کر سکے۔ جنہوں نے اُنکو پیسہ لگایا تھا۔ اُنہوں نے ہی اوپر والی سیٹیں خریدی ہوئی تھیں۔ اسی لیے تو سسٹم بدلتا نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں ایک غلط دوسرے غلط کو بھلنے پھولنے میں مدد دیتا ہے۔

’س نے قائل میں سے ایک تصویر نکال کر سرفراز کے سامنے رکھی۔

”تم بھی ایک فیملی والے انسان ہو۔ غالباً ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں کم از کم اتنی گارنٹی دینے کو تیار ہوں۔ تمہاری فیملی اس جنگ سے محفوظ رہے گی۔“

”وہ لوگ میرے بچوں کو نہیں چھوڑیں گے۔“

”یہ تو تمہارے تعاون کرنے پر منحصر ہے۔ اگر تم سرکاری گواہ بن جاتے ہو۔ باوجود اس کے کہ تم اُن کے ساتھی ہو۔ میں تمہارے خاندان کو پروٹیکشن دلوانے کو تیار ہوں۔ تمہارے خاندان کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے۔ اور اگر تم اُنہی حرام خوروں کے ڈر سے نہ جانے کتنے اور معصوم پھولوں کی زندگی سے کھیلنے کے اس عمل کو روکنے میں میری مدد نہیں کرتے تو میں تمہیں میڈیا پر والٹیر بنا کر پیش کر دوں گا۔ جو خود آگے آکر اپنے جرائم کا اقرار کر رہا ہے۔ اپنے سارے گروہ کے راز فاش کر چکا ہے۔ تو تم جانتے ہی ہو وہ تمہیں مارنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے دو دن ہیں۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہوا تو گاڑ کو بتا دینا۔ کیونکہ بیٹا تو زندہ سلامت اس کوٹھری کے باہر دن کی روشنی صرف اسی صورت میں دیکھ پائے گا۔ اگر میرا ساتھ دیگا۔ ورنہ میں تیرے لیے ایک ہی گولی ضائع کر دوں گا۔ میرے ملک میں ہر روز تجھ جیسے حرام خوروں کی وجہ سے نہ جانے کتنے بے گناہ موت کی بھیٹ چڑھتے ہیں۔ وہاں ایک آدھ ٹجھ جیسا جائے گا تو دھرتی کا بوجھ کم ہوگا۔“

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ ساری تصویریں قائل میں بند کرنے کے بعد وہاں سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ حرا باجی سے سلام دُعا کرنے کے بعد اور کسی کا سامنا کئے بغیر سیدھی اماں وڈی کے کمرے میں آئی۔ حرا باجی سے ہی پتا چلا اماں وڈی بڑی بہو کے ساتھ گاؤں میں کسی فوٹگی والے گھر گئی تھیں۔ درمیان والا دروازہ کھول کر اپنا سامان اپنے کمرے میں رکھا۔ اور اپنی ساری سوچ و پریشانی کو ایک طرف رکھ کر خود کو بہلانے کی کوشش

میں کام میں بھٹ گئی۔

اماں وڈی کی الماری سے سارے کپڑے نکال کر سلیپے سے تہہ لگا کر واپس رکھے۔ اماں وڈی کی پسند بڑی لا جواب تھی۔ دھیمے رنگوں کے دوپٹے سیٹ کچھ بریزا میں کچھ گل احمد میں۔ استری ہونے والے استری کر کے رکھے۔ جوڈھلنے والے تھے۔ انہیں سرف میں بھیگونے کے بعد بیڈ کی چادر تبدیل کی۔ سارے کمرے میں اثر فریڈنر سپرے کیا۔

وہ کپڑے کھٹکانے کے بعد باہر ڈالنے جا رہی تھی۔ جب وڈی اماں کی آمد ہوئی۔
جوا سکود دیکھتے ہی غصے میں آ گئیں۔

”ادھر آؤ ناں۔۔۔“

”میں یہ کپڑے ڈال آؤں۔۔۔“

اماں وڈی پھولے ہوئی سانس سمیٹ جا کر کرسی بیٹھتے ہوئے رانوں کو آواز دیتے ہوئے بولیں۔

”کپڑے رانوں کو دو۔ وہ ڈال دیگی۔ تم ادھر آؤ میرے پاس۔۔۔“

”رانوں کو ڈالنے نہیں آتے۔ وہ کپڑے اُلٹے لٹے بغیر ڈال دیتی ہے۔ جس سے پرندوں کے گندے پنچوں

کے نشان لگ جاتے ہیں۔ میں خود پھیلا کر آتی ہوں۔“

”تم اتنی شگھڑ نہ بنو۔ رانوں تمہاری تک چڑھی پھوپھی کی خاص ملازمہ ہے۔ اگر وہ اُسکو راضی رکھ سکتی ہے۔

تو میرے کپڑے بھی پھیلا سکتی ہے ویسے بھی باہر گھپ اندھیرا ہو رہا ہے اس وقت پرندے کہاں سے آنے

ہیں۔“

اس دوران رانوں اپنی پراندی ہلاتی ہوئی آ گئی۔

”جی وڈی اماں۔۔۔ ارے تاشقہ باجی تم آ گئی ہو۔ پتا بھی نہیں چلا۔“

”ہاں میں اعلان کرنا بھول گئی تھی۔ یہ لو اماں وڈی کے کپڑے اچھے سے کر کے پھیلاتا۔“

”لو جی میں تو ہر کام ہی اچھا کرتی ہوں۔ لائیں ادھر۔۔۔“

رانوں کپڑے اُسکے ہاتھ سے لیکر یہ جاوہ جا ہوئی۔

اُس نے ڈری نظروں سے وڈی اماں کو دیکھا۔ جو ابھی تک اُس کو غصے سے گھور رہی تھیں۔

”اب ادھر آ کر بیٹھو گی یا میں دعوت نامہ بھیجوں۔“

”اگر آپ بے عزتی کرنے کو بٹھا رہی ہیں۔ تو میں نے نہیں آنا۔“

”نواب زادی کہیں کی میں بھلا کیوں بے عزتی کرونگی۔ میں تو تمہارے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے کو

بٹھا رہی ہوں۔ شرم تو نہیں آتی؟۔ یہ آخر کیا حماقت ہے۔“

”اب مزید کوئی حماقت نہیں ہوگی۔ کیونکہ سب ختم ہو گیا ہے۔“

اُس نے نہ محسوس انداز میں اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ اور آ کر اماں کے ساتھ خالی پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا ختم ہوا ہے؟۔۔۔“

”رشتہ۔۔۔“

”کس کا رشتہ؟۔۔۔“

”میرا اور اُس کا۔۔۔“

”کس نے کہا؟۔“

”وہ کہہ کر گئے ہیں۔“

”وہ یہاں آیا تھا؟۔۔۔“

اماں وڈی کے ماتھے پر موجود تیوری مزید گہری ہو گئی۔

”وہ مجھے چھوڑ کر گئے ہیں۔“

”پر تمہیں لینے کو تو غفور گیا تھا۔“

”راستے میں وہ نازل ہوئے تھے۔“

”کیا کہہ رہا تھا؟۔۔۔“

”میں نے کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”پھر یہ کیوں کہہ رہی ہو۔ رشتہ ختم ہوا ہے؟۔“

اُسکی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر آنسو ٹپ ٹپ برسنے لگے۔

”اماں وڈی کیا واقعی آپ کو مجھ سے کوئی ہمدردی ہے؟۔۔۔“

”یہ کیسا سوال ہے؟۔ ہمدردی نہ ہوتی تو مجھے یوں اپنے ساتھ باندھ کر کیوں رکھتی۔ تیرے مرحوم باپ کے

ساتھ میرا وعدہ تھا۔ مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑ دگی۔“

”اگر ایسا ہے تو پلیز میری جان بچھڑا دیں۔“

”کس نے پکڑی ہے تیری جان۔۔۔“

”اُسی نے جواب مطالبوں پر اُتر آیا ہے۔ میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ آج تو وہ صرف ہاتھ پکڑتا ہے۔ تو میرا

جی چاہتا ہے اُسکا منہ نوچ لوں۔ اُسکے جسم کو دانٹوں سے زخمی کر دوں۔ میرے پاس کوئی بندوق ہو میں ساری

گولیاں۔۔۔“

بولتے بولتے چپ کر گئی۔ زبان تالو سے چٹ گئی۔ یہ کیا کہنے جا رہی تھی۔ ساری گولیاں اُسکے سینے میں اُتار

دوں۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ہیٹنا شروع کر دیا۔ اتنے زور زور کے تھپڑ مارے لگی۔ اماں وڈی نے

دھل کر اُسکے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں کئے۔ وہ دھیمی مگر پھٹی آواز میں بولی۔

”میرے ہاتھ چھوڑ دیں۔ کیا آپ نے سنا نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔ میں اُسکا منہ نوچنا چاہتی ہوں۔ جس

کے سوا مجھے کسی کا چہرہ اچھا ہی نہیں لگتا۔ وہ میری آنکھوں میں رہتا ہے۔ اور میں اُسی کے وجود کو چھلنی کرنے کا

سوچتی ہوں۔ مجھے مار دیں۔ میرا گلا دبا کر مجھے مار دیں۔“

اُسکی حالت دیوانوں سی ہو رہی تھی۔ اماں وڈی کے دونوں ہاتھ اپنی گردن کی طرف کھینچتے ہوئے مسلسل رو

رہی تھی۔

انہوں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ اُنکے کمرے میں کوئی بھی جب چاہتا آ سکتا تھا۔ اگر اس وقت کسی

فرد کا آنا ہوتا تو یقیناً کئی سوال جنم لیتے۔

انہوں نے بڑی مشکل کے ساتھ اُسکو اپنے ضعیف بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگایا۔ شفقت کے ساتھ اُسکے

سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ دیرے دیرے تسلی دینے لگیں۔

”بس میری بچی حوصلہ کر۔۔۔ اللہ سب ٹھیک کر دیگا۔ وہ بڑا کریم ہے۔ میں ہوں ناں میں تمہیں اس طرح ٹوٹے تھوڑی دو گئی۔“

اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سر اٹھایا۔

”آپ اُنکو کہہ دیں وہ مجھے چھوڑ دیں۔ مجھے بھول جائیں۔ کبھی میرے سامنے نہ آئیں۔ آخر کل کو سب جاننے کے بعد بھی تو مجھے چھوڑ جائیگے۔ تو بہتر نہیں آج ہی چھوڑ جائیں۔ اماں وڈی میں تعلق نبھانا تو دور کی بات بنا بھی نہیں سکتی۔“

”تمہاری دوا کدھر ہے؟۔۔۔“

”میں نے آنے سے پہلے دوا کھائی تھی۔“

”ایک خوراک اور کھاد۔ جاؤ شاہاں وہ دراز پہ پانی کا جگ رکھا ہے۔ گلاس میں پانی ڈالو۔ اور دوا نگل جاؤ۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔ اماں وڈی؟ مجھے تو اب دنوں مہینوں سالوں کا حساب ہی نہیں رہا کہ کب سے یہ گولیاں کھاتی آرہی ہوں۔ انہوں نے کیا بدلا ہے؟ میں تو آج بھی ویسی ہی ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں بھولنا۔ لوگوں کی یادداشت چھن جاتی ہے۔ میں اس معاملے میں بھی خوش قسمت نہیں ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے وڈی اماں کہ اللہ اپنے ایک ہی بندے کی قسمت میں اتنی ڈھیر ساری محرومیاں رکھ دئے۔ کیا تھا جو اللہ مجھے بھی اپنے پسندیدہ لوگوں میں شامل کرتے۔ مجھے کیوں ایسوں میں شمار کیا جنہیں وہ ناپسند کرتا ہے۔“

”تو بہ کرو تا صفہ ایسے نہیں کہتے۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ اللہ کو تم سے محبت نہیں ہے؟۔۔۔“

”وڈی اماں دیکھیں میری طرف کیا اللہ جن سے محبت رکھے اُن کی حالت میرے جیسی ہوتی ہے؟ کیا زمانے میں اُنکی شہرت میرے جیسی ہوتی ہے۔ لوگ میری طرف دیکھتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ وڈی اماں میں کوئی اندھی بہری تو نہیں ہوں ناں۔ اے کاش اُس مجھے اندھا بہرہ ہی بنا دیا ہوتا۔ تو میں اپنے رشتے رادوں کے چہروں پر جو نحوست مجھے دیکھ کر اُترتی ہے۔ اُس سے تو انجان رہتی۔ جو میری پھوپھیاں مجھے گھورتے ہوئے بڑبڑاتی ہیں۔ وہ سُنائی نہ دیتا۔ میں نے آخر کیا کیا ہے؟ مجھے بُروں میں شمار

کیوں کیا گیا ہے؟۔۔۔“

”کس نے کہا تم بُری ہو۔ تم تو بڑی نیک لڑکی ہو۔“

”مت کہیں مجھے نیک۔ یہ سب آپ مجھے تسلیاں دینے کو کہتی ہیں۔ آپ بس میرے پہ ایک آخری احسان کر دیں۔ اسکو کہیں وہ مجھے چھوڑ دئے۔“

وہ آج اُنکو کی بجائے اُسکو کہہ رہی تھی۔

”چھوٹی عمر میں جو نہ انسان کو لگ جائے وہ آسانی سے نہیں جاتا۔ وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔“

”ٹھیک ہے پھر میں اُسکو چھوڑ رہی ہوں۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی۔ جا کر بیک میں رکھا موبائل نکال کر واپس آئی۔ کانپتی انگلیوں سے لاک ہٹا کر ان ہا کس کھولا۔

لائف لائن واہے ٹائٹل والا اکاؤنٹ کھول کر وائس ایپ پر آئی ڈی کھول کر میسج لکھنے لگی۔

”میں تافہ عباس اپنے پورے ہوش و حواس میں آپ کو چھوڑ رہی ہوں۔ آج کے بعد میرا اور آپ کا کوئی لینا دینا نہیں۔ آپ میرے لیے کبھی نہ تھے۔ آج میں آپ کے لیے بھی مر گئی۔“

میسج بھیج کر اُس نے فون لاک کر کے بیڈ پر پھینکا۔

اپنے دوپٹے سے رگڑ کر سارے آنسو صاف کئے۔ بیک میں سے دو نیلی پتلی گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ گلے میں اتار لیں۔

اماں وڈی کو وضو کروانے میں مدد دی۔ وہ ابھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ جب نوازش علی ہلکی سی دستک دیکر اندر آ گئے۔ وہ وضو کر کے نکلی تھی۔ مگر نوازش علی لود کچھ کر جائے نماز کو بڑھتا ہاتھ درمیان میں ہی رُک گیا۔ کیونکہ اُنکے

پچھے اُنکی بیگم بھی تھیں۔ تافہ پر نظر پڑتے ہی شمیم کی تیوری چڑھ گئی۔

اُس نے نظر انداز کرتے ہوئے نوازش علی کو سلام کیا۔

”اسلام علیکم اکل۔۔۔“

”وعلیکم اسلام تافہ بیٹی کیسی ہو؟ گھر پہ بھابھی اور بچیاں سب ٹھیک تھے؟۔۔۔“

”جی اکل۔“

”اچھی بات۔۔۔ جب اماں نماز سے فارغ ہو جائیں۔ مجھے بتا دینا۔ میں اتنی دیر باہر بیٹھتا ہوں۔ اچھی ہوا چل رہی ہے۔ اندر تو آئے سی آن ہونے کے باوجود جس محسوس ہوتا ہے۔“

”جی اچھا۔۔۔“

اُس نے فرما برداری سے کہا۔ نوازش علی تو باہر نکل گئے۔ جبکہ شیم اُسکو گھورتے ہوئے وہیں بیٹھ گئیں۔ وہ کہہ کچھ نہیں رہی تھیں۔ مگر اندر کی نفرت آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ وڈی اماں کو سلام پھیرتے دیکھ کر شیم تافہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔

”اماں کے کپڑے تیار کر دو۔ کل میرے فریوڈ کا رشتہ دیکھنے جا رہی ہیں۔“

تافہ نا سبھی سے شیم کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

”ایسے کیا گھور رہی ہو منحوس۔۔۔ سُنا نہیں اماں کا سب سے اچھا جوڑا تیار کر دو۔“

”میں سُن چکی ہوں۔ بد قسمتی سے بہری تو میں ہوں نہیں۔ اور آپ براہ مہربانی مجھ پر صرف اپنی نفرت ہی

جتایا کریں۔ حکم چلانے کی کوشش نہ ہی کریں۔ کیونکہ نہ تو میں آپکی ملازمہ ہوں۔ نہ آپکا لیکر کھاتی ہوں۔“

”اب گھورے کیا جا رہی ہو۔ منہ میں کچھ ڈالا ہوا ہے۔ جو بولتی بند کئے کھڑی ہو۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔

خواخواہ سامنے آ کر میرا بی بی بڑھا دیتی ہو۔“

شیم کو بولتا دیکھ کر اُسکو اپنی ہڈ دلی کا احساس ہوا۔ وہ جو کچھ سوچ رہی تھی۔ مر کے بھی کہہ نہیں سکتی تھی۔ اسلیے

چپ چاپ وہاں سے ہٹ گئی۔

باہر آئی تو ساری لڑکیاں گروپ کی صورت میں بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ تافہ پہ نظر پڑتے ہی

عائشہ نے ہانک لگائی۔

”ارے بے وفا تا شو جلدی سے ادھر مرو نہ تیرا میرا مرن جیون ختم۔۔۔“

تافہ کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دل میں سوچا عشا کی نماز واپس آ کر پڑھ لوگی۔ دھبی چال چلتی ہوئی

گیٹ تک آئی۔ باقی لڑکیاں جا چکی تھیں۔ مگر عائشہ اُسکے انتظار میں ہی کھڑی تھی۔

تافہ کے قریب آتے ہی اُسکے گلے لگ گئی۔

”کیا گھر جا کر کھانے کو نہیں ملتا۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔“

”پیار تھی۔ اسلیے کمزوری ہوئی۔“

”کیا بیماری تھی؟۔۔۔“

بھاری مردانہ آواز پر اُس نے چونک کر پوچھنے والے کی جانب دیکھا۔

فریود صاحب آنکھوں میں شوق کی قدیلیں لئے اُسکو ہی دیکھ رہے تھے۔

تافہ کے چہرے سے مسکراہٹ یوں غائب ہوئی جیسے بادلوں میں سورج غائب ہوتا ہے۔

”فریود بھائی آپ اپنی ٹرپ سے کب واپس آئے؟۔۔۔“

”صبح کا آیا ہوا ہوں۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟۔“

”وہ ساری لڑکیاں ذرا نہ پر جا رہی ہیں۔ میں اور تافہ پیچھے رہ گئے۔“

”تافہ جی تو بڑی مغرور لگتی ہیں۔ جس دن میں آیا تھا۔ تب بھی سیدھے منہ سلام کا جواب نہ دیا۔ اور آج

بھی میرا سوال سرے سے گول ہی کر گئی ہیں۔“

”ارے نہیں فریود بھائی تافہ تو ذرا مغرور نہیں ہے۔ ہاں بس کسی کے ساتھ زیادہ فری نہیں ہوتی ہے۔ آپ

محسوس نہ کیجئے گا۔ یہ یہاں واسع بھائی سے ہی کبھی بات کر لے تو کر لے ورنہ باقی کسی لڑکے کو مخاطب کرنا دور اُکلی

جانب دیکھتی بھی نہیں ہے۔“

”ہاں وہ تو سارے اسکے کزن نہیں ہیں۔ نہ بھی بولے تو کوئی بات نہیں۔ مگر میرے تو یہ ماموں کی بیٹی ہے۔

مجھے کیوں اتنا اگنور کرتی ہے۔ یا پھر دیسی لڑکیوں والے نخرے تو نہیں دیکھا ہی ہے۔“

اندر کمرے میں ماں کو چھوڑ کر باہر بھاگی تھی۔ اور اب آگے بیٹا آ گیا تھا۔

تافہ کو فریود کی گہری نظروں سے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔ جی چاہا شیم پھوپھی کو آواز دے آ کر اپنے لخت

جلک کو قابو کرو۔ تمہاری نیچ بھتیجی کے ساتھ علیک سلیک بڑھا رہا ہے۔

”عائشہ چلیں؟۔۔۔“

”ہاں چلو۔ اچھا فریود بھائی پھر بات ہوتی ہے۔ اپنی مری والی تصویریں ضرور دیکھائے گا۔“

”چلو میں تم لوگوں کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اس وقت میں بھی فارغ ہی ہوں۔“

”عائشہ مجھے شیم پھوپھو نے اماں وڈی کے کپڑے تیار کرنے کو بولا تھا۔ کل فریود صاحب کے لیے رشتہ

دیکھنے جا رہی ہیں۔ میں نہر پر پھر کسی وقت چلی جاؤں گی۔ ابھی ذرا کام کر لوں۔“

عائشہ کا جواب سُنے بغیر ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتی اندر چلی گئی۔

عائشہ نے معذرت خواہ نظروں سے فریود کو دیکھا۔ جو سنجیدہ نظروں سے تلافیہ کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

پھر عائشہ کی طرف مڑا۔

”کیا یہ میری وجہ سے واپس چلی گئی ہے۔۔۔ اتنی عجیب کیوں ہے؟۔۔۔“

”آپ اسکو پرسٹل نہ لیں۔ آپ کی جگہ عدیل یا نبیل بھائی بھی ہوتے تب بھی اُس نے ایسا ہی کرنا تھا۔ اصل

میں شیم چچی نے ایک آدھ دفعہ اسکو گھر کے کسی لڑکے کا کام کرتے دیکھ کر بڑی غلط باتیں کر دی تھیں۔ حالانکہ

مخاطب یہ کسی سے بھی نہیں ہوتی۔ سب ہی یہ بات جانتے ہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں آپ کی امی تلافیہ کو اتنا

ناپسند کرتی ہیں۔ کچھ یہ دیے بھی چُپ چُپ ہی رہتی ہے۔ اوپر سے چچی کے رویے نے اسکو اور بھی روکھا کر دیا

ہے۔“ وہ دونوں باتیں کرتے گھر سے نکل کر نہر کی جانب چل بڑے۔

فریود نے کندھے اُچکاتے ہوئے ادھر ادھر کی اور باتیں شروع کر دیں۔ یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی آخر

اُسکی ماں کو تلافیہ سہتا رکھا تھی۔

”تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟۔۔۔“

”ایک دم بور۔۔۔“

فریود نے ہلکا سا تھقہ مارا۔۔۔

”یعنی بس گُزارا ہی ہے۔ کوئی خواب یا جنون کوئی نہیں ہے۔“

”جنون ہے ناں بھائی۔۔۔“

”ہاں جانتا ہوں۔ ناؤ پڑھنے کا جنون ہے۔ مگر میں سوچتا تھا۔ اب تک ہماری عاشو کچھ نہ کچھ سنجیدہ ہوئی گئی ہوگی۔“

”کیا کرنا ہے سنجیدہ ہو کر۔۔۔ ہونی تو اینڈ پہ شادی ہی ہے۔“

ایک دفعہ پھر فریود کے لب پھیلے۔۔۔

”بڑی ہو کر کیا ہوگی۔“

”ہائیں آپکو میں چھوٹی لگتی ہوں؟۔۔۔“

”تو اور کیا ابھی تو تم میرے کندھوں تک بھی نہیں آئی ہو۔“

”ہائے اللہ اپنے آپ سے تو نہ ہی ملائیں۔ آپ تو سرو اور سفیدے کی طرح لمبے ہی لمبے ہیں۔ مجھے نہیں ہونا اتنی لمبی۔ میرا قد جتنا ہے۔ اتنا ہی ٹھیک ہے۔“

چار پانچ منٹ میں ہی انہوں نے باقی پلٹون کو جالیا۔

فریود کی آواز سننے ہی حرا خوشی سے بولی۔

”فریود آج ذرا ہاتھ لگے ہو تو اپنے ملک کی سزاؤں کیا تھا جوتے ہوئے کوئی ایک آدھ گوری ہی لے آتے۔“

”ہاں وہاں مفت ہتھی ہیں ناں جو آپ کی خدمت کے لیے لے آتا۔“

”میرے بھائی ہماری نہیں پر اپنی خدمت کو ہی لے آتے۔ اب چچی بیچاری نے کئی لڑکیاں رو کر نی ہیں۔“

”گوری کو تو جیسے امی جی نے سو بسم اللہ کر کے گلے لگانا تھا۔“

”کیا پتا لگا ہی لیتیں۔ آخر اتنی گوری بہو ہونی تھی۔“

”دفعہ کریں گورارنگ حرا آپا آپکا بھائی کالی کے ساتھ ہی گزارا کر لے گا۔“

ساری لڑکیاں مکئی کے دانوں کی طرح کھڑکھڑا کر نہیں۔۔۔

”لالے اپنی چچی بڑی سٹاکش عورت ہیں۔ بڑا اونچا ناک ہے۔ وہ کسی کالی کو بہو نہیں بنانے والی ہیں۔“

انہوں نے سارے ملک کر لڑکیوں کو وخت ڈال دینا ہے۔“

”میں بھی انہی کا بیٹا ہوں۔ میں اُلٹا اُلٹو وخت ڈال دوں گا۔ تم لوگ کیوں دل چھوٹا کرتی ہو۔ تمہارا بھائی لڑکی

ڈھونڈ چکا ہے۔ شادی تو اُسی سے ہوتی ہے۔“

ہر طرف سے ایک ہی آواز اُٹھی۔۔۔

”کون ہے کون ہے؟ کیسی ہے؟ یقیناً گوری ہی ہے۔ جودل لے اُڑی۔ ہائے بھاری چچی کے ارمانوں کا کیا خون کیا ہے۔“

”تم ساری کی ساری پہلے یہ فیصلہ کرلو۔ میرا ساتھ دینا ہے۔ یا میری امی جی کا۔“

”ہمیں چچی کے ہاتھوں قتل ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ لہذا ہم سب کی جانب سے پیشگی معذرت۔۔۔“

”کیسی بہنیں دئی ہیں۔ یارب جو مشکل کے آتے ہی آنکھیں پھیر گئی ہیں۔“

پورا گھنٹہ نہر پہ بیٹھ کر گئیں ہانکنے کے بعد وہ لوگ واپسی کو مڑے راستے میں فریودنے سب کو کھوئے والی گلفیاں دلوائیں۔

اگر کسی کے دل میں یہ خیال تھا کہ فریود اپنی دنیا میں گمن رہنے والا لڑکا ہے۔ وہ تاثر دور ہو گیا تھا۔ کیونکہ چھٹی والے دن گھر کے باقی لڑکوں کے ساتھ وقت گزارتا۔

گھر داخل ہوتے ہی وہ سیدھا باہر والی بیشک میں گیا۔ کمرے میں قدم رکھا نظر ثنی وہ سکرین پر پڑی جہاں نئی آنے والی انڈین فلم چل رہی تھی۔ اُسکے سارے کزن اے سی کی ٹھنڈک میں مست لیٹے تھے۔

غصے کو قابو کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ ٹی وہ کا پلگ نکال دیا۔

”او یہ کیا کر رہے ہو؟۔۔۔ یارا بھی ہی تو اصل ایکشن شروع ہوا تھا۔ تم نے آکر دو میان میں ہی سارا ستیاناس کر دیا۔“

”میں جب بھی اس کمرے میں آتا ہوں۔ تم لوگ کوئی نہ کوئی فلم ہی دیکھ رہے ہوتے ہو۔ دنیا کی بھی ہوش خبر ہے یا نہیں؟۔۔۔ کیڑے پڑے جانوروں کی طرح اندر گھس گھس کر آرام ڈھونڈتے ہو۔ نکلوانا ذرا باہر۔۔۔“

”اویار باہر جا کر کیا کریں۔ کوئی کام بھی تو ہو۔“

”کام ہی ہے۔ آج پانی لگانے کی باری ہماری ہے۔ دو لوگ ادھر جاؤ اور دوسرے دو ڈرائیور کو جا کر ڈرائیو

دو۔ کب سے بچارہ ٹریکٹر پر بیٹھا ہوا ہے۔“

”تمہیں کیوں اتنی فکر ہو رہی ہے۔ اگر وہ کھیت تیار کر رہا ہے۔ تو احسان نہیں کر رہا اُسکو تنخواہ ملتی ہے۔“

”اُسکو صرف تنخواہ ملتی ہے۔ اور وہ اس قدر مختی ہے۔ تم لوگوں کو تو فری میں کھانا پینا پہننا اوڑھنا۔۔۔ نرم بیڈ فری والی قائی نوابی طرز زندگی سب کچھ ملا ہوا ہے۔ پھر تم لوگ محنت کر کے اپنے اوپر لگائے گئے اپنے ماں باپ کے مال کو حلال کیوں نہیں کرتے۔ سارا سارا دن ساڈو کی طرح پڑے اونگھتے رہتے ہو۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔۔۔ نکلوا ہر آج سے میں اس کمرے کو تالا لگا رہا ہوں۔ سب اپنے بستر اور چھت پر لگاؤ اور آج کے بعد ادھر ہی سونا۔“

”تو ہمارا ابا بننے کی کوشش نہ کر۔ چار دن باہر کیا رہ آئے ہو۔ اپنے آپ کو کوئی توپ چیز سمجھنے لگ گئے ہو۔ جانے سے پہلے تم ہی یہاں لڑکیوں کے پیچھے خوار ہوا کرتے تھے۔ آج بڑے عقل مند بن رہے ہو۔“ عدیل کی بات پر وہ بڑے تحمل سے بولا۔

”تم میرے ساتھ منہ ماری کر کے اگر مجھے چپ کروانے کے چکر میں ہو۔ تو بتا دوں۔ اپنی انرجی ضائع نہ کرو۔“ اُس نے مزید کچھ کہے بغیر ڈی ڈی پلیز اٹھا کر بغل میں دبایا اور وہاں سے نکل آیا۔

اگلا ساپ رضیہ چچی کا پورشن تھا۔

”یہ کیا اٹھائے گھوم رہے ہو؟۔۔۔“

”آپکے لیے ٹھکھ لایا ہوں۔ اس ڈبے کو کسی بستر والے بڑے کے ٹریک میں پھینک کر تالا لگا دیں۔“ رضیہ پہچانتے ہوئے بولیں۔

”چھاپہ مار کر آ رہے ہو۔“

”ہاں جی۔ اب آپ کے شوہر صاحب سے ایک کام ہے اُسی کے سلسلے میں آیا ہوں۔“

”یعنی کام نہ ہوتا تو تم نے ادھر نہیں آنا تھا۔“

”نہیں میں ایسا بھی مطلبی نہیں ہوں۔ آپکے ہاتھ کی بنی دھڑیڈ کالسی پینے کے لیے ہر صبح آتا تو ہوں۔“

رضیہ چچی جواب دینے ہی لگی تھیں۔ جب اندر سے دھگیمر کی آواز آئی۔

”کیا باہر فرود بول رہا ہے؟ اُسکو اندر بھیج مجھے کام ہے۔“

”جاؤ تمہاری خشبو اندر جا چکی ہے۔ اب آواز پہ آواز آتی ہے۔“

”آپ چچا بھتیجے کی محبت پر جلنے کی بجائے فالسے کا شربت بنا کر پلائیں۔ قسم سے ساری جائز خواہشات پوری ہونگی۔“

”سب سے جائز خواہش تو تمہارے لیے لڑکی دیکھنے جانے کی ہے۔ وہاں جانے کے لیے تو تمہاری اماں نے ہمیں جھوٹے منہ بھی دعوت نہیں دی ہے۔“

”ارے پہلی پہلی دفعہ جو جارہی ہیں۔ ایسے ایسا روکھا رویہ رکھے ہوئے ہیں۔ ابھی تو نہ جانے کتنی لڑکیاں دیکھیں گی۔ پر آپ فکر نہ کریں۔ شادی میں آپ کی پسند کی لڑکی کیساتھ ہی کروں گا۔“

”بھابھی کے کان میں تمہاری یہ بات پڑی ناں تو وہ تمہیں کمرہ اریسٹ کر دیں گی۔ یہ تو اماں وڈی کے ڈر سے وہ ہم لوگوں کو برداشت کر رہی ہیں۔“

”کیا آپ کو میری محبت پر کوئی شک ہے؟۔۔۔ وہ ایک چھوڑا لاکھ مرتبہ مجھے آپ سے دور کرنے کی کوشش کریں۔ پر میں نے تو کبھی آپ کو نہیں چھوڑنا ہے۔ آپ تو میری چھوٹی ماں ہیں۔ جس بیٹے سے آپ کو اتنی محبت ہے۔ اُسی محبت کے صدقے اُسکی ماں کے رویے کو بھی نظر انداز کر دیا کریں۔“

”اچھا جاؤ جا کر چاچو کی بات سُن لو۔ ماشا اللہ پتا نہیں کہاں سے اتنی سیانی باتیں سیکھ کر جوان ہوئے ہو۔ ہر وقت ڈر رہتا ہے۔ ہماری ہی نظر نہ لگ جائے۔“

”شہزادہ گلغام صاحب اگر تعریفوں سے دل بھر گیا ہو تو اندر تشریف لے آئیں۔ ہمارے ابا حضور ملاقات کو بے تاب ہیں۔ دو چار قصیدے وہاں سے بھی سُن لیں۔“

واسع کا چہرہ دروازے کے فریم میں ابھرا۔۔۔

اُس نے ڈی ڈی وائی ڈی باکس رضیہ کے ہاتھ میں دیا۔ خود واسع کے گلے میں بازوؤں ڈال کر اندر چلا گیا۔ جہاں دنگیر کارپٹ پر سارے کھاتے کھول کر حساب کتاب میں مصروف تھے۔

”چوہدری صاحب اگر گندم اس دفعہ زیادہ ہی اچھی ہو گئی ہے۔ تو کوئی دس بارہ لاکھ میرے یار کی شادی پہ ہی

لگا دیں۔ بچارہ کب سے آپکی جوتیاں سیدھی کر رہا ہے۔ کسی کو بچے کا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔“

”تمہارا بھی کہیں رشتہ پکا ہو جائے۔ پھر دونوں بھائیوں کی شادی ایک ساتھ کر دیں گے۔“

دبلیو کے جواب پر وہ ہنسنے لگا اور اُنکے قریب بیٹھ گیا۔ اور اُنکے ہاتھ سے قلم لیکر پرچیوں پہ لکھی تفصیل رجسٹر میں اتارنے لگا۔“

”یہ سراسر ظلم ہے۔ کیوں بے زبان کی بددعا لیتے ہیں۔ میرا بھائی اس قدر شریف اور شرمیلا ہے۔ اگلے دو سال تک بھی آپ اسکی رخصتی نہ کریں۔ تب بھی اپنے منہ سے نہیں کہے گا۔ پر میرا تو جگر ہے۔ یہ نہ بھی کہے مجھے پتا چل جاتا ہے۔ اب اسکی رخصتی ہونی چاہیے۔“

”میری فکر چھوڑو اپنی سوچو۔۔۔۔۔“

واسع کی بات کے پس منظر کو بڑی اچھی طرح جاننے کے باوجود مسکرا دیا۔

”میرے لیے سوچنے والوں کی لمبی لائن ہے۔ اس لیے فی الحال میں اپنے دماغ کو آرام دے رہا ہوں۔“

”فرہود تم ہوتے کہاں ہو؟ کبھی ایک جگہ۔ نک کر بیٹھ بھی جایا کرو۔ جب بھی کسی کو تمہاری تلاش میں سمجھوں یہ ہی جواب آتا ہے۔ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ پرسوں سنا کہ مری گئے ہوئے ہو۔ یا امریکہ جیسا ملک دیکھ آنے کے بعد بھی تمہارے سیر پائے کے شوق پورے نہیں ہوئے۔“

”چاچو جی امریکہ امریکہ ہے۔ اور پاکستان پاکستان ہے۔ دونوں کا کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں ہے۔ نہ تو امریکہ میں پاکستان جیسے پہاڑ اور موسم ہیں۔ نہ پاکستان میں امریکہ جیسا قانون۔۔۔۔۔“

”کیا بات کر رہے ہو۔ امریکہ کا قانون تو دنیا کا اندھا ترین قانون ہے۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا کیس اس بات کی زندہ مثال ہے۔“

کاپی پر چلتے فرہود کے ہاتھ وہیں رُک گئے۔

”چاچو ڈاکٹر عافیہ کا کیس امریکہ کے اندھے قانون سے زیادہ مسلمان جوانوں کی بے غیرتی کا ثبوت ہے۔ ہماری حکومتوں کے منہ پر گھلا تماغ ہے۔ اقبال نے ہماری توجہ اسی طرف کروائی تھی۔ جب فرمایا

خودی کیا ہے راز دورِ نِ حیات
 خودی کیا ہے بیدار کی کائنات
 ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
 نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
 زمانے کی دھارے میں بہتی ہوئی
 ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
 ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
 ہوئی خاکِ آدم میں صورتِ پزیر
 خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
 فلک جس طرح آنکھ کے حل میں ہے
 اور پھر فرمایا۔۔۔

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
 خودی ہے تنقِ فساں لا الہ الا اللہ

جب آج کا ہمارا جوان غیرت کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ تو ہماری بہنیں بیٹیاں کس طرح محفوظ ہوں گی؟
 جب معاشرے کا کوئی اصول ہی نہ رہے۔ جب بُرائی کو بُرائی سمجھنا چھوڑ دیں۔ تو کام کیسے چلے گا؟۔۔۔
 آج ہمارا سارا فوکس برینڈ ڈکپڑے ہیں۔ فیشن ٹرینڈر دیکھنا ہمارا پسندیدہ مشغلا ہے۔ آپ نوویں دسویں
 کے بچوں کو پوچھ لیں۔ لڑکے ایڈی ڈاس 'نائیکی' 'زارا' گوچی کے دیوانے نظر آئیں گے۔ سکول بیگ سے لیکر
 سیل فون تک لیٹس ماڈل کا چاہیے۔ لڑکیاں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ ہمارے اپنے گھر کی مثال لے لیں۔ گاؤں میں
 پیدا ہوئیں یہیں پٹی بڑھی ہیں۔ مگر جب مارکیٹ جاتی ہیں۔ بریزا، گل احمد، پیور کے علاوہ کسی کپڑے کی جانب
 دیکھنا بھی تو ہین سمجھتی ہیں۔ جو کپڑا دس، پندرہ ہزار سے کم سرمائے میں آئے اُسے کسی کھاتے میں نہیں ڈالا جاتا
 ہے۔“

”فرہود تم کہاں سے ایسی باتیں کیسے ہو؟۔ گھر چھوڑ سارے خاندان برادری میں کوئی ایسے خیالات والا نہیں ہے۔“

رضیہ اندر آ گئیں تھیں۔ اب حیرت سے پوچھنے لگیں۔ جس پر فرہود مسکرا بھی نہ سکا۔

”بس چچی جب تک ہم آسانوں کا شکار رہتے ہیں۔ دنیا کی حقیقت سے ناواقف رہتے ہیں۔ اپنی دنیا اور اپنے حال میں مگن۔ پر جب اکیلے دنیا کا سامنا کر کے اپنی جگہ بنانے کا شوق چڑھے تو پھر احساس ہوتا ہے۔ میں تو ایک نفلے سی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ جب ابو نے میرا دیزا تو لگوادیا پرائر پورٹ پر رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا جو رقم اس وقت مجھ سے لیکر جا رہے ہو۔ میری طرف سے تمہارا وہی حصہ لکھتا ہے۔ اسکے آگے کچھ اُمید مت رکھنا۔ اپنا سارا خرچ خود اٹھانا ہے۔ مجھے اُس وقت ابو کی بات فقط ایک مذاق ہی محسوس ہوئی۔ امریکہ جیسا مہنگا ملک اور کوئی مالی مدد نہیں مر کے بس فیسوں کے خرچے ہی پورے ہو جاتے پھر بھی تھا۔“

”ادھرامی نے کبھی خود سے بل کر پانی کا گلاس تک نہیں اٹھانے دیا تھا۔ ادھر لوگوں کے سامنے جی حضوری کرنی پڑی۔ شائد ہی کوئی ایسا کام بچا ہو۔ جو میں نے نہ کیا ہو۔ ابو نے کہا تھا شادی کروانے کا بڑا شوق ہے۔ تو اپنے آپ کو کسی قابل بنا کر دیکھاؤ۔۔۔“

”برخودار تم نے بھی تو حد ہی کر دی تھی۔ ابھی ایف ایس سی بھی مکمل نہیں ہوئی اور جناب کو شادی کا بھوت چڑھ گیا۔“

”چاچی یہ بھی تو غور کریں ناں۔۔۔ آج کل سستے فون بیچ اور ساری ساری رات پڑھائی کے بہانے فون اور لیپ ٹاپ پر جو جو کچھ ہو رہا ہے۔ میں نے یہ سب تو نہیں ناں کیا۔ بس وہ لڑکی اچھی لگ گئی۔ جھٹ امی کو ہتا دیا۔ یہی فطری کی۔ امی نے تو مجھے نانی یاد کروادی۔ سدا کے چپ رہنے والے ابو بھی اُن دنوں جلا دہی بن گئے تھے۔ اُس وقت مجھے سمجھ آئی جب انسان کے ستارے گردش میں آجائیں۔ پھر سارے کام ہی اُلٹ ہوتے ہیں۔“

”چلو اگر ماں باپ نے سختی کی تو آج اُسکا پھل بھی تو مل رہا ہے۔ جو کل تک ماں باپ کے ناک میں دم کئے رکھتا تھا۔ آج ماشا اللہ اتنا نیک اور سعادت مند بیٹا ہے۔ جس کی ہر ماں باپ کو خواہش ہوتی ہے۔“

”امی آپ اتنی امپرلیس نہ ہوں۔ یہ آج بھی کہینے کا کہینا پانی ہے۔ بس باتیں بنانے میں ماہر ہو گیا ہوا ہے۔“
آخر گھاٹ گھاٹ کے پانی پی کر آیا ہے۔“

واسع نے ماں کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا جس پر فریودہ ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔
”واسع بھائی اگر آپ کے والدین آپ کے مقابلے میں چھوٹے بھائی سے زیادہ ایمپرلیس ہیں۔ تو اس بات پر آپ کے پیٹ میں کیوں مڑوڑا اُٹھ رہے ہیں۔ کچ برداشت کیوں نہیں ہوتا جی جاجی۔۔۔“
واسع ہنستے ہوئے بولا۔

”بیٹا تو پہلے یہ فیصلہ کر لے۔ تو میرا سالا ہے۔ یا بھائی ہے۔“
”میں ٹو ان ون ہوں۔ جس وقت جس رشتے میں زیادہ فائدہ نظر آئے گا۔ وہی بن جاؤں گا۔ جیسے ابھی آپ بالکل جی جاجی لگ رہے ہیں۔“
”یعنی اس وقت تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے۔“

”جی میری جان درست سمجھا ہے۔ مجھے اپنے فون کے لیے نئی بسم چاہیے۔ اگر ناگوارانہ گورے تو جا کر ڈسکے سے پکڑا لیتیں۔“

واسع نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ رضیہ گلاسوں میں قالے کا شربت ڈالتے ہوئے بولیں۔۔۔
”کیا بسم کل نہیں آسکتی؟۔ اب تو بڑی رات ہو گئی ہے۔“
”امی صرف سوادس ہوئے ہیں۔ ہم لوگ آدھے گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ ویسے بھی ہمارا راستہ بڑا صاف ستھرا ہے۔ ڈروالی کوئی بات نہیں ہے۔“
فریودہ جسر واپس دیتے ہوئے بولا۔

”وہ جو چار کھکے چھٹیوں کی وجہ سے عیاشی مار رہے ہیں۔ اُن سے کام لیں۔ ابھی میں کہہ کر تو آیا ہوں۔ مگر ایک دفعہ آپ ڈانٹ دیں گے۔ تو زیادہ اثر ہوگا۔“

”اُنکو میں دیکھ لوں گا۔ تم دونوں نے اگر ضروری ہی جانا ہے۔ تو جلدی نکلو۔ فون ساتھ لیکر جانا۔ اور واسع سوئٹ ہاؤس والے کو کہنا ابونے کل ڈیرے پر آنے کا کہا ہے۔“

”جی اچھا۔۔۔“

شربت کا ایک ایک گلاس پینے کے بعد دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر کو آ گئے۔

نچلے صحن میں ابھی تک نوازش علی اور چوہدرانی جی کی محفل جی ہوئی تھی۔ جس میں موجود افراد کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ گھر کی ساری نوجوان پارٹی وہیں بیٹھ کر آم کھانے کی مقابلہ بازی فرما رہی تھی۔

فرہود کے قدم پیچھے ہی رُک گئے۔ واسع کی فرہود کے ساتھ ٹکرائی جس پر وہ تلملا کر بولا۔

”بیچہ راستے میں پلر کی طرح رُک گئے ہو۔ بندہ کچھلی ٹریفک کا ہی خیال کر لیتا ہے۔“

”ٹریفک کا سنبھل صاحب آگے کچھری لگی ہوئی ہے۔ ادھر سے گورے تو دادی نے شہر نہیں جانے دینا۔“

”تو اب پھر کیا کریں۔“

”چھت کے راستے حویلی کی طرف نکل جاتے ہیں۔“

واسع کو تجویز پسند آئی تھی۔ جس پر عمل کرتے ہوئے واپس مُڑا۔۔۔

”آ جا میرے شیر اس دفعہ میں آگے لگتا ہوں۔“

واسع آگے فرہود پیچھے ابھی دو ہی قدم اٹھائے تھے۔ جب نوازش علی کی آواز پہنچ گئی۔

”ائے جی سرکار اتنی خاموشی اور دبے پاؤں۔ آخر کدھر کی تیاریاں ہیں؟“

فرہود کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی۔۔۔

”مر گئے یار۔۔۔“

رُک کر پیچھے دیکھا۔ تمام حاضرین محفل کی توجہ کا مرکز وہی دونوں تھے۔ جن کے چہرے دوسری جانب

تھے۔ وہ بھی گردنیں موڑ کر اُن کو ایسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے واسع اور فرہود کے سینک نکل آئے ہوں۔

”اب کیا کریں۔۔۔؟۔۔۔“

واسع کے پوچھنے پر فرہود بولا۔

”مجھے تمہارے سوال سے میڈاگاسکر۔ نمیبیڈ فلم کا وہ سین یاد آ گیا ہے۔ جب جانور کارگو شپ پر سوار تو ہو

جاتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ شپ میں تیل ختم ہے۔ اور جب پیگلوین اپنے باس سے پوچھتا ہے۔ کیا اٹکو بتا

دو شپ میں تیل نہیں ہے۔ اسلئے بیوقوفوں کی طرح خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس آئلیڈ سے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ تو باس جواب دیتا ہے۔

ان کو خوش ہونے دو۔ کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر انکو خبر ہو ہی جانی ہے۔ اسلئے تم لوگ بس مسکرا کر الوداعی ہاتھ ہلاتے جاؤ۔“

واسع ہنستے ہوئے بولا۔

”تمہارا مطلب ہے۔ ہمیں بھی یہی کرنا چاہیے؟“

”اور کیا مسکراؤ اور ہاتھ ہلا دو۔“

”ادھر کھڑے ہو کر کیا گھسّر مھسّر کر رہے ہو۔ ادھر کیوں نہیں آ رہے۔“

ناچار وہ دونوں آگے بڑھ آئے۔

”بڑے چاچو یہ لوگ ادھر تو نہیں جا رہے ہیں۔“

عدیل نے جیب سے سینما کے دو ٹکٹ نکال کر نوازش علی کے سامنے کئے۔

نوازش علی تو ادھر متوجہ ہو گئے۔ پر فریودنے واسع کو نظریں دیکھائیں۔ اور تاسف میں سر ہلایا۔

”فریود بھائی ذرا عجیب نہیں لگتا۔ دوسروں کو روک ٹوک کرنا۔ جو بچا رہے گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر کوئی

ایک آدھ فلم دیکھ لیں۔ اُسکی اتنی تکلیف ہو رہی تھی۔ اور خود آپ سینما جاتے ہیں۔“

”پہا پھا کٹھی عورت کہیں کے میں سینما جاتا ہوں۔ مجھ دیکھنے نہیں جاتا جو مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش میں

ہو۔ جو فلمیں تم دیکھتے ہو۔ اُن میں سوائے ٹھکر کی پن اور ستے روئیس کے اور کیا ہوتا ہے؟“

”ہاں جی آپ تو کروئیکل آف موزاز جیسی فلمیں ہی دیکھتے ہیں۔“

واسع پہلے ہی آم پکڑ کر کھانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ فریود عدیل کو قابو کرنے کے چکر میں جلدی سے وڈی

اماں اور باجی حرا کے درمیان خالی پڑی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اچھا یا ایک ڈیل کرتے ہیں۔ میں سینما جانا بند کر دیتا ہوں۔ تو اپنا دیسی سینما بند کر دے۔ بتاؤ منظور ہے؟“

بات کرتے کرتے یونہی اپنی امی پر نظر پڑی جو اُسکے برابر بیٹھی حرا کو گھور رہی تھیں۔ میکا کی انداز میں بائیں

طرف گردن موڑ دیکھا۔ ایک پل کو تو اپنی بات بھول گیا۔ جسے وہ باجی حرا سمجھا تھا۔ وہ تافہ عباس تھی۔ دونوں کے کندھے مٹس ہو رہے تھے۔ وہ غم و غصے سے اُسکو دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ اُسکا آدھے سے زیادہ دوپٹہ فریود کے نیچے آیا ہوا تھا۔ ورنہ وہ اُسی وقت وہاں سے اٹھ گئی ہوتی۔

فریود کو لگا جیسے اُن دو آنکھوں نے اُسکو جکڑ لیا ہو۔ ہل بھی نہیں سکے گا۔ سارے چہرے ساری آوازیں غائب ہو گئیں۔

واسع کو بُری طرح غوطہ لگا تھا۔ کھانس کھانس کر اُسکی حالت بُری ہوئی۔ مگر اُسکا فائدہ یہ ہوا۔ سب کی توجہ فریود سے ہٹ کر واسع کی جانب ہو گئی۔ فریود بھی ہوش میں آ کر معذرت کرتا فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ باقی کا سارا وقت وہ کسی سے بھی کوئی بات کئے بغیر اپنے والد کے پہلو میں بیٹھا آموں سے انصاف کرتا رہا۔

تافہ کے پہلو سے فریود کے اٹھتے ہی واسع کی کھانسی رُک گئی تھی۔ یہ بات تافہ کے سوا کسی نے شاید محسوس بھی نہ کی تھی۔ وہ بغیر کسی بات کے خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ کیونکہ ہیم ابھی بھی زہر خند نظروں سے اُسکو ہی دیکھ رہی تھیں۔ جیسے فریود کے وہاں بیٹھنے میں سارا قصور تافہ کا ہو۔

تافہ کا دل بُری طرح بھرا آیا۔ نہ جانے اس عورت کا اُس نے کونسا نقصان کیا تھا۔ جو وہ اُسکی بے ضرر جان سے اتنا ہیر رکھتی تھیں۔ اُس نے وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی۔ اس بات سے بے خبر کہ کسی نے ترچھی ڈھکی چھپی نظروں سے دور تک اُسکا تعاقب کیا تھا۔ اندر آ کر اُس نے اپنا بیک خالی کیا۔ جو ابھی تک ویسے ہی اُسکے بستر پر پڑا ہوا تھا۔

اماں وڈی کی سونے سے پہلے لینے والی دوائی کال کر اُنکے بیڈ سائڈ پر رکھی۔ پھر اپنا فون لیکر اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ لائٹ بند ہی رہنے دی۔ باہر کا موسم پیارا تھا۔ اند تھی تو جس ہی مگر اور کوئی آپشن نہ تھا۔ اماں وڈی کے کمرے میں موجود اے سی کی کولنگ جہاں تک بھی آتی تھی۔ جو گوارے کے لیے بہت کافی تھی۔

تافہ کے موبائل کا انٹرنیٹ ڈیٹا چلاتے ہی وائس ایپ پہ میسج آ گئے۔ لائف لائن کی طرف سے فُل دو میسج تھے۔ جنہیں وقتی طور پر انور کرتے ہوئے سیماب کے میسج کھول کر

پڑھنے لگی۔ حالانکہ دل کر رہا تھا۔ فوراً کھول کر دیکھے آخر اُس نے کیا جواب دیا ہے۔

بڑی توجہ سے سیما ب کے میسج پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ الفاظ آگے پیچھے گڈمڈ ہوتے رہے۔ دل کی دھڑکن کانوں میں ڈرم کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ دوپل کو آنکھیں موند کر اُس نے گہرا سانس بھرتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔ اُس سے تعلق ختم کرنے کا شوق ہے۔ اور اتنا سا بھی صبر نہیں ہے۔ اُس سے بات کئے بغیر تو گزارا نہیں ہوتا۔ اُس کو چھوڑ دیگی کیسے؟۔۔۔۔۔“

آنکھیں کھول کر فون کی سکرین دیکھی۔ لائف لائن کے نام والی پیٹ کھولی۔ کتنی دیر لب بھینچ کر سنجیدہ نظروں سے سکرین کو دیکھتی رہی۔ جہاں صرف اتنا لکھا تھا۔
تینو چھڈیئے تے تھاں مرئیئے

دل تینو دے بیٹھے ہن کرئیئے تے کی کرئیئے۔۔۔۔۔
”چھوڑنے کی باتیں غصے میں کر لو۔ مذاق میں بول لو۔ پر حقیقت میں یہ میری موت کے بعد ہی ممکن ہوگا۔“ بے یقینی سے اپنی جگہ تھم کر رہ گئی۔ کتنی آسانی سے وہ یہ بات کہہ گیا تھا۔
بے اختیار سے جلدی جلدی اُلگھیاں کی بورڈ پر بھاگنے لگیں۔

”اتنی بڑی بات آپ اتنی آسانی سے کیسے کہہ گئے؟۔۔۔“
سیما ب کو جواب دیئے بغیر ہی اُس نے فون بند کر کے سائڈ پوڈال دیا۔ آنکھوں کی نمی ہتھیلی کی پوٹ سے پونچھ لی۔ جب میسج کی ٹون نے متوجہ کیا۔
لائف لائن کا ہی میسج تھا۔

”تم اگر ایک ہی دن میں میرے کردار کو مٹا لوک سمجھ کر مجھے دھتکارنے کے بعد مجھے چھوڑنے کا حکم سنانے کے باوجود میری موت کے ذکر پر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھ سے اپنی اُنسیت جتا سکتی ہو۔ تو کیا تم سے ہلکا سا ناراض ہونے کا مجھے حق نہیں ہے؟۔۔۔۔۔“

”اگر میں معافی مانگ لوں۔ تو کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے؟۔۔۔۔۔“
ہیڈ بورڈ سے ٹیک لگا کر منتظر نگاہوں سے سکرین پر جواب کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ جب بیچ میں سیما ب کی

کال آگئی۔ اُس نے اُنکلی کی حرکت سے کال کاٹ دی۔

”معافی مت مانگو۔ مجھے بس اپنے رویے کی وجہ بتادو۔“

”کوئی وجہ نہیں ہے؟“

”اگر کوئی وجہ نہیں ہے۔ تو کیا تم جان بوجھ کر مجھے مار چر کرنے کو ایسا سلوک کرتی ہو؟۔ فون پہ نارمل باتیں کرتی ہو۔ سامنے آنے پر یوں اجنبی بن جاتی ہو۔ جیسے مجھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور میں کوئی خون آشام بلا ہوں۔ جو اپنے زہریلے دانت نکال کر تمہیں کھا جاؤں گا۔“

”میری ایک بات مانیں گے؟۔۔۔“

”ماننے والی ہوئی تب۔۔۔“

”ہم ایک دوسرے سے رابطہ ختم کر دیتے ہیں۔“

”اُس سے کیا ہوگا؟۔۔۔“

”اُس سے آہستہ آہستہ ہی سہی مگر دل بہل جائے گا۔“

”میرا یا تمہارا۔۔۔؟۔۔۔“

کافی دیر بعد کانپتی اُگلیوں سے لکھا۔

”دونوں کا۔۔۔“

”تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟۔“

”کیونکہ میں آپکے قابل نہیں ہوں۔ آپکے ساتھ وہ زندگی نہیں گزار سکتی جو آپکا حق ہے۔ میں نارمل نہیں ہوں۔ میری زندگی میں کچھ بھی نارمل نہیں ہے۔ میں آپکو کھونا نہیں چاہتی ہوں۔ اور آپکے ساتھ رہ بھی نہیں پاؤں گی۔“

وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطیاں تھی۔ جب ٹون دوبارہ بجی۔۔۔

”کیا میں اتنے سالوں کے تعلق میں تمہارا اتنا سا بھروسہ حاصل نہیں کر پایا ہوں۔ جس کے بل بوتے پر تم مجھ سے اپنی پریشانی بیان کر پاؤ؟۔“

”مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

”خود کو با آؤر کروا رہی ہو۔ یا مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔“

”جھوٹ کیوں بولو گئی۔“

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ کیوں مسلسل جھوٹ پہ جھوٹ بول رہی ہو۔ دل کی جو بات ہے۔ وہ بے خطر ہو کر کہہ دو۔“

”آپ چاہتے ہیں کیا باتیں کر رہے ہیں۔ میری طرف سے شب بخیر۔۔۔“

”ٹاشفہ۔۔۔“

”جی۔۔۔“

”میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”کیونکہ تمہارے رویے نے مجھے ڈرا دیا ہے۔“

”کیسا ڈر۔۔۔؟“

”کھونے کا ڈر۔۔۔“

”آپ جتنے غصے میں گئے تھے۔ مجھے تو لگا اب کبھی مجھ سے بات ہی نہیں کریں گے۔“

”تمہارے معاملے میں خود اپنے آپ کو بھی حیران کرتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضروری کام سے جانا ہے۔ پھر بات ہوگی۔“

خدا حافظ کے ساتھ کس کا ایسوجی آیا تھا۔ ٹاشفہ کو عجیب بھی لگا اور حیران مگن بھی کیونکہ پہلے کبھی بھی اُس نے یہ ایسوجی نہیں بھیجا تھا۔ پھر خود کو تسلی دیتے ہوئے سمجھایا۔

”ہو سکتا ہے۔ غلطی سے ایسا ہوا ہو۔“

مجھے تو غلطی سے بھیجا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ کسی اور کے ساتھ دوستی ہو۔ کسی اور کو ہر روز ایسا میسج بھیجتا ہو؟ ہونے کو تو کچھ بھی ممکن ہے۔ میں اُسکو جانتی ہی کتنا ہوں۔ سوائے ایک ورچوئل تعلق کے اور ہے ہی کیا؟

اُسکو خود اذیت کی اتنی عادت ہو چکی تھی۔ جیسے خوش مزاج لوگ بُری سے بُری صورتحال میں بھی کوئی نہ کوئی خوشی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہر خوش ہونے والی بات میں بھی کوئی نہ کوئی نقطہ ایسا سوچنے بیٹھ جاتی جو خوشی کی روشنی کو ماند کر دیتا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر نعیم بیالیس سال کا ایک انتہائی خوبصورت مرد تھا۔ اپنے حلقہ احباب میں بے حد مقبول "الیٹ کلاس" کی بیگمات اُسکی مستقل گاہک تھیں۔ اسکے علاوہ بھی آج تک اُس نے اپنے ہاتھ سے کوئی ایسا موقع جانے نہیں دیا تھا۔ جس میں پیسہ بننے کے چانسز ہوں۔ اُسکا چھوٹا بھائی ڈیٹسٹ تھا۔ ایک ہی جگہ پر دونوں نے مل کر بہت ہی پُر شکوہ آفس بنایا ہوا تھا۔ آج ہر وہ کاروبار کامیاب نظر آتا ہے۔ جو عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتا ہے۔ پھر بڑی لوگ اُسی چیز کو فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو فخر یہ بتاتے ہیں۔ فلاں سالون کے علاوہ آج تک کبھی کہیں سے بال نہیں کٹوائے۔ فلاں ڈیزائنر میرا فوٹ ہے۔ جوتے اس برینڈ کے جیولری اُس ڈیزائنر کی اسی طرح ڈاکٹر نعیم بھی سب سے جد اسب سے مہنگا۔ کیونکہ یہ بھی امیری دیکھانے کا ایک انداز ہے۔ اور اسی موقعے کو ڈاکٹر نعیم نے بڑے عمدہ انداز میں کش کیا ہوا تھا۔ اُسکی ظاہری پروقاہل بڑی پُرکشش تھی۔ بلینائر خوبصورت مرد ہونے کے باوجود اُس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اور شرافت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ آج تک کسی لڑکی کے ساتھ اُسکا کوئی افر تک نہ دیکھنے میں آیا۔

کیونکہ وہ پوری طرح سے اپنے کام کے ساتھ مخلص تھا۔

یہ ڈاکٹر نعیم کا عام تاثر تھا۔ مگر اُس کے بہت ہی قریبی دوست اُسکے اصل رنگ و روپ سے واقف تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنے کلینک کے ڈسمنٹ میں اپنے بھائی اور خاص کارندے سمیت موجود تھا۔

چہرے پر پسینے کے قطروں کے ساتھ ساتھ پسینہ بھی چمک رہا تھا۔

”تم نے ابھی تک ڈیوری کی کیوں نہیں ہے؟۔۔۔ جانتے ہو کتنے لاکھوں کا نقصان ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر نعیم کے غصے کے سامنے اُسکا بھائی منمنایا۔

”بچھلے دو ہفتوں سے اُس اُلو کے پٹھے ایس ایچ او کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اُس کے گھر والوں سے پوچھ لیا۔“

ساتھ کام کرنے والوں سے استفسار کیا۔ ہر کوئی لاعلم ہے۔ مال ہمیشہ اُسکی گاڑی میں جاتا ہے۔ راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ اس طرح تو بڑی مشکل پیش آسکتی ہے۔“

ڈاکٹر نعیم نے اپنی سانپ جیسی چمکتی آنکھوں کو اپنے خاص کارندے پر فکس کیا۔

”اُسکے گھر پر فائرنگ کرواؤ۔ اگر ہمیں دھوکا دینے کو کہیں روپوش ہے۔ تو فوراً منظر پر آئے گا۔ مجھے اپنا نقصان کسی صورت منظور نہیں ہے۔ جیسے بھی ہو اس کام کو ممکن بناؤ ورنہ اپنی منحوس شکلیں لیکر میرے سامنے مت آنا۔ اور ہاں وہ جو نیا لڑکا تھا موتی۔۔۔؟ وہ کیسا جا رہا ہے؟۔۔۔“

موتی کے نام پر وسیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اُس نے کچھ نئی وڈیوز ایڈیٹ کی ہیں۔ آپ دیکھیں گے تو دل خوش ہو جائے گا۔ ہمیں پچیس فیصد کا منافع ہوا ہے۔“

”اُس کو خوش رکھنا۔ تنخواہ میں بھی اضافہ کرو۔ وہ ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے۔ اُسکی کوئی کمزوری ڈھونڈ دتا کہ وقت آنے پر استعمال کر سکیں۔“

”میں اُس پر سارا کام کر چکا ہوں۔ اسکا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ کہیں دل دل لگایا ہوا ہے۔ اُسی کے پیچھے ہر وقت توجہ سے کام کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ اپنے لیے ایک بڑا سا گھر بنائے گا جس میں بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ اُسکے بارے میں باقی سب تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ سگریٹ بہت پیتا ہے۔ دوسرا اُس نے کوئی دس کمپٹیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ ادھر تنخواہ لیتا ہے۔ ادھر کمپٹیوں پر خرچ کر کے خالی ہو جاتا ہے۔“

”ہمیں اس سے کیا کمپٹیوں پر لٹائے یا چاہے دریا میں بہائے جب تک ہمارا کام کرتا رہے۔ تم اسکو نوازتے رہو۔ ایسے قابل عقل کے اندھے لوگ ہم جیسوں کے لیے نایاب ہوتے ہیں۔ آج ہر حال میں ایس ایچ ادا کا سراغ نکالو۔“

”وہ ہو جائے گا۔ بس ایک اجازت چاہیے تھی۔“

ڈاکٹر نعیم اپنا کوٹ پہن کر نکل رہا تھا۔ مگر دروازے کے قریب رُکا۔

”بولو“

”وہ موتی پُرانے ریکارڈ مانگ رہا ہے۔ اُسکا کہنا ہے۔ اُنکا پرنٹ صاف کر کے دوبارہ سے دام وصول کروادئے گا۔“

”تو دے دو اجازت۔۔۔ ویسے بھی وہ کوڑا کباڑ کب تک سنبھال کر رکھنا ہے۔“

ڈاکٹر نعیم اپنی بات مکمل کر کے شان بے نیازی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ دروازے کی دوسری جانب ایک خوش شکل و خوش لباس جوان انتظار میں بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر کو باہر آتا دیکھ کر شرماتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر نعیم کی آنکھوں میں خمار کی کیفیت تھی۔ لب بڑی دلکشی سے مسکرائے تھے۔ اس مسکراہٹ پر ثار ہونے والیوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ جو ڈاکٹر کی فیس بگ ڈی پی پر اپنا دل کھول کر رکھ دیتی تھیں۔ ایک دوسری کونفرت سے دیکھتی تھیں۔ کہ نہ جانے کون پس پردہ ڈاکٹر کے دل تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔ حقیقت سے اگر وقف ہوئیں تو نہ جانے کیا کرتیں۔ ڈاکٹر کو حسین دوشیزاؤں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔

سامنے موجود لڑکے کو سرتا پیر لپاتی نظروں سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے اپنے لبوں پر زبان پھیری۔۔۔ وہ ایک ایسا اڑدہا تھا۔ جواب تک نہ جانے کتنے انسانوں کی سانس پی پٹکا تھا۔ مگر اُسکے گناہوں کی وجہ سے اُسکی رسی دراز سے دراز تک ہو چکی تھی۔

اپنے سے آدمی عمر کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خاص کمرے کی جانب لے گیا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر سے لیکر شام تک اُس نے مطلوبہ گھر کے آس پاس تین چار چکر کاٹے تھے۔ صرف یہ معلوم کرنے کو آیا گھر کی نگرانی تو نہیں ہو رہی۔ مگر ایسا کوئی نشان نہ ملنے پر وہ آخر گاڑی گھر سے دور ہی روک کر پیدل اُس طرف کو چل پڑا۔

جن کی طرف سے وہ محتاط تھا۔ اتنا تو اُسکو یقین تھا۔ سامنا ہونے پر وہ اُسکو پہچان نہ پاتے مگر وہ پھر بھی کسی کے آمنے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔

کالے رنگ کے شلوار سوٹ کے ساتھ پشاوری چپل پہنے کندھے پر دس کلو والا گیس سلنڈر اٹھائے وہ گنگنا تا

ہوا چل رہا تھا۔ یہ الگ بات گایا رہا ہے۔ بڑی غور سے سننے پر بھی سمجھ نہیں آتا تھا۔

گیٹ کی بیل بجانے کے ساتھ ہی وہ اونچی اونچی بولنے لگا۔

”اوسر کار دروازہ کھولو میں سلنڈر بھر والا یا ہوں۔ آج میں نے پیسے لیے بغیر واپس نہیں جانا۔ مجھے پہلی ساری رقم بھی آج ہی چاہیے ہے۔“

گیٹ چوکیدار نے کھولا۔ اور چہرے پر اُلجھن لیے بولا۔

”اڈے کون ہو تم۔۔۔ اور کہاں آنا چاہ رہے ہو۔“

”تم اپنی بیگم صاحب کو بلاؤ۔ مجھے انہوں نے بلایا ہے۔“

”ادھر زکو میں اندر پتا کر کے آتا ہوں۔“

چوکیدار اندر چلا گیا باہر کھڑے آدمی نے گلی میں دونوں طرف نظر ڈالی اور سلنڈر اٹھائے ہی چوکیدار کے پیچھے دہلیز پار کر گیا۔

”اندر داخل ہوتے ہی اُس نے سلنڈر اُتار کر ایک طرف رکھا۔ گیٹ اندر سے بند کیا۔

چوکیدار متوجہ ہو کر اپنی بندوق اُس پر سیدھی کرتے ہوئے لٹکا کر بولا۔

”ادھر ہی رُک جاؤ ورنہ ابھی کھوپڑی اُڑا دوں گا۔“

سامنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور مستحکم لہجے میں بولا۔۔۔

”میں سیکورٹی سے ہوں۔ میری جیب میں میرا ج موجود ہے۔ اگر چاہو تو نکال کر دیکھ لو۔ مجھے ایس ایچ او کے گھر والوں سے بات کرنی ہے۔ بہتر یہی ہے۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ جب تک میں اندر ہوں۔ تم باہر نظر رکھو۔“

”میں کیسے یقین کر لوں کہ تم سچ بول رہے ہو۔“

”تمہیں سامنے سے ہٹنا ہوگا۔ ورنہ مجھے تمہیں ہٹانا پڑے گا۔ سرفراز کے گھر والوں کی جان کو خطرہ ہے۔ میرا اُن سے ملنا ضروری ہے۔“

اس دفعہ اُس نے اپنی قمیض کے نیچے بند ہے ہو لٹر سے اپنا گالک سیونٹین نائن ایم نکال کر چوکیدار پر

اُسکے چہرے کی سنجیدگی اور ہتھیار پر مضبوط گرفت نے چوکیدار کو راستہ دینے پر مجبور کر دیا۔
اندر کی جانب جاتے ہوئے اُس نے چوکیدار کو چوکنا رہنے کی تلقین کی۔
گالک ایک دفعہ پھر ہولسٹر میں چلا گیا۔۔۔

اندر ونی دروازے پر دستک دیتے ہوئے وہ ابھی بھی اپنے ارد گرد پر نظر رکھے ہوئے تھا۔
دروازہ ملازمہ نے کھولا۔۔۔

”اسلام علیکم براہ مہربانی بیگم سرفراز کو بلا دیں۔“

ملازمہ کے جانے کے تین منٹ بعد ہی ایک پریشان صورت عورت دروازے میں نمودار ہوئیں۔

”جی آپ کون۔۔۔؟۔۔۔“

”میں کون ہوں۔ اس سے ضروری وہ بات ہے جو کرنے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ کیا آپ کہیں آرام سے بیٹھ کر میری بات سن سکتی ہیں۔“

”دیکھیے میرے میاں کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اتنے دنوں سے اُنکے ادارے نے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔
اوپر سے نہ جانے کیسے کیسے مشکوک لوگ میرے دروازے پر آ کر مجھ سے سوال و جواب کر رہے ہیں۔ گھر پہ
میرے جوان بچے ہیں۔ میں کیسے کسی ایسے آدمی کو اپنے گھر گھس آنے دوں جسکو آج سے پہلے دیکھا تک نہ ہو۔“
”سرفراز احمد ایک بہت خطرناک گروپ کی پشت پناہی کرتا رہا ہے۔ بلکہ اُنکا بڑا اہم رکن ہے۔ اُسی گروہ
کے آدمی آپکے پاس آتے ہوئے۔ کیونکہ آپکے شوہر نامدار کو نہ تو کسی نے اغوا کی ہے۔ نہ ابھی تک کوئی نقصان
پہنچایا ہے۔ وہ میری کسٹڈی میں ہے۔ اسی سلسلے میں آپکی مدد کو یہاں آیا ہوں۔ اب اگر آپکو میری بات قابل
قبول لگے تو کیا اندر بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔“

”کیا تم اُن لوگوں کے ساتھی ہو جنکی طرف سے ہر روز فون کالز موصول ہوتی ہیں۔“

”آپکو جن لوگوں کی جانب سے فون کالز موصول ہوتی ہیں۔ میں اُنکی جانب اشارہ دے چکا ہوں۔ اسی
سلسلے میں آپ سے ایک درخواست کرنے آیا ہوں۔ آپ اپنے بچوں کو لیکر کچھ دنوں کے لیے منظر سے غائب ہو

جائیں۔ آپکے گھر پر پولیس والوں کی جانب سے پوری سکیورٹی ہونی چاہیے تھی۔ بد قسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ اور یہ بہت خطرناک بات ہے۔ مخالف پارٹی کے تعلقات کافی گہرے معلوم ہو رہے ہیں۔ آپ پلیز یہاں سے کہیں اور چلی جائیں۔ اگر چاہیں تو میں آپکی مدد کر سکتا ہوں۔“

”یعنی حد ہوتی ہے۔ کوئی بھی منہ اٹھا کر میرے دروازے پر آ کر حکم دیگا۔ میں کیوں تم لوگوں کی باتوں میں آ کر اپنا گھر چھوڑ دوں۔ بجائے میرے شوہر کو ڈھونڈنے کے تم لوگ ہمیں بھی منظر سے ہٹانا چاہتے ہو۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتا۔ ایک ایماندار شریف پولیس آفیسر اتنے دنوں سے لاپتا ہے۔ یہاں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ نہیں جاتی میں کہیں بھی کرلو تم لوگ جو بھی کرنا ہے میں سپریم کورٹ میں۔۔۔“

ابھی اُس عورت کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب انجانی سمت سے ہوا کے دوش پر سفر کرتی سرسراتی ہوئی گولی اُسکوز مین بوس کر گئی۔

گیٹ پر اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔

اُس کے سامنے ایک عورت خون میں لت پت گری ہوئی تھی۔ گھر کے اندر سے اندوناک چٹخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور دوسری جانب گیٹ پر مسلسل ہونے والی فائرنگ جہاں بھینا چوکیدار نے ابھی تک محاذ سنبھالا ہوا تھا۔ اگلا قدم اٹھانے سے پہلے چند سیکنڈ لگے یہ سوچنے میں کہ اب کرنا کیا ہے۔

گیٹ کی جانب نظر ڈال کر یہ اندازہ کر لینے کے بعد کہ جس گاڑی سے فائرنگ ہو رہی تھی اُسکا رخ کس جانب ہے۔ اُس نے اُسی جانب دوڑ لگا دی۔ مسایوں کی آٹھ فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اُسی سپیڈ کے ساتھ بھاگتے ہوئے وہ اُسے سے اگلے گھر کی دیوار پھلانگتے ہوئے اُنکا مین گیٹ اندر سے کھول کر باہر گلی میں نکلا اور اپنی جانب تیزی سے بڑھنے والی گاڑی کو گالک کے نشانے پر رکھ کر پہلے گاڑی کے اگلے دونوں ٹائر اُڑائے۔ جس سے گاڑی لڑکھڑاہٹ کا شکار ہو کر دوسری طرف کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ پیچھے کھلے ڈالے میں دو اسلحہ بردار موجود تھے۔ باری باری دونوں کو نشانے پر رکھ کر نارگٹ کیا۔ ایک ایک گولی پر ہی لٹھک گئے۔ خود وہ مہرتی سے اپنی جگہ بدل کر دوسری سمت گیا۔ پھر وہاں سے سیدھا ڈرائیور کو اُڑایا۔

گاڑی میں موجود تینوں لوگ گر چکے تھے۔

گالک کو مضبوطی سے تان کر رکھتے ہوئے ہی وہ گاڑی کے قریب آیا۔ جس کے انجن میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی۔

اندر سے گاڑی کا تفصیلی معائنہ لینے کا وقت نہیں تھا۔ ایک دفعہ فائرنگ رُکی تو لوگ گھروں سے نکل کر دیکھنے لگے تھے۔ یقیناً کسی نہ کسی نے پولیس سے بھی رابطہ کیا ہوگا۔

اُس کو کم سے کم وقت میں بہت ضروری اقدام کرنے تھے۔

بھاگتا ہوا واپس ایس ایچ او کے گھر آیا۔ جہاں اب گہرام مچ چکا تھا۔ نوکر اور کچھ رشتہ دار خواتین باقاعدہ بین کر کے رو رہی تھیں۔

چوکیدار مئی طرح زخمی تھا۔

”تم اگر چل سکتے ہو۔ تو یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ لوگ واپس آئیے۔“

”مگر گھر کے اندر لوگ موجود ہیں۔“

”میں اُنکا کچھ کرتا ہوں۔ تم نکلو۔۔۔ جیسے تیسے شرک تک پہنچ کر بھیڑ کا حصہ بن جاؤ۔ اور اگلا کچھ عرصہ اس طرف کا رخ نہ کرنا۔“

”تیز تیز بولتے ہوئے وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

پہلے تو اونچی آواز میں مخاطب کیا مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ ہاتھ اُستہ کونے کی جانب قانز کر دیا۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔

”میں نے ان مرحوم خاتون کو بھی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اُنکو بھی بولنے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔

اب اگر تم لوگوں نے بھی مرنا ہے۔ تو اپنا کام چالور کھوور نہ دو چار منٹ کے اندر اندر یہاں سے نکل جاؤ۔ باہر

قاتلوں کے تین بندے مرے ہیں۔ اُن کے وارثوں نے اب یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجانے آنا ہے۔ زیادہ

سے زیادہ دس منٹ ہیں۔ بھاگ جاؤ واپس مُڑ کر نہ دیکھنا۔ پولیس کو فون نہ کرنا۔ کیونکہ وہ لوگ ملے ہوئے ہیں۔“

عورتوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

وہ وہاں موجود واحد لڑکے کے پاس آیا۔

جو پوری طرح شک میں تھا۔ پھٹی ہوئی نظروں سے اپنی ماں کی لاش کو دیکھے جا رہا تھا۔
”تمہارا نام کیا ہے؟۔۔۔“

اُسکے ایک دفعہ پوچھنے پر کوئی جواب نہ آیا۔ لڑکا آنکھیں تک نہیں جھپک رہا تھا۔

اُس نے لڑکے کو کالر سے پکڑ کر بُری طرح جھنجھوڑا۔۔۔ اور رکھ کر ایک تھپڑ اُسکے گال پر مارا۔۔۔ فرش پر بیٹھی ایک لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور بھوکی شیرنی کی طرح اُس پر جھپٹ پڑی۔

”کتنے کمینے پہلے میری ماں کو مار دیا اب میرے بھائی کو مار رہے ہو۔“

اس نئی افتاد پر وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔ گالک کی نالی لڑکی کی پیشانی پر رکھی۔ اور غصے کو پیتے ہوئے۔ بند دانتوں کے درمیان سے بولا۔

”مجھے لگتا ہے۔ آج تم سب نے مرنے کا ارادہ کر لیا ہوا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اپنے گرد نظر ڈالو ساری عورتیں جاچکی ہیں۔ اپنی اور اپنے بھائی کی زندگی چاہیے تو میرے ساتھ تعاون کرو۔ ورنہ میں بھی جا رہا ہوں۔“

لڑکی نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے ماں کی لاش کو دیکھا۔ اب وہاں صرف وہی تین افراد بچے تھے۔ نوکرانیاں اور رشتے دار سب جاچکی تھیں۔

”میرے بھائی کو بچالو۔۔۔“

وہ تڑپتے ہوئے بولی تھی۔

”میں تم دونوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے میرے سوالوں کے جواب دو۔ کیا گھر پر کوئی گن ہے۔۔۔۔۔ چھوٹا موٹا کسی قسم کا بھی کوئی اسلحہ ہے؟۔“

”ہاں ہے میرے ابو کی کلا شکوف پڑی ہوئی ہے۔“

”جلدی سے لیکر آؤ۔ اور جو گاڑی باہر کھڑی ہے۔ اُسکی چابی کدھر ہے؟۔۔۔“

”چابی وہاں شینڈ پر موجود ہے۔ اور گن اندر الماری کے اوپر پڑی ہوئی ہے۔“

وہ اُسکی بتائی سمت میں جا کر چابی اٹھالایا اتنی دیر میں وہ اندر سے کلا شکوف لے آئی۔ ساتھ گولیوں کا ڈبہ بھی

تھا۔ ”یہ یہ لیں۔۔۔“

اُس نے کلاشکوف کاندھے پر ڈالی گولیاں ہاتھ میں پکڑیں۔ اور اُن دونوں کو ساتھ آنے کا بول کر گیراج کی جانب چل پڑا۔

”میں اپنی امی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”کیا امی کے پاس جانا چاہتے ہو؟ اگر جواب ہاں میں ہے۔ تو شوق سے ادھر رُک کر اپنے ماموؤں کا انتظار کرو۔ اور اگر مزید چار دن اور زندہ رہ کر اپنے باپ سے ملنا چاہتے ہو تو چپ چاپ میرے ساتھ آ جاؤ۔ اپنی ماں کی فکر نہ کرو۔ میرے بندے انکا جسدِ خاکی تمہارے نانائانی کے گھر پہنچا دیں گے۔“

گاڑی پہلے سلف پر ہی اشارت ہو گئی۔ لڑکی خود بھی رو رہی تھی۔ اور اُس سے تین سال چھوٹا چودہ سالہ بھائی بھی رو رہا تھا۔ مگر اُس نے مضبوطی سے اُسکا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ دونوں کے بیٹھتے ہی اُس نے ہینڈ بریک ہٹاتے ہوئے گاڑی کو گیٹ سے نکال کر انجانی منزل کو ڈال دیا۔

گلی کے اینڈ پر جیسے ہی اُس نے موڑ کاٹا۔ سامنا ایک گھلی دین سے ہوا۔ جس میں چار پانچ آدمی ڈنڈے اور بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

نظر سامنے فوکس رکھتے ہوئے اُس نے دھیمی آواز میں مسافروں کو اپنی گردنیں نیچی رکھنے کا حکم دیا۔ سامنے والی پارٹی کا سارا فوکس شائد جائے وقوعہ پر پہنچنے پر ہی تھا۔ اس نے گاڑی سائیڈ پر کر کے راستہ بنایا اور وہ لوگ اُنکے قریب سے گزر کر نکل گئے۔ بیک ویو مرر سے جاتی ہوئی گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے اُس نے اپنی گاڑی آگے بڑھائی۔ سڑک پہ نکل رہا تھا۔ جب ایک اور گاڑی قریب سے گزری۔ مگر اس دوفعہ دوسری گاڑی کی فرنٹ بینجر سیٹ پر موجود وسم سرفراز احمد کی گاڑی کو پہچان گیا تھا۔ کچھ اندر موجود مسافروں کے چہرے سے بھی واقف تھا۔ پر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود آدمی اُسکے لیے بالکل انجان تھا۔

جب تک وسم کا ڈرائیور موڑ کاٹ کر اُنکے پیچھے آتا۔ وہ گاڑی کو بڑی سپیڈ کے ساتھ سڑک سے اتار کر ایک گلی میں ڈال چکا تھا۔ وہاں بھی زیادہ آگے جانے کی بجائے سب سے پہلے آنے والی گلی میں ڈال دیا۔ اُس کے اینڈ پر واپس سڑک پر نکل کر تھوڑا آگے جا کر سڑک کے دوسری جانب ٹکلتے ایک بازار میں داخل ہو کر گاڑی ایک

سائیڈ پر روک دی۔ برابر کی سیٹ پر سے کلاشکوف اٹھا کر اس کا میگزین فل کیا۔

پیچھے کو گردن موڑی اور سبھی روحوں کو گاڑی میں ہی موجود رہنے کی سخت تاکید انتہائی نرم لہجے میں کرتا ہوا۔
گاڑی کا انجن چلتا چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

کلاشکوف کو اس طریقے سے پکڑا ہوا تھا۔ جس سے گزرنے والے لوگوں کی نظر میں کم سے کم آیا جائے۔ تیز
تیز ڈگ بھرتا سڑک پر آیا۔ لائن میں بنی دکانوں کے سامنے بنے پلرز میں سے ایک کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔
جیسے ہی پیچھا کرنے والی گاڑی اسکی ریخ میں آئی۔ بڑے محل کے ساتھ نشانہ باندھ کر ایک کے بعد ایک گولی کو
آزاد کرتا گیا۔

گاڑی پوری سپیڈ کے ساتھ آرہی تھی۔ اگلا ایک ٹائر ضائع ہوتے ہی بُری طرح ہوا میں اُچھل کر دو چار دفعہ
کلا بازیاں کھانے کے بعد اُلٹی ہو کر سڑک کے درمیان گری۔
اور گرد کے ہجوم میں افراتفری پھیل گئی۔ لوگ خوف کے مارے کچھ تو جہاں تھے وہیں جم گئے۔ کچھ نے
دکانوں میں پناہ ڈھونڈی۔

مگر وہ اس سب سے بے نیاز ہو کر اوٹ سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب آیا۔
اندر بیٹھ کر کلاشکوف برابر کی سیٹ پر پھینکی۔ اور گاڑی آگے بڑھادی۔
اس دفعہ کوئی بھی پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ کہیں رُکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ علاقہ بہت
پیچھے رہ گیا۔

اُس نے ایک شاپنگ پلازہ کے پارکنگ ایریا میں گاڑی روکی۔
اپنی سیٹ پر پہلو بدل کر پیچھے دیکھا۔
”تم دونوں ٹھیک ہو؟۔۔۔“
لڑکی بھری ہوئی بولی۔

”ہماری ماں کو آنکھوں کیسا منے گولی ماری گئی ہے۔ باپ کا کہیں کوئی پتا نہیں ہے۔ ہمیں جان سے مارنے
کے لیے لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ اور ہاں ہم بالکل ٹھیک ہیں۔“

”بد قسمتی سے تمہاری ناراضگی بجا پر میرے پاس کوئی متبادل نہیں ہے۔ یہ لوگ ایک وقت میں تمہارے والد کے خاص تعلق دار رہے ہیں۔ اور نہ لوگوں کے ساتھ دوستی اگر بُری ہے۔ تو دشمنی اُس سے بھی بُری ہے۔ یہ اب اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک تم سب کو مار نہ لیں۔ اسلیے اگر تم دونوں چاہتے ہو کہ میں تمہاری مدد کروں۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔“

”مگر یہ ہمیں مارنا کیوں چاہتے ہیں۔ ہم تو انکو جانتے تک نہیں ہیں۔“

”تمہارے والد تک رسائی کے لیے تمہیں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟۔۔۔“

پوچھا اُس نے لڑکے سے تھا۔ مگر جواب اس دفعہ بھی لڑکی نے دیا۔

”یہ ارسلان ہے۔ اور میرا نام مریم ہے۔“

”مریم تم اپنا سکارف اچھی طرح لپیٹ لو۔ دونوں اپنی نگاہیں نیچی رکھنا اور خاموشی سے میرے پیچھے چلتے

آؤ۔“

اُس نے کلاشکوف کو سیٹ کے نیچے بٹھپایا۔ اور گاڑی سے نکل گیا۔

ارسلان اور مریم نے بھی اُسکی تقلید کی۔

پلازے سے نکل کر وہ اُنکو لیکر نہ جانے کن گلیوں اور بازاروں سے گھنٹا پھیرا کر ایک تنگ گندی سی گلی میں

لے آیا۔ ایک دروازے پہ دستک دی۔

دو منٹ بعد دروازہ کھلا منیر نے حیرت سے اپنے باس کو دیکھا۔

”سر آپ اس وقت۔۔۔؟۔“

”اندر آنے دو گے یا ادھر ہی گرمی میں مارو گے۔“

”اوہ آئیے پلیز۔۔۔“

اندھیرے میں منیر کی نظر میں ارسلان اور مریم نہیں آئے۔ مگر جب وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ منیر

کی آنکھوں میں کئی سوال جا گئے۔

جنہیں وقتی طور پر پس پشت ڈال کر اپنے پیچھے دروازہ مضبوطی سے بند کرتا مہمانوں کے پیچھے اندر آ گیا۔
 مریم اور ارسلان کمرے میں قدم رکھتے ہی حیرت کا شکار ہوئے۔ کیونکہ باہر سے عمارت کی جو حالت تھی۔
 اور خاص کر جس گلی اور محلے میں وہ لوگ موجود تھے۔ وہاں کوئی ایسی لگژری والی زندگی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
 اندر کا سارا اثیر زرا انتہائی ہائی کلاس کی طرز پر کیا گیا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا۔ کمرے کے باہر اور اندر دو بالکل
 الگ جہان آباد ہیں۔

باہر سے معلوم ہوتا اونچے اونچے گھروں کے درمیان ایک چھوٹا سا گھر موجود ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جو
 اوپر آنے کی بجائے زمین میں دھنسا جا رہا ہے۔ کھڑکیوں کے فریم سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ محل چار کمرے
 ہیں۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اندر سارا مکان اوپن ایئر یا تھا۔

جہاں کچن، بیڈروم، 'ہم' لاونج، لائبریری ہر سہولت موجود تھی۔ پچاس انچ کی ایل سی ڈی سکرین پر سرینا وٹلم
 ٹینس کھیلتی نظر آ رہی تھی۔

منیر نے ایک دفعہ پھر دروازہ بند کیا۔

”آپ لوگ کچھ کھائیں نہیں گے؟۔۔۔“

اُسکے پاس نے ریمورٹ اٹھا کر لوکل نیوز چینل لگاتے ہوئے۔ مریم اور ارسلان کو مخاطب کیا۔

”بچو ادھر کچن میں کھانے کی ہر چیز موجود ہوگی۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ وہ پیچھے کی جانب واش
 روم ہے۔ ادھر بیڈ روم کی الماری میں کپڑے بھی موجود ہونگے۔ اپنا ہی گھر سمجھو سکون ہو کر بیٹھو اب کوئی
 خطرے والی بات نہیں ہے۔“

مریم کی ٹانگیں بُری طرح ڈکھ رہی تھیں۔ وہ تو بغیر کچھ کہے منہ دھونے کو واش روم چلی گئی۔ ارسلان فریج کی
 طرف بڑھ گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں آئیس کریم کا باکس، پلیٹ میں رکھے تین سینڈوچ اور کولا کی ڈیڑھ لیٹر کی
 بوتل۔ سب چیزیں گود میں لیکر صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

منیر نے باس کو دیکھا۔ اور دھیرے سے بولا۔

”کون ہے یہ بھوکا گیدڑ۔۔۔“

”خبریں نہیں دیکھی ہیں؟“

”نہیں ابھی تو آفس سے آیا ہوں۔ آپ عائب کدھر تھے۔ فون تک نہیں اٹھایا۔“

”میرا فون بند تھا۔ میں ایس ایچ او کے گھر گیا تھا۔“

اب کے منیر چونکا۔ ”تو آپ اُس سارے ڈرامے سے واقف ہیں۔ میں آپکو بتانے کی خاطر نہ جانے کتنی دیر فون پہ کھتا رہا ہوں۔“

”یہ ایس ایچ او کے بچے ہیں۔ اُسکے بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”اوہ یہ تو بُرا ہوا۔ کہیں مال روڈ پہ ہونی والی فائرنگ میں آپ تو ملوث نہیں؟“

سکرین کے اوپر نیوز چینل کی جانب سے دیکھائی جانے والی سی سی ٹی وی فوٹیج میں فائرنگ کرنے والے کا چہرہ بالکل بھی واضح نہیں تھا۔ مگر بتایا یہ چار ہا تھا۔ کہ کسی بھی ذمہ دار ادارے کے وقوع پر پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی میں سوار لوگ زخمی ہونے کے باوجود وہاں سے جا چکے تھے۔ نیوز چینل کے مطابق گاڑی میں کُل چار افراد سوار تھے۔ جن میں سے تین شدید زخمی ہوئے تھے۔ جبکہ ڈرائیور موقع پہ ہلاک ہو گیا ہے۔

فائرنگ کرنے والے کے سُر اُغ میں قانونی ادارے حرکت میں آچکے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا ہے۔ وہ جلد از جلد قاتل کو گرفتار دیکھنا چاہتے ہیں۔ جسکے لیے ایک خاص ٹیم تشکیل کر دی گئی ہے۔ اس واقعے کو دہشت گردی کا نام دیا جا رہا ہے۔“

اُس نے ایک کے بعد ایک چینل بدلا۔ مگر کہیں بھی ایس ایچ او کے گھر پر ہونے والی فائرنگ کا ذکر نہیں آ رہا تھا۔ ”میں چلتا ہوں۔ تم ان دونوں کا خیال رکھنا۔“

منیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو وہ واش روم سے آتی مریم کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”تم دونوں جب تک ادھر موجود رہو گے۔ بالکل محفوظ ہو۔ کسی سے بھی رابطہ مت کرنا۔ کسی رشتے دار دوست کو فون نہیں کرنا۔ اس جگہ پرائیویٹ منٹ کا سب سامان موجود ہے۔ گیمز کھیلو فلمیں دیکھو کھاؤ پیو۔ مگر باہر نہیں جانا۔ میری بات کی سمجھ آگئی۔“

”مجھے تو کسی بھی چیز کی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ میری امی ابھی تک وہاں بے یار و مددگار پڑی ہوگئی۔ اور ہم

یہاں بیٹھ کر قلمیں دیکھیں۔“

مریم نے بھرائی ہوئی آواز کہتے ہوئے اُسکو شکوہ بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

وہ کوئی اتنی عمر کی نہیں لگتی تھی۔ مگر اب تک کی گئی ہر بات سے وہ یہ بات ثابت کر چکی تھی۔ کہ وہ ایک انتہائی سمجھدار لڑکی تھی۔

وہ چلتا ہوا اُسکے پاس آیا۔ شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا۔

”تم رونا چاہتی ہو۔ تو جی بھر کر رولو۔ تم اس وقت جس مصیبت سے گزر رہی ہو۔ اور جس بُہادری سے تم نے میرا ساتھ دیا ہے۔ میں اس سب کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ کسی بھی انسان کا زندگی اور موت پر اختیار نہیں ہے۔ تمہاری امی کا وقت آ گیا تھا۔ اگر یہ سب نہ بھی ہوتا تو عزرائیل نے تب بھی رستہ نہیں بھولنا تھا۔ نہ ہی اُس سے وقت کی بھول چوک ہوتی تھی۔“

”تم ایک مضبوط لڑکی ہو۔ ہمت اور جواں مردی سے کام لو۔ آج کل میرے سامنے بہت سے ایسے بچوں کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ جنگی زندگیاں پل بھر میں اندھیروں کا شکار ہو گئی ہیں۔ اگر تم یہ سمجھ رہی ہو۔ تم پہ آنے والی مصیبت سب سے بڑی ہے۔ تو تم اپنی جگہ ٹھیک ہی ہو۔ پر یقین مانو کئی معصوموں کی نظر میں ابھی بھی تم ایک خوش قسمت لڑکی ہو۔“

”اپنے بھائی کا خیال رکھنا۔ اور منیر کو بالکل تنگ نہیں کرنا۔ میں تمہارے گھر جانے کی کوشش کر دوں گا۔ تاکہ تمہاری امی کے بارے میں جان سکوں۔ آیا کوئی رشتے در اوہاں آیا یا نہیں۔“

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں۔ آپ کون ہو؟“

وہ اُس کے تم سے آپ بولنے پر مسکرا دیا۔

”میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔“

”یہ تو میں جان چکی ہوں۔ مجھے اب یہ جاننا ہے۔ کہ آپ ہو کون آپکا نام کیا ہے؟ ہمارے گھر کیا لینے آئے۔“

”یہ ساری باتیں اہم نہیں ہیں۔“

”میرے لیے تو ہیں۔ میں جانا چاہتی ہوں۔ آپ کون ہیں؟“

”میں ایک ایجنٹ ہوں۔ بس؟“

”کیسے ایجنٹ؟ ریکل اسٹیٹ ایجنٹ؟“

”ہاں اگر ریکل اسٹیٹ ایجنٹ بندے مار سکتے ہیں۔ تو وہی سمجھ لو۔“

”تو کیا آپ سیکرٹ ایجنٹ ہیں؟“

”ہاں۔۔۔“

”نام کیا ہے؟“

”ہمیں نام بتانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔“

”تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو کیسے مخاطب کرتے ہیں۔“

”میرے ماتحت کام کرنے والے مجھے ہاس کہتے ہیں۔“

”اور آپ کے افسر آپکو کیا کہتے ہیں۔“

”ایجنٹ منگو۔۔۔“

منیر نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی مخپائی۔

”یہ کیسا نام ہوا؟ منگو۔۔۔ یہ تو کوئی نام ہی نہیں ہے۔“

ارسلان نے پہلی دفعہ زبان کھولی تھی۔

منگو مسکراتا ہوا اُن لوگوں کو دروازہ بند کر لینے کا حکم دیکر وہاں سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

نوازش علی اپنی حویلی سے نکل کر نہر کی جانب جاتے ہوئے دور سے گولی کی طرح آتے گھوڑے کو بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ گھڑسوار اپنے سارے وجود کو اکٹھا کر کے دونوں گھنٹوں کو گھوڑے کے جسم کے ساتھ جوڑ کر آگے کو جھکا ہوا تھا۔

نوازش علی ابھی نہر سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھے۔ جب گھوڑا اُنکے آگے سے سپورٹس کار جیسی سپیڈ

کے ساتھ گزر گیا۔ گھوڑے کے اوپر کوئی اور نہیں اُٹکا اپنا تخت جگر بیٹھا ہوا تھا۔ دو تین منٹ میں ہی وہ اُنکی نظر سے دور ہوتا ہوتا بہت آگے نکل گیا تھا۔

وہ وہیں نہر کے کنارے کھڑے ہو کر ہلکی پھلکی ورزش کرنے لگے۔ یہ سڑک سیدھی آگے کے کم آبادی والے قصبوں کو جاتی تھی۔ مگر سڑک اپنی چوڑائی کے لحاظ سے ایک پگڈنڈی زیادہ محسوس ہوتی۔ یہاں زیادہ تر اُن لوگوں کی آمد و رفت ہوتی جو یا تو نہر کی سیر کو نکلتے یا وہ جنہوں نے اپنے کھیتوں کو پانی وغیرہ لگانا ہوتا تھا۔

نہر کی گہرائی بھی کم ہی تھی۔ گاؤں کے بچے گرمی سے نہتے کے لیے سارا دن وہیں ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگاتے پائے جاتے۔ ساتھ ساتھ اپنی بھینسوں کو بھی اوپن ہاتھ کرواتے۔ بھینسوں کی چکوزی ہی سمجھ لیں۔

نوازش علی نے ایک دفعہ پھر اُس سمت دیکھا جہاں سے اب فریود آہستہ سپیڈ سے آرہا تھا۔ قریب آ کر اعلیٰ نسل کے قد آور گھوڑے کی پٹھت سے اتر گیا۔ گھوڑے کے جسم پر پسینے کہ لائینیں کھینچی ہوئی تھیں۔ اُسکی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا۔ اپنے سوار کی طرح اُس نے بھی اس مشق کو جی بھر کر پسند کیا ہے۔

”اسلام علیکم ابو۔۔۔“

”وعلیکم اسلام۔۔۔ ہوگئی گھوڑسواری؟“

”جی آج بہت دنوں بعد دل کیا تھا۔ تو سوچا کیوں نہ لطف اُٹھایا جائے۔“

”ہاں بھی متوقع سُسرال جا رہے ہو۔ بندہ خوشی سے ایسے ہی کام کرتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں۔ سواری

کرتے وقت کی ویڈیو بنوا لیتے۔ جتنی سپیڈ سے تم جاتے ہو۔ لڑکی نے دیکھتے ہی ایمپریس ہو جانا تھا۔“

”مجھ سے ایمپریس ہوگی یا گھوڑے سے؟“

نوازش علی نے باری باری شہنشاہ اور فریود پر نظر ڈالی۔۔۔

اُن کے کچھ بولنے سے پہلے ہی فریود تھقہ مارتے ہوئے بولا۔

”اب یہ نہ کہہ دیجئے گا دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

نوازش علی بھی کھل کر مسکرائے۔

”باپ بیٹے کی سوچ اگر ملتی ہو۔ تو یہ بڑا فائدہ ہے۔ میری بات ابھی منہ میں ہوتی ہے۔ اور تم سمجھ جاتے ہو۔“

ایسا عموماً میاں بیوی کے ساتھ ہوتا ہے۔“

”نہیں ابو یہ ہر اُس رشتے میں ہو سکتا ہے۔ جہاں ایک دوسرے سے محبت ہو۔“

”چلو بھئی مان لیا۔ مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔“

”سر جی حکم کریں۔“

”یار آج لاہور سے ہو آئیں۔ کل ذرا ایک پارٹی کی طرف چکر لگا آنا۔ ہم نے چار سو من چاول دیا ہوا ہے۔“

مگر وہ پیسے دینے کو تیار نہیں ہے۔“

”کیا یہ پارٹی آپ کا سا ہیوال والا دوست تو نہیں ہے۔“

فریود گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شرارتی نظروں سے والد صاحب کو بھی دیکھ رہا تھا۔

جو آنکھیں گھٹماتے ہوئے مسکرا کر گھر کی جانب چل پڑے۔ فریود نے بھی اُنکا ساتھ دیا۔ شہنشاہ کی لگام

ابھی بھی اُسکے ہاتھ میں تھی۔

”یار اب دوست آکر سوال کرتا ہے۔ تو اُسکو انکار تو نہیں کیا جاسکتا ہے۔“

”ہاں جی آپ تو بالکل بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ کتنی دفعہ وہ آدمی آپکو باتوں میں لگا کر کوئی نہ کوئی کام نکلوا جاتا

ہے۔“

”ہاں میں کوئی بچہ ہوں ناں جس کو وہ باتوں میں لگاتا ہے۔ میں اپنی مرضی سے اُسکی باتوں میں آتا ہوں۔“

کیونکہ وہ میری بڑی عزت کرتا ہے۔ ویسے بھی یار کوئی سوال مارنے کو وہاں ہی آتا ہے۔ جہاں اُسکو کوئی مان یا

امید ہو۔ مجھے جواب میں کسی کی عزت نفس کو مجروح کرنا اچھا نہیں لگتا ہے۔“

”آپ دل کے امیر آدمی ہیں۔“

”ہاں اور تم جیب کے امیر ہو۔“

دونوں باپ بیٹا ہنس دیئے۔

”اب تمہاری ماں نے جانے کی جلدی مچا دی ہے۔ کل اسکے نئے رشتے داروں کی وجہ سے ہمارا وقت برباد

ہوا۔ اُسکا ہم شکوہ بھی نہیں کر سکتے۔ بڑی سخت ہے یار۔۔۔“

نوازش علی کا اشارہ لاہور والے رشتے کی جانب تھا۔ کیونکہ نے کل انہوں نے فون کر کے معذرت کر لی تھی۔ اُن لوگوں کو کوئی ایمر جنسی آپڑی تھی۔ جسکی وجہ سے انہوں نے ایک دن آگے کر دیا۔ وہ پوچھ حویلی کے قریب آچکے تھے۔ فریود نے گھوڑا کا مے کے حوالے کیا خود نوازش علی کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”جناب حکومت جتنی سخت ہوگی عوام اتنی ہی سیدھی رہے گی۔“

”ہمارے کیس میں تو حکومت جتنی سخت ہے۔ عوام اتنی ہی ڈیپلومیٹ ہے۔“

”یہ آپ اپنی بات کر رہے ہیں۔ یا میری؟۔۔۔“

”کیا میں تمہیں حکومت کا حصہ نہیں لگتا ہوں؟۔“

”جی جی کیوں نہیں۔ ہیڈ آف دی سٹیٹ تو آپ ہی ہیں۔“

”ہیڈ آف دی سٹیٹ میں نہیں بیٹا میری ماں ہیں۔ اور تیری ماں ہیڈ آف دی منسٹری ہے۔ تم ڈیپلومیٹ عوام اور میں بیچاری اپوزیشن۔۔۔۔“

فریود کا تہقہ بے اختیار تھا۔ باتوں کے دوران باپ بیٹا گھر پہنچ گئے تھے۔

اُگود دیکھتے ہی شیم نے ملازمہ سے کہہ کر کھانا لگوا دیا۔

”کیا اماں وڈی نے ناشتہ کر لیا ہے؟۔“

”کب کا وہ تو صبح اُٹھتے ساتھ ہی گا جراور سب کا مرلح کھاتی ہیں۔ آپ دونوں جلدی سے منہ ہاتھ دھو

آئیں۔ اتنا دن چڑھا آیا ہے۔ اور جانا بھی اتنی دور ہے۔“

نوازش علی نے تو ہاتھ باہر تل سے دھوئے۔ اور اخبار تمام کر دستر خواں پر بیٹھ گئے۔ جبکہ فریود اوپر اپنے کمرے سے نہادھو کر لباس بدلنے کے بعد برآمد ہوا۔

ناشتے کے دوران شیم نے ہمت کر کے اپنے دل کی بات شوہر کے آگے کہہ ہی دی۔

”میں چاہ رہی تھی۔ آپ اماں سے بات کریں۔ آج وہ اُس لڑکی کو اپنے ساتھ لاہور لیکر نہیں جائیگی۔“

نوازش علی نے ہاتھ روک کر بیوی پر ایک نظر ڈالی۔

”تم جب جانتی ہو۔ اماں یہ بات کبھی تسلیم نہیں کریں گی۔ تو کیوں خواہ مخواہ بات کر کے اُنکو ناراض کرنا ہے۔“

”اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے۔ میرا ایک ہی ایک بیٹا ہے۔ اُسکے اتنے شگفتوں کے وقت اُس منحوس لڑکی کا سایہ بھی اُسکے قریب برداشت نہ کروں۔ کجا کے وہ ہمارے ساتھ جائے۔“

”تمہارا بیٹا اس گھر میں بھی اُسکے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اُس بچی نے اسکو کیا نقصان پہنچا دیا ہے۔ جو تم ایسی دقیقہ نویس باتیں لیکر بیٹھ جاتی ہو۔ اماں وڈی کے سامنے تم نے ذکر کیا تاں تو اُنہوں نے یہی سمجھتا ہے۔ تم اُن کو ساتھ لیجانا نہیں چاہتی ہو۔ اور اگر میری ماں نہ گئیں تو میں بھی گھر پہ ہی رہوں گا۔ پھر تم دونوں ماں بیٹا اکیلے ہی لڑکی دیکھ آنا۔“

”نوازش صاحب مجال ہے جو آپ نے کبھی اپنی ماں کے مقابلے میں بیوی کا ساتھ دیا ہو۔ جو پرسوں شام باہر صحن میں سب گھر والوں کی موجودگی کے دوران ہوا۔ وہ شاید آپکی نظر سے نہیں گزرا۔ وہ لڑکی گھر بھر کے سامنے اُسکے ساتھ نین منکا کرنے کی کوشش میں تھی۔ اکیلے میں نہ جانے کیا کرے۔“

فریود کو اچھو لگ گیا۔

”امی آپکی بھتیجی آپ سے بھی زیادہ مغرور ہے۔ وہ تو میری جانب دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ پرسوں میں غلطی سے اُسکو حرا باجی سمجھ کر اُسکے برابر بیٹھ گیا تھا۔ اور پلیز اگر آپکو اپنی بھتیجی پر اعتبار نہیں ہے۔ تو کم از کم میرا ہی اعتبار کر لیں۔ جب آپ ایسی باتیں کرتی ہیں۔ مجھے اپنی بے عزتی سی محسوس ہوتی ہے۔ اتنا دل پھینک قسم کا مرد تو نہیں ہوں۔ جتنا آپ نے مجھے سمجھ لیا ہوا ہے۔“

”تمہارا ماضی کا ریکارڈ اگر بھول گئے ہو تو یاد کروادوں؟“

”اگر آپ نے یہ سب اسی طرح جاری رکھنا ہے۔ تو میں کسی ملک کا ویزا اِپلائے کرتا ہوں۔ یا پھر مستقل کسی دوسرے شہر ہائش اختیار کر لیتا ہوں۔“

نوازش نے شکوہ کناں نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ فریود کھانا ختم کر کے ہاتھ دھونے چلا گیا تھا۔

”وہ تمہاری عزت کرتا ہے۔ اور آج کے دور میں یہ بڑی بات ہے۔ اگر اولاد ماں باپ کی عزت کرنے والی

ہو۔ ورنہ جو جو کچھ ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے۔ تمہیں بتاؤ تو تمہیں افسوس ہوگا۔ اسیلے میں یہی کہوں گا۔ اس طرح شک کر کے اپنے بیٹے کو باغی نہ کرو۔ کہیں یہ نہ ہو۔ تافہ تافہ کر کے تم تافہ کو اسکی توجہ کا محور بنا دو۔“
نوازش علی دھیمی آواز میں بیوی کو سمجھا رہے تھے۔

باہر سنک پہ ہاتھ دھوتے ہوئے فریود علی سامنے لگے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کی آنکھوں میں گہرائی تک دیکھتے ہوئے بڑی دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔ جیسے خود اپنے آپ پر ہی پیارا رہا ہو۔
نچلا ہونٹ دانتوں میں نرمی سے چباتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جب تافہ کی آواز پر گردن موڑ کر دیکھا۔

”رضیہ چچی آپکا دوپٹہ سوکھ گیا ہے۔ اگر آپ کہیں تو دھوپ میں سے ہٹا دوں۔“
وہ چھت سے نیچے جھانکتے ہوئے رضیہ چچی سے مخاطب تھی۔ جو وہیں پر برآمدے میں وڈی اماں کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے وہیں سے سر ہلا کر جواب دے دیا۔
فریود کے چہرے سے مسکراہٹ مکمل طور پر غائب ہو گئی۔

”ایسا کیا ہے اس لڑکی میں جو میری ماں اسکو مجھ سے دور رکھنا چاہتی ہیں۔ کیا یہ معصوم سی صورت اندر سے اتنی خطرناک ہے؟ کیا بظاہر اُداس اور بیزار نظر آنے والی آنکھوں کی گہرائی اتنی طاقت ور ہے کہ جو ایک دفعہ غور سے دیکھے ڈوب جائے؟“

اسکی سنجیدہ پُرسوج نظروں نے تافہ کو متوجہ کیا۔ دوپٹہ تار سے اتار کر پلٹ رہی تھی۔ جب خود پر فریود کی نظروں کو محسوس کر کے نیچے دیکھنے کی غلطی کر گئی۔ اتنی دور سے بھی نہ جانے فریود کی نظروں میں کیا تاثر تھا۔ وہ بغیر آنکھیں جھپکے یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ تافہ کو اپنی ریزہ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

ڈری ہوئی چڑیا کی طرح رضیہ چچی کے دوپٹے کو سینے سے لگا کر تیزی سے غمزدگی سے اُس کے اپنے سر پر پڑا کر پیپ لا دوپٹہ اتر گیا۔

فریود علی کو لگا تافہ کی کسر پر بال نہیں کوئی آبشار لہرائی تھی۔ ہلکی سی ڈارک براؤن شیڈ سورج کی کرنوں میں اور بھی چمک گئی۔ ایک جیسے لمبے گھنے اور بلا کے سلکی بال جنگلی سرسراہٹ اتنی دور کھڑے ہونے کے باوجود فریود علی

نے اپنے ہاتھوں میں محسوس کی۔ وہ وہاں سے ہٹ چکی تھی۔ مگر وہ ابھی بھی گردن اٹھائے اُسی سمت میں دیکھ رہا تھا۔ منٹ کے ہزارویں حصے میں اُسکے جی میں یہ خواہش ابھری تھی۔ اگر ابھی جا کر اس لڑکی کے بالوں پر اپنا چہرہ رکھوں تو کیسا محسوس ہوگا؟ اُن میں سے کیسی خوشبو آ رہی ہوگی؟“

اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سُن کر وہ مُردہ دیکھے بغیر دہلیز کی سیڑھیاں اُتر کر گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔
 ”امی اگر اسکو مجھ سے دور رکھنا چاہتی ہیں۔ تو وہ بالکل ٹھیک چاہتی ہیں۔ ایسے خُسن کے پاس رہ کر کوئی کیسے نہ بے ہکے گا؟۔۔۔ ایسے خُسن کو عام لوگوں کے درمیان رکھنا ہی نہیں چاہیے۔ کہیں آبادی سے بہت دور کسی اونچی پہاڑی کے قلعے میں بند کر دو۔ اور اُس پہاڑی کے گرد گھنا جنگل اُگا دو۔ جنگل کے بعد گہری خندق کھود دو۔ چوٹی کی اونچائی اتنی ہو کوئی ہیلی کاپٹر بھی وہاں نہ جاسکے۔ کسی کے ریڈار میں وہ جگہ نہ آئے۔“
 یونہی اپنی سوچوں میں غلطیاں بیرونی گیٹ عبور کر گیا۔

☆.....☆.....☆

اماں وڈی کے ہاتھ پر دو ار کھنے کے بعد اُس نے اُنہیں پانی کا گلاس پکڑایا۔
 ”تم تیار کیوں نہیں ہوئی ہو؟“

”کیوں مجھے کس بات کی تیاری کرنی تھی؟“

”اچھا اب تم نے میرے ساتھ یہ لاعلمی کا کھیل کھیلا ہے۔“

”میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ مجھے پھوپھی کی فیملی کے ساتھ کہیں نہیں جانا ہے۔“

”مگر تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔“

”آپ کا میرے بغیر گزارا ہو سکتا ہے۔ ساتھ میں آپکی بہو بیٹا اور پوتا ہونگے کیا وہ گاڑی میں سوار ہونے یا اُترنے میں آپکی مدد نہیں کریں گے۔“

”میں کیوں اُنکی مدد لوں۔ تمہیں کس بات کی تنخواہ دیتی ہوں۔“

”اگر ایسا ہے۔ تو میری تنخواہ سے پیسے کاٹ لیجئے گا۔“

”تم آخر اتنی ضدی کیوں ہو؟“

وہ چپ ہو کر اُن کو دیکھنے لگی۔ چہرے پہ غصہ جھنجھلاہٹ بیزاری صاف نظر آ رہی تھی۔ کل سے لائف لائن کی جانب سے مکمل خاموشی تھی۔ اور جب وہ خاموش ہوتا تھا۔ تاحفہ کو دنیا کی کسی چیز میں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی۔ اتنی بھری پڑی دنیا خالی لگتی۔ جیسے کوئی زی روح نہ بچا ہو۔ دل کی ایک عجیب سی کیفیت ہوتی۔

”پلیز مجھے ساتھ جانے کے لیے زیادہ مجبور نہ کریں۔“

”تمہاری پھوپھی بھی تو یہی چاہتی ہے۔ تم نہ جاؤ۔ اُسکی دلی خواہش پوری کر کے بڑا ثواب کماؤ گی۔“
ایک شکوہ بھری نظر اماں وڈی پہ ڈال کر پھر سے اپنی ہتھیلی کو مسنے لگی۔ اماں وڈی نے نوٹ کر کے ٹوکا۔
”یہ کیا تم جب بھی اُداس ہوتی ہو۔ بیچارے ہاتھوں کی شامت آ جاتی ہے۔ ہتھیلی کیسے سُرخ ہو رہی ہے۔“
اُس کے ہاتھ تھم گئے۔

”میں تو اُداس نہیں ہوں۔“

”ہاں نظر آ رہا ہے۔“

”آ تار ہے مجھے کیا۔“

”ابھی صبح تو تم اچھی بھلی تھیں۔ یہ اچانک سے کونسا سانپ سونگھ گیا ہے۔“
”یہ جا کر اپنے اُس پوتے سے پوچھیں۔ جنہوں نے آنکھوں کی جگہ ایک سرے فٹ کروائے ہوئے ہیں۔“
”ٹھکر کی کہیں کے۔“

”آئے ہائے میرا کوئی پوتا اتنا بے حیا نہیں ہے۔ جو گھر کی عورتوں پر آنکھیں سینکے۔“

”بڑی ہی خوش فہمی ہے۔“

”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”اُنہی کی جنکارشتہ دیکھنے جا رہی ہیں۔“

”فر بود کی؟۔۔۔ اے لودہ تو میرا سب سے سیانا بیٹا ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔۔۔“

”تو بہ استغفار اسکا مطلب آپ اپنے بیٹے کو ذرا بھی نہیں جانتی ہیں۔ آتے جاتے گھور کر جاتے ہیں۔“

”اچھا اب کی بار جب گھورے گا مجھے بتانا میں اُسکی خبر لوں گی۔ اُسکو بھی تو علم ہونا چاہیے یہ لڑکی بہت بڑے

آدمی کی امانت ہے۔ لہذا اس پر نظر رکھنا جائز نہیں ہے۔“

”میں کسی کی امانت نہیں ہوں۔“

”یہ تو وقت بتائے گا۔ ابھی تو تیاری پکڑو۔ ورنہ وہ مجھ پر رعب ڈالنے کو اپنی ہیل کی ٹک ٹک سُناتی ہوئی آئے گی۔ میں دنیا کا ہر غم صدمہ برداشت کر سکتی ہوں۔ مگر اپنی فیشن اسبل بہو کو تمہاری غیر موجودگی پر خوش ہونا نہیں دیکھ سکتی ہوں۔ مزید میرے ساتھ بحث نہ کرو۔ ہم لاہور جا رہے ہیں۔ ایک اور بات اگر تم میری بات مان لو تو میں تمہاری بات مان لوں گی۔ واپسی پر پُرانی کتابوں والے سٹائر پر لیکر چلوں گی۔ جتنی چاہے کتابیں خرید لینا پیسے میں دوں گی۔“

”آپ مجھے لالچ دے رہی ہیں۔“

”یہی سمجھ لو پر جلدی کرو۔ کیوں میرا ناک کٹوانا ہے۔ شیم نے سُن لیا تو آجائے گی جتانے کہ یہ لڑکی آپ کہ ذرا قدر نہیں کرتی ہے۔ جسکو آپ اپنی اولاد پر فوقیت دیتی ہیں۔“

”ایمو مثل کر کے کام نکلوانا بھی آپکی پُرانی عادت ہے۔“

وہ چاہ کر بھی بتا نہیں پا رہی تھی۔ وہ فریودہ کی جسم سے آر پار ہونے والی نظروں سے ڈر گئی تھی۔ وہ شخص جتنی دفعہ بھی مخاطب ہوا۔ ہر دفعہ اُسکی نظریں بے باک تھیں۔ اوپر سے فریودہ کی ماں کی ٹینشن۔ کس سیا پے میں جان پھنسی ہوئی تھی۔ اب دو بہنوں کی تعلیم کی ذمہ داری نہ ہوتی تو وہ بغیر سوچے سمجھے یہ نوکری چھوڑ دیتی۔

مگر اُس کو لگ رہا تھا۔ مستقبل کے حوالے سے کوئی اور حل نکالنا پڑے گا۔ فریودہ کے بارے میں اس گھر کی لڑکیوں سے وقتاً فوقتاً سننے کو یہی ملا تھا۔ وہ کسی لڑکی کی محبت میں مبتلا ہو کر بدنام ہو چکا ہے۔ ماں باپ سے جوتے بھی کھائے ہوئے ہیں۔ پھر باہر جا کر سُدھر گیا۔ اب تافہ کو اس بات پر پورا یقین ہو گیا تھا۔ جیسے کہتے ہیں ناں جو گھر پہ بھوکے ہوں۔ وہ لاہور جا کر بھی بھوکے ہی رہتے ہیں۔ اُسی طرح جو گھر پر کینے ہوں۔ وہ باہر جا کر بھی کینے ہی رہتے ہیں۔

پہلے بھی وہ کونسا یہاں پر کسی کے ساتھ بات چیت کرتی تھی۔ مگر اب تو فیصلہ کر لیا تھا۔ فریودہ گھر پہ موجود ہوا تو اُس دوران وہ کمرے سے ہی نہیں نکلے گی۔ اگر یہ تجربہ بھی ناکام ہوا تو کچھ اور سوچ لے گی۔

اماں وڈی جتنی بھی نیک فل اور پیار کرنے والی تھیں۔ آخر وہ تھی تو اُنکی ملازمہ اسلیے نوکر کی تے نخرہ کی والا اصول لاگو کرتے ہوئے آخر اُسکو تیار ہونا ہی پڑا۔

لائٹ بیلوسوٹ پر کریپ کا دوپٹہ سر پر اوڑھ کر اپنی لمبی چوٹی مٹھپائی۔ اماں وڈی کا بیگ اُسکے ایک بازو پر لٹک رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اماں وڈی کو سہارا دیکر باہر لا رہی تھی۔ بیروں میں لیڈر کے سادہ ڈیزائن والے جوتے تھے۔ جو سیماب نے اُسکو گفٹ کئے تھے۔ کیونکہ سیماب ہر چھ ماہ بعد شہنشاہی روڑ پر لیڈر کے جوتوں والی فیکٹری سے ڈسکاؤنٹ پر پورے سیزن کے جوتے لے آتی تھی۔ پھر اسی طرح بہنوں اور ماں کو گفٹ کرتی۔ گھر کے بھی افراد اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ شیم گیراج میں کھڑی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر براجمان تھیں۔ اگلی مینجریٹ پر نوازش علی موجود تھے۔

اُنکو آتا دیکھ کر ملازم نے دروازہ کھول دیا۔ تاحفہ نے اماں وڈی کو بیٹھنے میں مدد دی۔ اب شیم ڈرائیور کی سیٹ کے بالکل پیچھے تھی۔ درمیان میں اماں وڈی بیٹھ گئیں۔ باقی بچی جگہ میں تاحفہ ساگنی۔ اُسکو جو غلط فہمی تھی۔ کہ شائد ڈرائیور ہی ساتھ جائے گا۔ نوازش علی کی آواز نے وہ خوش فہمی بھی دور کر دی۔

”غفور جاؤ فریوڈ کو بولوا ب نکل بھی آئے۔۔۔“

”جی ادا آگئے جے۔۔۔“

سائیڈ مرر میں آتا ہوا دیکھائی دیا۔

سکائی بیلوشلوار سوٹ پر ڈارک اور لائٹ بیلو پرنٹ کی ویسٹ کوٹ تھی۔ آنکھوں پہ کالے شیشے بالوں کو جیل لگا کر سیٹ کیا گیا تھا۔

”ہاں بھئی چچا کیا گاڑی کا پانی تیل سب سیٹ ہے؟“

”ہاں جی بے فکر ہو کے جاؤ۔“

چچا غفور نے چابی اُسکے حوالے کی۔

جسے تھام کر وہ اپنی جگہ پہ نکلتے ہوئے نوازش علی سے مخاطب ہوا۔

”ہاں جی تو چلیں۔۔۔؟“

”اتنی تیاری یہاں بیٹھنے کے لیے تو نہیں کی ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو لگا رہا ہے۔ لڑکی دیکھنے نہیں بلکہ بیاہ کر لانے جا رہے ہو۔“

اماں وڈی کی بات پر وہ مسکراتے ہوئے پیچھے کو مڑا۔۔۔

”دادی سمجھا کریں۔۔۔ فرسٹ ایمپریشن از دالاسٹ ایمپریشن۔ کیوں کزن صاحبہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟۔۔۔“

وہ عینک تھوڑی سی نیچے کر کے براہ راست اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

تاشفہ نے کچھ کہنے کو منہ تو کھولا مگر آواز باہر نہ نکلی۔

شیم نے اپنی جگہ پہلو بدلا اور جتاتے ہوئے بولیں۔

”فریوڈ فضول گوئی میں وقت ضائع نہ کرو۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہونگے۔ راستہ بھی کافی لمبا ہے۔“

تاشفہ لائق سے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی میں سب سے بعد میں فریوڈ کے پرفیوم نے پوری طرح قبضہ کر لیا تھا۔

”جی امی۔۔۔“

اپنی جگہ سیدھا ہو کر انجن اشارت کر کے بیک ویو مرئیٹ کیا۔ باہر کھڑے چچا غفور کو ہاتھ ہلاتے ہوئے

گاڑی گیٹ سے نکال لایا۔

رہائشی علاقے سے نکلتے ہی ٹائر تیز رفتاری سے راستہ کھانے لگے۔

سارا راستہ فیملی آپس میں باتیں کرتی رہی۔ ایک وہ خاموشی کا روزہ رکھ کر باہر دیکھ رہی تھی۔ کبھی کبھار اپنے

فون کی سکرین روشن کر کے نوٹیفیکیشن دیکھ لیتی۔ مگر فون اُسکے دل کی طرح بالکل خاموش تھا۔

ائے سی لگی اتنی آرام دہ سواری میں بیٹھے ہونے کے باوجود تاشفہ کو اپنے اندر وحشت اُترتی محسوس ہو رہی

تھی۔ کاش ایسا ممکن ہوتا وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر یونہی کہیں چلی جاتی۔

گاڑی میں کلک کی آواز گھونجنے پر وہ اپنی چونکی۔۔۔

بے اختیار نظر سامنے کو اٹھی بظاہر سامنے سڑک پر دیکھتی دو کالے شیشوں کے پیچھے چھٹی خوبصورت مردانہ

نظریں اس وقت بھی تاشفہ کو ہی پڑھ رہی تھیں۔ اگلی نظر تاشفہ نے اپنے ہاتھ پر ڈالی جو کہ دروازے کے لاک کو

گرفت میں لیے ہوئے تھا۔

کیا وہ دروازہ کھولنے کے چکر میں تھی؟۔۔۔ وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی۔

فرہود نے اُسکی لاک پر مضبوط پڑتی گرفت کو محسوس کرتے ہوئے گاڑی اندر سے لاک کی تھی۔ یا پھر شاید تاقفہ کو بیدار کرنے کو ایسا کیا تھا۔ جو بھی تھا۔

تاقفہ نے ہینڈل سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔ یہ سوچ کر دل کی دھڑکن کپٹی میں محسوس ہونے لگی۔ کیا وہ جاگتے میں اتنی بے خبر ہو جاتی ہے؟۔ اگر واقعی دروازہ کھل جاتا۔ اتنی تیز رفتار سے جاتی گاڑی میں سے اُس نے سڑک پر گرتے ہی مر جانا تھا۔ جو کسر رہ جاتی وہ پیچھے سے آنے والی ٹریفک پوری کر دیتی۔ گوجرانوالہ سے لاہور والے جی ٹی روڈ پر ہمیشہ سے ہی بہت زیادہ رش رہا ہے۔ دونوں طرف کی ٹریفک بہت مصروف ہے۔ پہلے کہیں کہیں ڈبل روڈ آتا تھا۔ مگر اب تو ساری سڑک ڈبل ہے۔ مگر رش آج بھی بہت ہے۔ یوں محسوس ہوتا جیسے جیسے سہولتیں بڑھتی ہیں۔ ویسے ویسے مسائل میں تہدیلی آ جاتی ہے۔ مسائل کبھی ختم کیوں نہیں ہوتے؟۔“

جس وقت گاڑی لڑکی والوں کے گھر کے باہر کی گھڑی کی سونیاں ڈھائی بج رہی تھیں۔ ادھر فرہود نے ہارن دیا۔ ادھر چوکیدار نے گیٹ وا کر دیا۔

اُس کے بعد کا منظر دیکھنے والا تھا۔ لڑکی والے گھر کے سبھی افراد ہاتھوں میں پھول لیے استقبال کو کھڑے تھے۔ فرہود نے گاڑی گیراج میں لا کر انجن بند کر دیا۔ پھولوں کی چھانڈوں میں اُن کا بڑا ہڈ تپاک استقبال ہوا تھا۔ سب سے آخر میں فرہود کسی شہزادے کی طرح گاڑی سے نکلا ایک ایک فرد کے ساتھ خوش اخلاقی سے ملا۔ تعارف کے دوران جب تاقفہ کی جانب سوالیہ نظریں اٹھیں۔

”یہ آپکی کوئی رشتے دار ہیں۔ کیونکہ اتنا تو پتا ہے۔ فرہود بیٹے کی کوئی بہن نہیں ہے۔ تو پھر یہ پیاری سی پری کون ہے؟۔“

”ڈاکٹر ایریج فلک کی امی نے انتہائی خوش اخلاقی سے پوچھا تھا۔ جواب میں ساس سے پہلے ہی شیم نے اپنا دل ہڈ سکون کیا۔

”یہ تاقفہ ہے۔ ہماری رشتے دار نہیں ہے۔ بلکہ ہماری ملازمہ ہے۔“

اتنے سارے لوگوں کی نظریں خود پر دیکھ کر تھوڑے خود کو سنبھال ہی رہی تھی۔ شمیم کے الفاظ سن کر شرمندگی سے چہرہ سُرخ ہو گیا اُس نے گردن اٹھکالی۔ نظر اٹھا کر کسی جانب دیکھنے کی اس وقت اُس میں ہمت ہی نہ تھی۔

”اماں وڈی نے بہو کو نفرت سے دیکھا تھا۔ جو بڑی خوش نظر آ رہی تھیں۔

ارمان خان کی فیملی ساری کی ساری بڑی پڑھی لکھی اور آزاد خیال تھی۔ اسی لیے مہمانوں کو بھی کس گید رنگ میں ہی بٹھایا گیا۔

مگر ان لوگوں کا اخلاق کمال کا تھا۔ اتنے امیر ہونے کے باوجود کوئی شو بازی نہ تھی۔ نہ ہی لمبی لمبی چھوڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر فلک ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ مگر اُس کے بہن بھائی اور ماں باپ کا حسن دیکھ کر صاف اندازہ ہو رہا تھا۔ لڑکی بھی لا جواب ہی تھی۔

اُس کے بہن بھائی اماں وڈی سے گاؤں کہ زندگی کے مطلق باتیں کر رہے تھے۔

اُن لوگوں کا کہنا تھا۔ وہ آج تک کبھی کسی گاؤں میں نہیں گئے۔

فلک کی چھوٹی بہن مسلسل فریود کا سرکھار ہی تھی۔

”فریود بھائی آپ نے کبھی کوئے کا گھونسلہ دیکھا ہے؟“

”ہاں جی بہت دفعہ۔۔۔“

وہ اُس گیا رہ بارہ سال کی بچی کو مُسکرا کر جواب دینے پر مجبور تھا۔ کیونکہ اپنی دو پونیوں اور موٹی موٹی محصوم آنکھوں کے ساتھ وہ اپنی عمر سے ڈھیر چھوٹی لگ رہی تھی۔

”اگر میں آپ کے گاؤں آؤں تو کیا آپ مجھے کوئے کے انڈے دیکھا بیٹے۔۔۔“

”کیوں نہیں اگر نہ ملے پھر بھی میں ای بے سے آرڈر کر کے منگوا لوں گا۔“

اُسکی بات پر زبردست تہقہ پڑا تھا۔

”کیا ائی بے پر کوئے کے انڈے بھی مل جاتے ہیں؟۔۔۔“

”امید کی جاسکتی ہے۔“

بڑے سے ڈرائیونگ روم میں چھوٹے بڑے سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

”کتنی خوبصورت بات ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ ہم لوگ پہلی دفعہ مل رہے ہیں۔“

شیم نے کہا تو فلک کی امی فوراً اتفاق کرتے ہوئے بولیں۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ سچی میں آپکی ساس بے تو دل ہی جیت لیا ہے۔ اتنی سادہ خاتون ہیں۔

لگتا ہی نہیں اتنے مربعوں کی مالک ہیں۔ مگر مجھے آپ سے ایک شکوہ ضرور ہے۔ آپ کو اپنی ساری فیملی کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔ رشتے والی نے بتایا تھا۔ نوازش بھائی کے باقی دو بھائی اور بہن بھی ساتھ رہتے ہیں۔ ہم نے تو اس

حساب سے بیس بچپس افراد کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مگر آپ تو بس تین لوگ ہی آئے ہیں۔“

”تین کہاں؟۔۔۔ اپنی نوکرانی ڈال کر ہم پانچ تو ہو ہی گئے ہیں۔“

”فریوڈ بیٹے کو تو شامل ہی نہ کریں۔ اور یہ پیاری بچی تو چُپ چاپ بیٹھی ہوئی ہے۔ باقی تو آپ تین ہی رہ

گئے۔ جن سے دو دو ہاتھ کئے جاسکتے ہیں۔“

شیم کا حلق کڑوا ہو گیا۔ ٹھیک ہے خاندان خوش اخلاق اور چاہت کرنے والا ہوتا۔ مگر اتنا بھی نہیں کہ لڑکے کی ماں سے زیادہ اہمیت اسکی دادی اور لڑکے کو دی جارہی ہے۔ لڑکے کے تائی ’تایا سے ملنے کی خواہش کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور جب ایک دفعہ بتا دیا ہے۔ تافہ نوکرانی ہے۔ پھر بھی اُسکو مہمانوں کے ساتھ ہی چائے پانی دیا ہے۔ اتنا نہیں ہو سکا ذرا علیحدہ سے بیٹھا کر ایک کپ چائے دے دیتے۔ نوکر اور مالک کو ایک ہی پلیٹ میں کھلانے والے جاہل لوگ۔

یہ سب سوچتے ہوئے وہ یہ بات بھول رہی تھیں۔ اُنکی ساس نے کبھی گھر کے اصل نوکروں کو بھی نوکر سمجھ کر حقیر نہیں جانا تھا۔ یہ لڑکی تو پھر شیم کے سکھے بھائی کی بیٹی تھی۔ اُنہوں نے ایک تافہ کی وجہ سے اپنے بھائی کو چھوڑ دیا ہوا ہے۔ باقی سب باتیں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔

تافہ تھری سیڑ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میج کی وائبریشن پر اُسکا ہاتھ اپنی گلانی پہ بندھے پاؤںچ میں گیا۔ سکرین پر لائف لائن کا نام دیکھ کر ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اماں وڈی سے معذرت کرتی کمرے سے نکل آئی۔ نہ وہ کہیں دیکھ رہی تھی۔ نہ سوچ رہی تھی۔ جیسے ایک نشے کے عادی انسان کے ہاتھ میں کہیں سے نشہ لگ جائے وہ گرنا پڑتا کہیں محفوظ جگہ پر بیٹھ کر اُس زہر کو اپنے

اندر اُتارنا چاہتا ہے۔

اُسکو بھی دوسرے بس گھاس نظر آیا تھا۔ جس سے اندازہ ہوا۔ اُس جانب لان ہوگا۔ تیز تیز چلتی وہاں آئی۔ ایک بیچ پر بیٹھ کر گہرا سانس بھرا اور فون کھولا۔

سکرین پر ایک سوال آرہا تھا۔

”کسی ہو؟۔۔۔“

”ٹھیک ہوں۔“

جواب دینے کے بعد کتنی دیر سکرین کو پڑھتی رہی آیا وہ کوئی اور بات کرے گا۔ پانچ منٹ بعد دوبارہ میسج آیا۔ ”میں تمہاری کئی باتوں پر غور کر رہا تھا۔“

”کوئی باتوں پر۔۔۔؟“

تاہم کے دل میں جیسے کسی نے منجھڑا تارا ہو۔ وہ پانچ منٹ میں ایک میسج کر رہا تھا۔ اور تاہم کی جانب سے دو سیکنڈ سے پہلے جواب جارہا تھا۔

پھر پورے پانچ منٹ بعد جواب آیا۔

”یہی کہ ہمیں اس تعلق کو ختم کر دینا چاہیے۔“

تاہم نے خالی خالی نظروں سے اپنے گرد دیکھا۔ وہ اتنے بڑے بنگلے کے پچھلے حصے پر بنے لان میں موجود ایک شیڈ سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اب دیکھا تو دل میں سوال آیا۔

”اتنا طویل لان عبور کر کے یہاں آئی ہوں؟۔۔۔“

یہاں سے گھر کے اندر ہونے والی آمدورفت نظر نہیں آرہی تھی۔

فلک کی چار بہنیں اور دو بھائی تھے۔ دو بہنیں اور بھائی شادی لحدہ تھے۔ جو آج بچوں کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ یہاں سے دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا۔ گھر کتنے زیادہ رقبے کو گھیرے ہوئے تھا۔ شمیم پھوپھی کو اگر لڑکی پسند

آگئی تو جھٹ مگنی پٹ بیاہ والی بات ہوتی تھی۔ اور فی الحال تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ رشتہ ہو ہی جاتا ہے۔

ادھر ادھر کی باتیں سوچ کر خود کو بہلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔۔۔

”تو کیا اس لیے پچھلے دودن سے رابطہ نہیں کیا؟۔۔۔“

اُسکے پوچھنے پر دوسری جانب سے فوری جواب آیا۔

”ہاں۔۔۔ اور اب میں سمجھ گیا ہوں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ جس رشتے کا کوئی منہ سر نہ ہو۔ اُسکا ہونا نہ ہونا ایک

برابر ہی ہے۔ آج سے ہمارے راستے الگ ہیں۔“

اتنا صاف ستھرا اور اتنا اچانک انکار تاشفہ کو لگا سانس سینے میں ہی کہیں رُک گئی ہو۔ جی میں آیا اُسکو میٹج

کرے۔

”تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ مجھے چھوڑ کیسے سکتے ہو؟ کیا تمہاری محبت بغیر وفا کے بانجھ محبت تھی؟ ابھی

آخری دفعہ تو اتنی جذباتی باتیں کر رہے تھے۔ دودن لگے اور تمہاری ساری آئیڈیلوجی بدل گئی۔ میں نے ایک

دفعہ کہا ہمیں الگ ہو جانا چاہیے اور تم مان گئے۔ مجھے قائل کرنے کی بجائے خود ہی ہار مان گئے۔ یا تم چاہتے ہی یہ

تھے؟۔۔۔

فون بند کر کے پاؤں گچ میں ڈال دیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزر گئے۔

شام کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اندر جانا چاہتی تھی۔ مگر دروازہ ہر بن کر رگوں جان

میں ایسے پھیلا ہوا تھا۔ جیسے اب اس دل سے نکل کر کہیں نہیں جائے گا۔ اندر باہر سناٹا ہی سناٹا تھا۔

چہرے پر آئے پنے کو پلو سے صاف کرنے کے بعد ہتھیلی کی لکیروں پر انگلی پھیر رہی تھی۔ جب نیم تاریکی

میں ایک سایہ بڑی تیزی سے اپنی طرف آتا دیکھا ہی دیا۔

دل میں ڈر سا آیا۔ ایک انجانے گھر کے لان میں ایسے اندھیرے میں بیٹھنا سراسر حماقت ہی تھی۔ اپنی جگہ

سے اٹھی۔ مگر خود سے قریب آتے اُس وجود سے اٹھنے والی خشبو نے حیرالائز کر دیا۔

حیرت کے جھٹکے سے ٹکٹنے کی کوشش میں اُسکے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”آپ یہاں۔۔۔؟۔۔۔“

سنجیدہ چہرہ ’جذبات کا سمندر لٹا تیں گہری سیاہ آنکھیں‘ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہونٹ۔۔۔۔

لبے لبے ڈگ بھرتا اُس کے پاس آیا۔ اپنے حدت دیتے ہاتھوں کے پیالیمیں تاشفہ کا چہرہ بھرا۔ کچھ بھی کہنے سننے

کا موقع دیئے بغیر تافہ کے کانپے ہونٹوں کو فوکس میں رکھتے ہوئے اُسکے چہرے پر جھکا۔

اپنا غصہ 'محبت' جھنجھلاہٹ جو جو احساس وہ اس لڑکی کی وجہ سے محسوس کرتا تھا۔ سب اپنے لیوں کی گرمی کے ذریعے واپس اُسی کو لٹا دیا۔ تافہ کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر سائز میں کئی گنا بڑھ گئیں۔

مضبوط مردانہ بازو تافہ کی کمر میں حائل ہو کر اُسکو اپنی گرفت میں اٹھائے ہوئے تھے۔ گر جانے کے ڈر سے تافہ نے اُسکے شانوں کو تھام لیا۔

نہ جانے کتنے پل گزر گئے۔ اُسکو سانس نہیں آرہی تھی۔ مگر دوسرے فریق کی گرفت ڈھیلی ہونے کی بجائے مزید مضبوط ہو رہی تھی۔ تافہ نے اُسے اپنے ہاتھوں سے دور دھکیلنے کی کوشش کرنی چاہی مگر ناکام رہی۔ جذبات کا ایک ایسا دریا جس پر بندھ باندھنے کے چکر میں دونوں بے حال ہو گئے۔

”تافہ آپی۔۔۔!!۔۔۔“

آواز دور سے آتی سنائی دی۔ تافہ کو چند پل گئے پہچاننے میں وہ ڈاکٹر فلک کی چھوٹی بہن کی آواز تھی۔ پھر اماں وڈی کی آواز آئی۔۔۔

”ناشی پریشان کر رہی ہو۔ کدھر ہو؟۔۔۔“

اُس نے تافہ کے لب آزاد کر دیے۔ دونوں کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ مگر اُسکو ایک دم سے جانے نہیں دیا۔ اپنے ساتھ لگائے رکھ کر اُسکے کان کے قریب جھکا۔

”میرے بارے میں کبھی ابہام کا شکار نہ ہوتا۔ یہ آج تمہاری کبھی گئی باتوں کا جواب دیا ہے۔ مجھ سے دور جانے کا شوق ہے۔ تو پہلے خود کو اتنا مضبوط کرو کہ میری دوری سہہ سکو۔ میری زندگی میں صرف تم ہی ایک حقیقت ہو۔ باقی جو ہے وہ سب سیراب ہے۔ سمجھ آئی؟۔۔۔“

تافہ کی پیشانی اُسکے سینے پہ ٹکی تھی۔ اُسکی بند آنکھوں میں نمی تھی۔ مگر اُسے سانس کھینچتے ہوئے وہ اُسکی خوشبو کو محسوس کر رہی تھی۔

یہ کہا ہوا؟۔۔۔ جس کے سامنے آنے سے ہی وہ ڈر جاتی تھی۔ اس وقت اُسکی بانہوں کی مضبوطی نے تحفظ کا وہ احساس دیا تافہ کیدل میں سکون ہی سکون سرایت کرتا چلا گیا۔

قدموں کی چاپ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ اُسکی طرح اُسکا دامن تھامے سر جھکا کر سینے سے لگی کھڑی رہی۔

آپ کو کیسے پتا چلا میں یہاں ہوں؟ کیا ہر وقت میرا ہی پیچھا کرتے ہیں؟“

”اپنے دل کا پتا ہوتا ہے۔ وہ کہاں دھڑک رہا ہے۔ اور اپنی عورت کو نظر میں رکھنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔“

تافہ نے نم آنکھوں سے اوپر دیکھا۔ وہ کس قدر پاس تھا۔

”یہ جو لمحہ ہمارے درمیان آیا ہے۔ ہمارے تعلق کو خیالی دنیا سے حقیقت تک لے آیا ہے۔ اب اسکے بعد بھی

تم مجھے ٹھٹھلانے کی کوشش کرو تو گناہ ہے۔“

اُسکی نظروں میں تافہ کے لیے انتہائی نرم تاثر تھا۔

اُس نے آخری دفعہ تافہ کی جانب بڑی دلکش مسکراہٹ بھینکی اور اُسے آزاد کرتا ہوا پچھلے دروازے کی

جانب غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

ٹرک میں عطا اللہ صیسی خیلوی کی آواز نے سرور باندھا ہوا تھا۔ ڈرائیور عطا اللہ کو سنتے ہوئے سٹیرنگ و ہیل کو

انگلیوں کی مدد سے ڈرم کی طرح بجارہا تھا۔

آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔ جیسے سامنے من پسند شراب کا جام پڑا ہو۔ اور اُسکو پچے بغیر دیکھ دیکھ کر ہی

سرور مل رہا ہو۔ اور یہ سوچ کر اور بھی مدہوشی چھاتی ہو۔ کہ بن پنے یہ عالم ہے۔ تو جب جام لبوں سے لگاؤ لگا۔

تب کیا حالت ہوگی؟

ٹرکوں کے اڈے پر پہنچ کر اُس نے اپنی جانے جگر سواری کو بڑی محبت سے پارک کیا۔ انجن بند کرتا چھلانگ

مار کر ٹرک سے اتر آیا۔

جسم سے ستے عطر کی تشبو اُٹھ رہی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا شلوار سوٹ اونچا لمبا قد بھرا بھرا جسم ایک نظر دیکھنے پر

کوئی اُسکو پینڈ و ماڈل سمجھتا۔ سر پر بڑی سی ململ کی گچڑی تھی۔ منہ میں پان چباتے ہوئے کبھی کبھی اپنی رنگی زبان کو

سُرخ ہونٹوں پر مارتا۔ پھر شائل سے مانچھوں کو سیٹ کرتا تھوڑی تھوڑی دیر بعد لا پرواہی سے پان کی پیک یہاں

وہاں پھینکتا۔

ہوٹل والے کو سلام مار کر وہیں بیٹھے ڈرائیوروں کے پاس ٹک گیا۔
جو اس نئے چہرے کو تجسس سے دیکھ رہے تھے۔

”مجھے رزاق قریشی سے ملنا ہے۔ کوئی بتائے گا یہ شہزادہ کہاں پایا جاتا ہے؟“

ایک طرف چار پائی پہ موٹا سا بے ڈھنگا شخص بڑا ادگھر رہا تھا۔ اس آواز پر اس نے کپڑے پہ پڑا کپڑا اٹھا کر
پوچھنے والے کو دیکھا۔

”میں ہوں رزاق قریشی کون ہے جو مجھے پہلے سے نہیں پہچانتا ہے۔ کیا بئے آئے ہو؟۔۔۔“

اُستاد تمہارے اڈے کے چہ چہ ادھر میرے کراچی میں بھی بڑی دھوم کے ساتھ بچتے ہیں۔ دس سال
ہو گئے مال کو سارے سندھ میں ڈلیور کرتے آج پہلی دفعہ پنجاب کا رخ کیا ہے۔ وہ بھی صرف تمہارے لیے۔
ہاں تمہارے اڈے پر پہلی مرتبہ آیا ہوں۔“

رزاق قریشی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف آیا۔

”مصافحہ کرنے کو ہاتھ بڑھا یا۔ جس کو مہمان نے بڑی گرجوشی سے پکڑ کر ہلایا۔“

”کیا نام ہے؟۔“

”سومرو۔۔۔“

”ہاں تو سومرو کیا چیز مجھ تک لائی ہے؟۔۔۔“

سومرو کمینگی سے مسکراتے ہوئے اپنے لال سُرخ دانت دیکھاتے ہوئے بولا۔

”جناب سنا ہے آپ بڑا سچا مال دیتے ہیں۔ بس اُسی کی کشش میں یہ خادم ادھر حاضر ہوا ہے۔“

رزاق نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ ایسے آسانی سے تو وہ ہاتھ لگنے والی چیز نہ تھا۔

ڈھا بے والے کو مخاطب کر کے بولا۔

”او چھوٹے۔۔۔ پرونے کے لیے چا پانی کا بندوبست کرو۔“

”جناب پانی کو چھوڑیں بس چاہ کی بات کریں۔ مجھے مال چاہیے۔ کتنا پیسہ لگتا ہے لے لو۔ پر مال کھرا ہو۔“

بات کے اختتام پر اُس نے آنکھ ماری۔

رزاق دھیمی آواز میں متنبہ کرتے ہوئے بولا۔

”آج کل اس جگہ کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس لیے یوں سر عام بات نہیں ہو سکتی۔ تم کھانا دانا کھاؤ پھر میں تمہیں اپنے ٹھکانے پر لے چلوں گا۔ وہاں جا کر بات کریں گے۔ ویسے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کراچی تو خود بڑا امیر ہے۔ پھر تم یہاں ہی کیوں آئے۔“

”وہاں پر بیماریاں عام ہو گئی ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے نئی پونگ نہیں آئی۔ اور مجھے استعمال شدہ مال سے سخت الرجی ہے۔ مجھے تازہ مال چاہیے۔“

رزاق کی آنکھوں میں چمک اُتری جیسے شکار کو دیکھ کر لومڑی کی آنکھیں چمکتی ہیں۔

”اگر تمہیں بھوک پیاس نہیں ہے۔ تو آ جاؤ تمہیں وہ دوں جسکی ضرورت ہے۔ پر تمہیں یہاں سے نکل کر میرے ساتھ جانا پڑے گا۔“

سومروٹ چارپائی سے اُٹھا۔

”اُستاد جہاں لے چلو چلیں گے۔ کیا میری گاڑی یہاں محفوظ رہے گی؟۔۔۔“

رزاق جانتا تھا۔ ڈرائیور اپنے گھر والوں سے زیادہ اپنی گاڑیوں سے پیار کرتے تھے۔ ہنستے ہوئے بولا۔

”یہ میرا علاقہ ہے۔ یہاں میری مرضی کے بغیر چڑی بھی پر نہیں مارتی۔ بے فکر ہو کر آؤ۔“

وہاں سے نکل کر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے گلیوں سے ہوتے ہوئے اُس جگہ آئے۔

گندے سے ہوٹل جو پورے ملک سے آنے والے ڈرائیوروں کے استعمال میں رہتے تھے۔ خاص کر ٹرک ڈرائیور دور دراز علاقوں سے ہوتے ہوئے۔ کئی کئی گھنٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد کسی بڑے شہر میں پہنچتے تو سکون کی تلاش میں ایسے ہی سستے ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں۔

پاکستان کے لیے یہ بات انتہا سے زیادہ شرم ناک ہے۔ پاکستان کے ننادے فیصد ٹرک ڈرائیور اپنے منہ سے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہوں نے چھوٹی عمر کے معصوم بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی ہے۔ بہت

بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہے۔ جو گھر سے بھاگے ہوتے ہیں۔ جن کے پاس کھانے پینے کو بھی پیسہ نہیں ہوتا۔ وہ لڑکے پھر ایسے ہی ہوں گے مارے لوگوں کے ہتھے چڑھ کر اپنا جسم بیچتے ہیں۔ جن میں بہت دفعہ کم سن لڑکے پیسوں کے لالچ میں موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔

جو سماجی ادارے بے گھر بچوں کو تحفظ دینے کی کوشش میں کارفرما ہیں۔ ان کی کئی تحقیق کے مطابق دس میں سے نو بے گھر بچے جنسی زیادتی کا شکار ہیں۔

دو ہزار چودہ میں بی بی سی کی بننے والی ڈاکیومنٹری میں پشاور کے حوالے سے انتہائی شرم ناک بات سامنے آئی تھی۔ کہ پشاور اس مجرم میں سب سے آگے ہیں۔ مگر اس وقت پورے ملک میں ایڈز جیسے موزی مرض کو بڑھانے کی سب سے بڑی وجہ مردوں کا ہم جنس جستانی تعلق ہے۔ چاہے وہ کم سن بچوں کے ساتھ ہو یا بڑی عمر والوں کے ساتھ۔

ٹرک ڈرائیور چوٹے کئی کئی دن گھر سے باہر رہتے ہیں۔ انکا زیادہ وقت سڑکوں پر گزرتا ہے۔ یہ اتنا زیادہ کماتے بھی نہیں ہیں۔ اس صورت میں سب سے سستی عیاشی کم سن لڑکے ہیں۔ جن میں سے کئی اغوا ہو کر ایسی جگہوں پر پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اگر آپ نوٹ کریں۔ آپ کے علم میں ایک بات آئے گی۔ ٹرک والے اپنے ساتھ ایک لڑکا ضرور رکھتے ہیں۔ جن کی عمر دس سے گیارہ سال ہوتی ہیں۔ کئی دفعہ اس سے بھی چھوٹی عمر۔۔۔ ان بچوں کو اسی مقصد کے لیے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ جو بعد میں یا تو بیمار یوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ یا پھر ساری عمر اسی دلدل کا حصہ بنے رہتے ہیں۔

سومرو آنکھیں پھاڑے اپنے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ یقین ہی نہ آیا کہ یہ پاکستان ہے؟ اللہ کے نام پر حاصل کیا گیا ملک؟

کیا یہ وہی زمین ہے جسکے حصول کی جنگ میں لاکھوں لوگ زندگی کی بازی ہار گئے؟ کیا فربانیاں اس لیے دی گئی تھیں؟

یہ وہ سوال ہیں جو ہر پاکستانی سے بنتے ہیں۔ حکمرانوں سے گلے کرنا آسان ہے۔ خود سے پوچھا کبھی؟ تمہارا کیا رول تھا؟ تم نے کیا کیا؟

نُرائی کے پہاڑ بلند ہو گئے۔ ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی اور ہم اپنے ڈرائنگ رومز میں اے سی کی ٹھنڈک میں بیٹھ کر انڈین گانے سنتے رہ گئے۔

کسی کمرے کا دروازہ نہیں تھا۔ سومرو کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اُسکا جی چاہ رہا تھا۔ اپنی آنکھوں میں جلتا ہوا۔ سریہ مار کر آنکھیں پھوڑ دئے۔

وہ جن کی زندگی ابھی شروع ہی نہ ہوئی تھی۔ جنہوں نے سالوں بعد جا کر زندگی کا مفہوم جانتا تھا۔ اپنی عُربت اور بے بسی کی بھیئت چڑھ کر آنکھوں کی چمک کھو چکے تھے۔ اُنکے چہروں پر معصومیت کی بجائے کرخشکی نظر آرہی تھی۔ جو کسی اسی نوے سال کے بزرگ کی چہرے پر بھی نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ اُنہوں نے وہ کچھ نہیں دیکھا تھا۔ جو یہ آج کے بچے سہہ کر بڑے ہو رہے تھے۔

”اگر ملتا بھی بھوکا مر گیا تو عمر اپنے رب کو کل کیا جواب دیگا۔“

اُسی عمر فاروق کے ماننے والے کل عمر کو کیا جواب دیں گے؟
ہمارے سامنے کلمے کی بے حرمتی ہوتی رہی اور ہم نے کچھ بھی نہ کیا۔
سومرو نے خود سے سوال کیا۔

”کیا یہ پاکستان کی بے حرمتی نہیں ہے؟ پاکستان کے بچے ہی محفوظ نہیں ہیں؟ جنہوں نے سائنس کی دنیا کو فتح کر کے خلاؤں کا سینہ چیر کر نئے جہان دریافت کرنے تھے۔ اُنکے ساتھ ہم نے کیا کیا ہے؟۔۔۔“
اپنے اندر اُٹھتے اُبال کو کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا۔ اُسکا جی چاہا اپنا مسئلہ نکال کر یہاں موجود ایک ایک نامرد کی کھوپڑی اُڑا دئے۔

اُسکا دل خراب ہو رہا تھا۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنا کام مکمل کئے بغیر اپنا بھیس کھول دیتا۔
رزاق نے ایک بد بودار کمرے میں ایک گرسی پیش کی۔ جس پر بیٹھنے کے بعد ایک گندے سے گلاس میں جو مشروب دیا گیا۔ وہ بلاشبہ شراب تھی۔

اُس نے سوٹکھے بغیر دو تین گھونٹ میں وہ زہرا اپنے اندر اُتار۔
آنکھوں کی لالی بڑھتی جا رہی تھی۔

”قریشی مجھے مال دیکھاؤ۔۔۔ منہ مانگی قیمت دوں گا۔“

قریشی اُسکی بے صبری پر دل کھول کر مسکرایا۔

”تم بہت دور سے آئے ہو۔ اسلیے تحفہ بھی خاص ہی لیکر جاؤ گے۔“

اُس کے اشارے پر دروازے کے پاس کھڑے لڑکے نے تین لڑکوں کو اندر بھیجا۔

سومرو نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے۔ بڑے غور سے ایک ایک کو دیکھا۔

رزاق نے لڑکوں کو ڈانٹ کر حکم دیا۔ چلو ذرا گھوم کر دیکھاؤ۔ اور جوا گلا حکم دیا۔ سرمرو نے اپنی مردانگی پر توف

بھیجا کہ ابھی اسی وقت قریشی کا گلا کیونہیں کاٹا۔“

”مجھے تینوں ہی منظور ہیں۔ پراگلی دفعہ کے لیے میری فرمائش ہے۔ مجھے اس سے بھی چھوٹی عمر چاہیے۔“

”بتاؤ کتنے میں دیتے ہو؟ اور انکو ساتھ لیجانے میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟۔۔۔“

”پنجاب کے اندر تو اپنے تعلقات کی بنا پر میں تمہیں خطرے سے بچا لوں گا۔ اُسکے آگے تمہاری اپنی ذمہ داری

ہوگی۔“

”بس پنجاب تک سنبھال لو سندھ کی پولیس اپنی ہی ہے۔ دے دلا کر جانے دیگی۔ تم اپنا دام بتاؤ۔“

”ایک لڑکے کا پچاس ہزار لوں گا۔“

”یہ تو بہت زیادہ ہے۔ نہ دینے والی بات کر رہے ہو۔“

”اس سے کہیں سے مل جائیں تو مجھے بھی لا دینا۔“

”کیا بات کر رہے ہو۔ باہر نکل کر اس ہوٹل کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لو۔ پانچ دس ہزار سے زیادہ کسی نے

نہیں دیا ہوگا۔“

”دیکھو سومرو تم اتنی دور سے آئے ہو۔ اپنے سندھی بھائی ہو۔ تمہاری خاطر میں کر لیتا ہوں۔ اس سے ایک

روپیہ نہیں کم کروں گا۔“

”چل تو خوش ہو جا۔“

سومرو نے جیب سے نوے ہزار روپیہ نکال کر قریشی کے ہاتھ میں دیا۔ اور لڑکوں کو لیکر وہاں سے نکل آیا۔

وہ تینوں بچے ٹرک کی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر پورے آگئے تھے۔

جوں ہی اُس نے ٹرک وہاں سے نکال کر سڑک پر ڈالا۔ چہرے پر بھی مصنوعی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ صرف اس خیال سے کہ کہیں کوئی اُس کا پیچھا نہ کر رہا ہو۔ اُس نے ٹرک کو موٹروے پر ڈالا۔ جب شہر بہت دور رہ گیا۔ اُس نے کالا شاہ کا کو کے قریب موٹروے چھوڑ کر ٹرک سائیڈ پر اتارا۔ وہاں پر گاڑی انتظار میں کھڑی تھی۔ جس میں سب سے پہلے برآمد ہونے والا آدمی سومر واپس چلا۔ ٹرک کا اصل مالک۔۔۔ نپلی سومرونے اُسکے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور تینوں بچوں کو گاڑی کی کچھلی سیٹ پر بیٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر موجود منیر کے برابر آ بیٹھا۔

گاڑی واپس لاہور کو چل پڑی۔

اُس نے اپنے سر پر رکھی پگڑی اتار کر گود میں رکھتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”میں جس کی تلاش میں گیا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں ملا ہے۔ مگر یہ جوں گئے ہیں۔ انکو سنبھالنا مشکل ہوگا۔“

”آپ کہیں تو ڈاکٹر ایمن صالح کے کلینک لے چلوں؟“

اُسکے دھیرے سے بولنے پر منیر نے بھی دھیمی آواز رکھتے ہوئے سوال کیا۔ جس پر منگو نے اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ اس وقت کچھ بھی کہنے سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ گاڑی میں گھیسر خاموشی کا راج تھا۔

☆.....☆.....☆

”بھئی کیا ہی چاہت کرنے والے لوگ ہیں۔ کچی مزا آ گیا ہے۔ ایک پل کو مجھے یہ لوگ غیر نہیں لگے۔ بڑے اپنے اپنے لگے۔“

اماں وڈی کہ بات پر شیم نے آنکھیں گھمائیں۔ اور بولیں

”دو غلے لوگوں کی یہی نشانی ہے۔ خوب چالوسی کر کے اگلے کوششے میں اتارتے ہیں۔ یہی لڑکی کی ماں نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔“

”آئے ہائے بہو۔۔۔ بھلا تمہاری بات کا مطلب کیا ہے؟“

”مطلب یہ ہے۔ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں آیا ہے۔ اور آپ اُس لڑکی کو اور اُسکے بھانجے بھتیجیوں کو آخر کتنے پیسے کیوں دے آئی ہیں؟ مانگی ہوں۔ آپ خود مختار ہیں۔ اپنے بینک بیلنس میں سے یوں آزادانہ ہو کر رقمیں بانٹیں

ہیں۔ پر معاف کیجئے گا۔ آج آپ کو یوں حاتم طائی نہیں بننا چاہیے تھا۔“

”مجھے اپنی ہونے والی بہودل و جان سے پسند آئی ہے۔ تو کیوں اُسکو کوئی ٹھکن نہ دیتی؟۔ اتنی پیاری ہے تاشفہ تم نے اُس کے دانت دیکھے ہیں۔ ایسے پیارے ایک لائن میں جیسے موتی پروئے گئے ہوں۔“

”ہاں جی بہت پیاری ہیں۔“

تاشفہ نے فٹ کہا جس پر شمیم مزید تپ گئیں۔

”تم نے تو اُسکو دیکھا بھی نہیں پھر کیا اُسکی خوبصورتی کا الہام ہوا ہے؟۔“

تاشفہ نے گڑبڑا کر صفائی دینی چاہی۔ کیونکہ اُسے یاد آیا واقعی لڑکی کو تو دیکھا ہی نہیں۔ مگر اُس سے پہلے ہی فرہود بول اٹھا۔

”امی مجھ سے بھی تو پوچھیں۔ لڑکی کے بالوں کے دو شیڈز تھے۔ گہرا براؤن اُس میں کہیں کہیں بلونڈ لٹیں۔ اُس نے میک اپ بہت زیادہ کیا ہوا تھا۔ ہل کم از کم پانچ انچ تو تھی۔ اُسکے دائیں ہاتھ کے ناخن نعلی تھے۔ مگر بائیں ہاتھ والے حقیقی تھے۔“

وہ ابھی اور تفصیل بتانے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔ جب شمیم نے درمیان میں ٹوک دیا۔

”کیا تم اتنے غور سے اُسکا جائزہ لیتے رہے ہو؟۔“

”میرے خیال میں آپ مجھے اسی لیے ساتھ لیکر لائی تھیں۔ میں لڑکی کو دیکھ لوں۔ بات چیت کر لوں۔ مجھے لڑکی بڑی پسند آئی ہے۔ میری پسند کے عین مطابق ہے۔ اُس نے ادھر ہی باتوں کے دوران مجھے فیس بک پہ ایڈ کر لیا ہے۔ سٹیٹس بھی آگیا تھا۔“ سنجیدہ وید فرہود علی۔۔۔“

فرہود نے ڈیش بورڈ پر رکھا اپنا فون اٹھا کر ایک ہاتھ سے سکرین روشن کی اور ماں کے سامنے کیا۔۔۔

”یہ دیکھیں اُس نے میری اور اپنی تصویر لگائی ہے۔ کتنے ڈھیر سارے کمپلٹس آئے ہیں۔“

شمیم بیچاری ہکا بکا ہو کر اپنے جگر کے ٹکرے کی باتیں سن رہی تھیں۔ مزید کی نوازش علی نے پوری کی۔

”مجھے اپنی سمدھن کی ایک بات بہت اچھی لگی ہے۔ وہ وقت ضائع کرنے والوں میں سے بالکل نہیں ہیں۔“

کہہ رہی تھیں۔ آج اگر بچوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تو اگلے ہفتے منگنی رکھ دیں گے۔“

شیم جو دودن پہلے انہی باتوں کو اہم ارور الگ جان کر بڑی روشن خیالی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس وقت وہی باتیں اُنکو زہر لگ رہی تھیں۔ کیونکہ ساس کو لڑکی پسند آئی تھی۔ شیم نے بیٹے کی شادی کے لیے اُس لڑکی کو پاس کرنا تھا۔ جو دوسروں کی ناپسندیدہ ٹھہرتی۔ اور ڈاکٹر فلک سب کو پسند آگئی تھی۔ اس صورت میں اُسکا پتا کٹ چکا تھا۔

”لو جی اتنی ہی ہمیں آگ لگی ہوئی ہے ناں کہ اب ہتھیلی پر سروسو جمانے بیٹھ جائیں۔ مجھے تو لڑکی بالکل پسند نہیں آئی۔ اتنی بے باکی کے ساتھ اپنے ماں باپ کے سامنے ہی فریود کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ کوئی شرم حیا ہوتی ہے۔ لڑکے کے گھر والے بھی موجود ہیں۔ پراسکو تو بس لڑکا ہی نظر آیا۔ ابھی رشتہ بھی نہیں ہوا تو یہ حال ہے۔ جب ایک دفعہ شادی ہوگئی۔ ہمیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ اور ہمارا لڑکا تو پہلے سے ہی ماشا اللہ ہے۔“

”میری شامت کیوں بگڑ رہی ہیں۔ میں تو بس اخلاق بھار ہا تھا۔ کیونکہ مجھے آپ کے چہرے نے بڑی پہلے ہی بتا دیا تھا۔ ادھر نہ ہی ہوتی ہے۔ اسلئے سوچا پھر کونسا کبھی زندگی میں ان لوگوں سے سامنا ہوتا ہے۔ پہلی اور آخری یا دا جھی چھوڑنی چاہیے۔ کیوں دادی؟۔۔۔“

اماں وڈی دھیرے سے مسکرا کر بولیں۔

”تم سے ذرا صبر نہیں ہوا۔ فوراً سے بات کھول دی ہے۔ ابھی دو چار دن میں نے تمہاری ماں کو ٹھگ کرنا تھا۔ مگر اب بتانا ہی پڑے گا میں اُن کے بچوں کو پیسے اُس خرچے کے دیکر آئی ہوں۔ جو انہوں نے ہمارے کھانے پینے پر کیا۔ بہونے تو ادھر ہی منا تانا کھلا لیا تھا۔ جیسے وہ بیچارے بندوق کے زور پر اسکو اپنے گھر لائے ہیں۔“

”بس اماں میں تو ایسی ہی ہوں۔ مجھ سے دوغلا پن نہیں رکھا جاتا۔ جو دل میں ہو وہی منہ پر نظر آتا ہے۔ ورنہ کئی لوگ تو اتنے گھنے ہوتے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد بھی چہرے پر معصومیت سجا کر ہمدردیاں سمیٹتے ہیں۔“

تافہ کے گال دھکنے لگے۔ اُسکو لگا یہ بات براہ راست اُسکو لگائی گئی تھی۔ کچھ اپنے ساتھ ہونے والے اُس انوکھے اور عجیب واقعے کا اثر تھا۔ وہ خواجواہ شرمندہ سی ہوگئی۔ چہرہ پوری طرح کھڑکی کی جانب موڑ لیا۔

پچھلا سفر تو کافی تیزی کے ساتھ گزرا مگر جیسے ہی پتھر والی نہر پر آئے شدید قسم کے ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ پیچھے سے بھی مسلسل گاڑیاں آئے جارہی تھیں۔ آگے بے ہنگم قسم کی قطاریں تھیں۔ بڑی چھوٹی ہر قسم کی گاڑیاں 'موٹر سائیکل' 'کوچ' 'بیس' اور تو اور چاند گاڑیوں کی بھرمار تھی۔ جسے دیکھو اوپر چڑھے آ رہا تھا۔ جیسے یہ سب جو کھڑے ہیں۔ بالکل پاگل ہیں۔ اور پیچھے سے آنے والا گاڑی کو پر لگا کر سب کے سروں کے اوپر سے اڑا کر لے جائے گا۔

آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد فریوڈ کی ہمت جواب دے گئی۔

”میں میوزک لگا دیتا ہوں۔ اے سی بھی آن ہے۔ آپ لوگ خیند پوری کر لیں۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ آخر مسئلہ کیا ہے۔“

”چپ کر کے گاڑی میں بیٹھے رہو۔ ایک تو ہر جگہ تمہیں ہیر و بننے کا شوق چڑھ جاتا ہے۔ فریوڈ تم عام لڑکوں کی طرح اپنے حال میں مست کیوں نہیں رہتے ہو۔ سب کی تاک تک جھانک ضرور کرنی ہوتی ہے۔“

”امی کوئی انسان آخر کتنی دیر تک کرا ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ وہ بھی بغیر کسی مقصد کے۔ انتہائی بور کام ہے۔ آپ کیوں یہ خواہش رکھتی ہیں۔ آپ کے بیٹے میں زنانہ عادتیں آئیں۔؟“

اُس کے جواب نے نوازش علی کو ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دل میں اُنہوں نے فریوڈ کی بات کو بڑا انجوائے کیا تھا۔ اگر شمیم ایک بہت زیادہ محتاط قسم کی ماں تھیں۔ تو بیٹا بھی بے ادبی کے دائرے میں گئے بغیر ماں کے ہر اعتراض کا جوڑ نکال لیتا تھا۔

گاڑی میں شیر یوکا پلے بٹن دہانے کے بعد خود گاڑی سے نکل گیا۔

نوازش علی کی نظریں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جو انسانوں کے ہجوم میں بھی نمایاں نظر آتا تھا۔

گاڑی میں نصیبو لال کاری کس بج رہا تھا۔

”ٹو جو میرے ہمیشہ کول رویں۔۔۔“

تے میں دنیاؤں کہہ دواں پرے پرے

دل دے کے دنیا تو کون ڈرے۔۔۔

حیرت انگیز بات جو تافہ کو لگی وہ یہ کہ صرف ایک سپیکر سے آواز آرہی تھی۔ اور وہ سپیکر تافہ کے سر کے پیچھے تھا۔ نصیبو کا ساتھ دینے والا سگر کہہ رہا تھا۔

”سوئیے میں کی کراں دل تے دس نہ چلدا میرا

میں رہواں تیرے کول ہر پل جی کروا میرا

میں تا تیرے پیچھے دنیا لٹائی ائے

اے جاندی میری خدائی ائے۔

جب ایک دفعہ ختم ہونے کے بعد رٹی پلے میں پھر وہی نمبر چل گیا۔ تب تافہ کو یقین سا ہو گیا۔ یہ گانا خاص اُسکو سنانے کے لیے لگایا گیا تھا۔

”پیار میری زندگی ائے

ہور میرے کول کی ائے

دس مینوں میں کی کرا

کول تیرے آگئی آں

لکیاں بھاگئی آں

مر جاں گی تیرے بنا۔۔۔

تیسری دفعہ اگر یہی گانا لگتا تو تافہ کی برداشت جواب دے چکی تھی۔ عین ممکن تھا وہ گاڑی سے نکل جاتی۔ مگر خیر ہوئی اگلا ”کوک سٹوڈیو میں نوری بینڈ کا ہور وکی نواں ہو“ تھا۔

پورے ایک گھنٹے بعد جب لوگوں کا گرمی سے کافی عرق نکل چکا تھا۔ ٹریک میں تھوڑی بہت ہل چل ہونے لگی تھی۔ تب ہی وہ واپس آتا دیکھائی دیا۔

قمیض کے دامن پر لگا خون دیکھ کر شیم آپے سے باہر ہو گئیں۔

”دیکھا اسی لیے میرا دل ڈرتا ہے۔ نہ جانے کیا کر کے آرہا ہے۔ آپ باہر نکل کر پتا تو کریں۔ کہیں کسی سے الجھ تو نہیں پڑا۔“

”اُس کے چہرے پر سکون ہے۔ جسکا مطلب ہے۔ لڑائی والا کوئی سین نہیں ہے۔ باقی اب وہ آگیا ہے۔ پوچھ لینا۔“ نوازش نے ہاتھ بڑھا کر پہلے سے کم سٹیر یوکی آواز مزید کم کر دی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔ ڈیش بورڈ سے ٹشو نکال کر اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ماں کو تسلی دینے لگا۔

”میں جانتا ہوں۔ آپ لوگ خون دیکھ کر پریشان ہو گئے ہیں۔ مگر مجھے کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی میں نے کوئی پتنگا کیا ہے۔ آگے روڈ پر بہت بُرا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کسی آدمی کو دو موٹر سائیکل سوار گولی مار گئے ہیں۔ دو دوست تھے۔ ایک تو موقع پر جاں بحق ہو گیا ہے۔ دوسرے کو تڑپتا چھوڑ کر لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ٹریفک بھی اُسی وجہ سے رُکی ہوئی تھی۔“

”تمہارے کپڑے کیسے رنگے گئے؟“

اماں وڈی کی آواز میں حیرت تھی۔ جس پر وہ اطمینان سے بولا۔۔۔

”زخمی کو ہسپتال روانہ کر کے آیا ہوں۔“

گاڑی کی اندروالی لائٹ آن کر کے وہ ہاتھ صاف تو کر رہا تھا مگر خون گیا نہیں۔ راستہ گھلتا دیکھ کر پیچھے لوگ ہارن پہ ہارن مارے جا رہے تھے۔

نوازش علی اپنی سیٹ سے نکل آئے۔

”تم میری جگہ بیٹھو میں گاڑی چلاتا ہوں۔“

وہ پُچپ چاپ دوسری سیٹ پہ ہو گیا۔

جس وقت وہ لوگ ہٹل کے عین قریب سے گزر رہے تھے۔ چوک میں پولیس ہی پولیس تھی۔ عام عوام کا بھی رش تھا۔ تاففہ نے زور سے اماں وڈی کا ہاتھ تھام لیا۔ جس پر وہ ڈانٹے ہوئے بولیں۔

”لے جھلی نہ ہو تو۔ میرے ساتھ ایسے چٹ رہی ہے۔ جیسے باہر بلائیں نظر آگئی ہوں۔“

اماں کس کی بات کر رہی ہیں۔ کیا فرہود کی ماں ڈر رہی ہے؟۔۔۔

نوازش علی نے مذاق سے پوچھا جس پر اماں وڈی مسکراتے ہوئے بولیں۔

”فرہود کی ماں بہت بڑے جگرے والی ہے۔ وہ ڈرتی نہیں ڈراتی ہے۔ میں تو اس تاففہ کی بات کر رہی

ہوں۔ جو ایسے کانپ رہی ہے۔ جیسے موت کا فرشتہ نظر آ گیا ہو۔“

شیم کی توجہ گاڑی سے باہر تھی۔

”فریوڈ اتنی ساری پولیس موجود ہے۔ اُن میں سے کسی کے لباس پر خون کا ایک چھینٹا نہیں ہے۔ تمہارے ہاتھ بھی بھرے ہوئے ہیں۔“

”ماں بے حسی کی انتہا ہے اور کیا۔ ایک آدمی مرا پڑا ہے۔ دوسرا ایڑھیاں رگڑ رہا ہے۔ پولیس چوکی بھی یہاں قریب ہی ہے۔ واقعے کے دس منٹ کے اندر اندر پولیس ادھر تھی۔ مگر کسی کی بھی اُن دو متاثرہ لوگوں کے قریب آنے کی جرات نہیں پڑی کیونکہ جس آدمی نے یہ حملہ کروایا ہے۔ وہ یہاں قریب ہی جنڈیالہ باغ والا کا بہت بڑا بد معاش ہے۔ وہ بندہ مارنے کے بعد پورے پندرہ منٹ ادھر کھڑا رہا ہے۔ وہ پولیس سے نہیں ڈرتا بلکہ پولیس اُس سے ڈرتی ہے۔ آج تک نہ جانے کتنی قتل کی ورداتوں میں اندر جا چکا ہے۔ مگر اُسکے کیس میں گواہی دینے کوئی نہیں جاتا۔ اگر کوئی غلطی سے چلا جائے تو یہ اُسکو اسی طرح سیرِ عالمولی مرواتا ہے۔ یہی وجہ ہے آج تک اُسکو کسی کیس میں سزا نہیں ہوئی۔ وہ کبھی جیل نہیں گیا ہے۔ اب بھی پولیس والے آگے نہیں آئے۔ وہ تو کسی نے اوپر سے فون کروایا ہے۔ جسکی وجہ سے پولیس والوں نے مجھے زخمی کو اٹھا کر ایبوی لینس ڈالنے پر منع نہیں کیا ہے۔ ورنہ شاید ہم ساری رات یہیں گھرے رہتے۔“

”جب حکام آگے نہیں آئے تو آپ کو اتنے لوگوں کے الٹ جا کر اُس آدمی کی مدد نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اب اگر قاتل کو یہ بات بُدی لگی اور وہ آپ کے پیچھے لگ گیا تو پھر۔۔۔؟۔۔۔“

فریوڈ کو ہی کیا خود اماں وڈی کو یقین نہ آیا کیا واقعی یہ سوال تاخیر نے کیا ہے۔

وہ لوگ اب سیالکوٹ بائی پاس کے قریب پہنچ رہے تھے۔

فریوڈ نے مُڑ کر دیکھا مگر اندھیرے میں وہ نظر نہیں آئی۔

”کزن صاحبہ آپ کہنا چاہ رہی ہیں۔ قاتل کے ڈر سے مجھے بھی وہاں پر کھڑے ہو کر ایک انسان کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھنا چاہیے تھا۔ یا کم از کم اپنے فون پر وڈیو بناتا؟ الحمد للہ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ اگر وہ قاتل میرے پیچھے آنا چاہتا ہے۔ تو میں کل واپس اسی جگہ آ کر اُسکو دعوت نامہ دیکر جاؤنگا۔ وہ بھی میری اور

آپکی طرح گوشت پوست کا انسان ہی ہے۔ کوئی سہر ہیومن تو نہیں ہے۔ جیسے دوسروں کے جسم کو گولیوں سے چھلنی کیا ہے۔ کل کو کوئی مائی کا لال اسکا بھی کام کر دے گا۔ یہ تو نہیں ہے کہ گولی اسکے جسم میں جانے سے انکار کر دے گی۔ باقی رہنے والی فقط ایک اللہ کی ذات ہے۔ انسان فانی۔۔۔“

”فربود میرے چاند چپ کر جاؤ تمہاری باتیں میری جان لیتی ہیں۔ تمہیں اگر کبھی ہوا بھی سختی سے چھو کر گور جائے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔“

”امی میں صرف بات کر رہا ہوں۔ بدن پہ بارود باندھ کر ٹینک کے نیچے نہیں لیٹ گیا ہوں۔“

”آپ اسکو چپ کروا رہے ہیں۔ یا میرا ہارٹ فیل ہونے کا انتظار ہے۔“

”شمیم نوازش علی سے مخاطب ہوئیں۔ جنہوں نے اُسی فربود کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔

”سیدھے ہو کر بیٹھو بدتمیز انسان پہلے لڑکی کے ساتھ علیک سلیک بنا کر ماں کا دل جلایا اب ایسی اوٹ پٹانگ

گفتگو کر کے اُس کو نئے سرے سے پریشان کر رہے ہو۔ سدھر جاؤ در نہ اپنی گاڑی سے اُتار دوں گا۔“

”سچائی کا تو کوئی خریدار ہی نہیں ہے۔“

”اڈپائی تو اپنی سچائی اپنے کول رکھ۔ سائنو نہیں چاہی دی۔“

وہ مسکراتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ابھی تو گھر پہنچنے پر پنڈورا باکس ایک دفعہ پھر کھلنا ہے۔ عاشی نے تو کل رات ہی مجھے کہہ دیا تھا۔ میرے

بغیر لڑکی دیکھنے جا رہے ہو۔ دیکھ لینا نہ ہی ہونی ہے۔ وہی ہوا۔“

اماں وڈی کے یاد کروانے پر سب ہی ہنسنے لگے۔

گھر آ کر ہوا بھی یہی سبھی اُنکے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گڈ نیوز سننے کو بے تاب مگر جب ادھر سے مرضی

کا جواب نہ ملا تو ساری نو جوان پارٹی نے واسع اور حرا کی شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔

”وڈی اماں آج اور ابھی ڈیٹ فائنل کریں۔ صبح بڑی باجی بھی آ جائیگی۔ بچوں کو کالج وغیرہ سے اُٹھائیاں

ہیں۔ سب آرام سے سارے فنکشن دیکھ سکیں گے۔“

☆.....☆.....☆

زاق قریشی بڑے زبردست موڈ میں گھر واپس آیا تھا۔ اُسکے بچے اور بیوی مٹھلیاں منانے نانی کے گھر گئے ہوئے تھے۔ کھانا وہ آج بھی باہر سے کھا کر آیا تھا۔

باہر کا دروازہ لاک کر کے بڑی مستی میں گنگنا تا ہوا اندر کی جانب آیا۔ مگر وہاں نیم تاریکی میں موجود سائے کو دیکھ کر قدم وہیں جکڑے گئے۔ پہلا شک یہی گورا کوئی ناری مخلوق ہوگی۔ سانس روکے آنکھیں پھاڑ کر سائے کو گھورتا رہا۔

دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ انسان کی اوقات یہی ہے۔ اُسکی کہانی بھی بڑی مختصر ہے۔ رزاق نے ہمت کر کے قدم آگے بڑھائے ساتھ ساتھ اُس سائے پہ بھی نظر رہی۔ جتنی جلد ہی اُس نے سیکھ کا سانس لیا۔ اب فرش پر کوئی سایہ نہیں تھا۔ نظر کھڑکی کی طرف اٹھی وہ اپنی جگہ اچھل گیا۔

کھڑکی میں بیٹھا آدمی کوئی اور نہیں سومرو تھا۔ جو آج ہی رزاق سے بچے خرید کر گیا تھا۔ ابھی تو چند گھنٹے پہلے کی بات تھی۔ رزاق نے بڑی دور تک ٹول فیکس پہ لگے اپنے واقف کاروں سے تسلی لی تھی۔ سومرو کا ٹرک باحفاظت سندھ کی جانب نکل گیا تھا۔ پھر یہ یہاں کیسے تھا۔

رزاق کا ہاتھ اپنے قمیض کے ڈب میں رکھے پٹل کی جانب گیا۔ یہ جانے بغیر کہ بظاہر لا پرواہی سے بیٹھ کر سگریٹ پیتے آدمی نے ترجمہی نظر سے اُسکی اس کارروائی کو دیکھ کر آنکھیں گھمائی تھیں۔

رزاق نے اُس پر پٹل تانا۔ جو کش پہ کش لیتے ہوئے دھواں میں گھرا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ”ان کانپتے ہاتھوں میں بارود نہیں پانی والی بندوق تھا مومن رزاق قصائی۔ اور اُس میں سے چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جاؤ۔“

”تم کون ہو؟۔۔۔“

وہ سگریٹ کا ٹکڑا جالی سے باہر پھینک کر رزاق کی جانب مُڑا۔

”سیدھا سا جواب دوں یا گھما پھرا کر۔۔۔“

رزاق کو خطرے کی بو آ گئی تھی۔ اور یہ احساس بڑی شدت سے رگوں میں بیٹھ گیا وہ اُلو بن گیا ہے۔ یقیناً سومرو بن کر آنے والا آدمی ایک فراڈ تھا۔ وہ تھوڑا آگے بڑھا تو رزاق نے پٹل پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی۔

”آگے مت آنا ورنہ گولی چلا دوں گا۔“

اس بات پر سامنے والے نے پہلے تو بڑی کھینچی سی مسکراہٹ بھینکی تھی۔ پھر نظریں انتہائی سرد ہو گئیں۔
”انتظار کس بات کا ہے۔ تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ سو رہے اگر اپنے باپ کا خون ہے تو چلا گولی۔“

رزاق کا چہرہ اس بات پر سُرخ ہو گیا۔ سیٹھی کیچ بٹا کر رزاق نے نشانہ لیا۔

منگو چیتے کی طرح اُس کے سامنے آیا تھا۔ کمرے میں قائر کی بجائے تھپڑ کی آواز گونجی تھی۔ رزاق کے ہاتھ سے پستل چھوٹ کر کمرے کے دوسرے کونے میں گرا۔ اور وہ شاک کے عالم میں گال پر ہاتھ رکھ کر اُسکو دیکھ رہا تھا۔ جو متوازی چال چلتا ہوا۔ پستل تک گیا۔ نیچے جھک کر ہتھیار کو گرفت میں لیکر اُسکا سیٹھی کیچ دوبارہ لگایا۔ میگزین نکال کر دونوں چیزوں کو کمرے میں موجود میز پر رکھ دیا۔

”رزاق صاحب بیٹھ جائیے۔ کیونکہ جتنا لمبا تیرے کارناموں کا ریکارڈ ہے۔ آج کی رات ہم دونوں کے دکھ سکھ میں گزرے گی۔ چل شایاش شروع ہو جا۔۔۔ رزاق نے گال سے ہاتھ ہٹایا تو چہرے پر چار اُنگلیاں چھپی ہوئی تھیں۔

رزاق ٹرانس میں آگے بڑھ کر بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گیا۔

منگو اُسکے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔

”بول اب تک کتنی بے قصور جانوں کا سودہ کر چکا ہے؟“

”میں صرف وہی مال بیچا ہے۔ جو آج تم نے خریدا ہے۔“

ایک اُلٹے ہاتھ کا لٹیر رزاق کے چودہ طبق روشن کر گیا۔

”چلو میں اپنا سوال بدلتا ہوں۔ بچے کہاں سے لاتے ہو؟“

”میں نہیں جانتا تم کیا پوچھ رہے ہو۔“

”تیرے بچوں کے باپ کا نام نہیں پوچھ رہا ہوں۔ جو تم لا علمی کا ڈرامہ کرو۔ مجھے ابھی کے ابھی ساری

تفصیل کھول کر نہ بتائی تو مجبوراً مقرر وقت سے پہلے تم پر گولی ضائع کرنی پڑے گی۔“

ساتھ ہی اُس نے اپنا گالک نکال کر ہاتھ میں پکڑا جس کی نالی پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔

”تم اگر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرو گے۔ تو میرے لوگ تمہیں ڈھونڈ کر تمہارا اُختر کریں گے۔“
اس لیے مجھ پر سوچ سمجھ کر گولی چلانا۔“

منگو کی سرد نگاہیں مزید بے رحم ہو گئیں۔۔۔ کمرے میں کلک کی آواز اُئی اُس کے بعد رزاق کی بلند ہوتی چنچیں رہ گئیں۔ جب تک رزاق اپنا پیر پکڑے بُری طرح کا پتار دتا رہا۔ منگو نے ایک اور سگریٹ سلگھایا اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر پینے لگا۔ ابھی آدھا ہی ہوا تھا۔ جب باہر پھینک کر ایک دفعہ پھر رزاق کے پاس آیا۔ جو فرش پہ بے حال سا پڑا تھا۔ اُسکا پاؤں ابھی تک بند جوتے میں قید تھا۔ جس میں سے لہو بہہ بہہ کر سارا فرش لال کر چکا تھا۔

”اب چاہو تو اپنے بندوں کو فون کر کے میرے بارے میں بتا سکتے ہو۔ میں ابھی اگلے دس پندرہ منٹ یہیں ہوں۔“

”پلیز ڈاکٹر کو فون کر دو۔ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ میرا خون رُک نہیں رہا میں مر جاؤں گا۔ خُدا کا واسطہ۔۔۔“

ابھی اُسکی بات منہ میں تھی۔ جب جبرے پر کفنے والا نکلا سب بھلا گیا۔
”خبردار جو تم نے مجھے خُدا کا واسطہ دیا۔ خبردار جو تیری ناپاک زبان پر میرے رب کا نام بھی آیا تو۔ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔“

”بتا مجھے۔۔۔ آج تک کتنی ماؤں کی گودا جاڑ چکا ہے؟۔۔۔“
”مجھے یاد نہیں ہے۔ شاید پانچ سو یا چھ سو۔۔۔ بس جان لیا اب مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔“

”اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ جتنا خون نکلے گا بعد میں اتنا ہی نیا بن جاتا ہے۔ مگر جن ماؤں کے بچے تیرے ہاتھ لگے۔ وہ آج تک لاپتا ہیں۔ پہلے اُنکی بات مکمل ہوگی۔ بتا کہاں سے بچے حاصل کرتے ہو؟۔“

”کوئی ایک ذریعہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس بہت سے مختلف راستے ہیں۔ پر ہمارے اڈے پہ زیادہ تر وہ بچے آتے ہیں۔ جو بھیک مانگتے ہیں۔ یا گھروں سے بھاگے ہوتے ہیں۔ کچھ دوسرے صوبوں اور شہروں سے اغوا کئے گئے ہوتے ہیں۔ پھر کچھ بچے ایسے ہیں جو مدرسوں سے بھاگ آتے ہیں۔ کیونکہ اُدھر مولوی لوگ اُنکے

ساتھ یہی کچھ کرتے ہیں۔ اگر وہ گھر جاتے ہیں۔ ڈر کی وجہ سے ماں باپ کو بتا بھی نہیں پاتے کہ قاری کیا کیا سلوک کرتے ہیں۔ گھر والے اُنکا رونا پیٹنا سب نظر انداز کر کے انکو زبردستی مار پیٹ کر کے مدرسہ چھوڑ آتے ہیں۔ پھر وہ بچے موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔“

”ایک قصاب کو پیچھے چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ اور آگے تم جیسے ہزاروں کی تعداد میں منہ کھول دانت نکال کر اُنکی بوٹیاں نوچ کھانے کو تیار بیٹھے ہو۔“

”میں نے آج تک کسی بچے کا ہاتھ نہیں لگایا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟۔ تم میرے معاشرے کا گند ہو گند جس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا پاکستانی کا فرض ہے۔“

”دیکھو تم نے سب جان لیا پوچھ لیا اب مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔“

”کیا تم اُن بے زبان انسان کے بچوں کے کام آئے؟۔۔۔“

”کیا تم نیا ایک ہل کو بھی سوچا اُن سیکڑوں بچوں میں سے ایک بچہ اگر تیرا سگھا بیٹا ہوتا تو اُس کے کتنے دام لیتا۔ اچھا چلو ایک ڈیل شام میں کی تھی ناں ایک ڈیل ابھی کرو۔ میں تمہیں تمہارے بیٹے کا ایک لاکھ دینے کو تیار ہوں۔ بیچتے ہو؟۔۔۔“

”میرے بچے لاوارث نہیں ہیں۔ تو تم اُنکا سودا کرو۔“

”اگر ابھی میں ایک گولی تیرے دل پہ مار دوں۔ تو تیرے بعد تیرے بچے بھی لاوارث ہو جائیں گے۔ کیا پھر انکو خرید سکوں گا؟۔ لعنت ہے تیری سوچ پر بغیرت۔ جو قیم اور بے سہارا ہوں اُنکے لیے اللہ نے تیرے میرے جیسے لوگوں پر فرض کیا ہوا ہے۔ اُنکا خیال کریں۔ اُنکی کفالت کریں۔ اللہ نے تجھے جنکی حفاظت پر معمور کیا تو گدھ بن کر اُنہی کو کھا گیا۔ تجھے ذرا شرمندگی بھی نہیں ہے۔ تو اس معاشرے کا فرد ہے۔ تو نے معاشرے کو بُرائی کی آلودگی سے پاک کرنے کی بجائے بہت زیادہ گند پھیلا دیا ہے۔ جو راہ تو دوسروں کے بچوں کے لیے چُختا آ رہا ہے۔ وہی راہ کل کو تیرے بچے چُھیں گے۔ تب تجھے بڑی تکلیف ہوگی۔ اگر یہ گلیاں بازار، محلے اور شہر کسی غریب نادار کے لیے محفوظ نہ رہے تو یقیناً مان بھی منہ جنکو آج تم دوسروں کے بچے بیچتے ہو۔ کل کو تمہاری آنے

والی نسلوں کو بھی یہی نوح نوح کرکھا بیٹے۔“

”مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا۔۔۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو“

”ڈاکٹروں کے پاس تمہارے مرض کا علاج کہاں۔“

”کیا مطلب ہے؟۔“

”بات یہ ہے۔ تیرے ناپاک خون سے میں اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ تجھے زندہ بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر

اس صورت میں کیا کریں؟۔۔۔“

”تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“

”یہ تم جیسا بندہ ہی جرات کر سکتا تھا۔ اپنے تمام گناہوں کے بعد بھی پوچھ رہے ہو۔ تم نے کیا

کیا۔۔۔؟۔۔۔ انسانیت کے خون سے بڑھ کر بھی کوئی جرم ہوگا۔“

بات کرتے ہوئے منگو نے اپنی جیب سے ایک کیس نکالا۔ جسے کھولا کر ایک بھری ہوئی سرنج برآمد کی بڑے

ماہرانہ انداز میں سوئی کے اوپر سے کور ہٹایا۔ پیچھے سے زور ڈالا جس سے سرنج میں موجود محلول پریشر کے ساتھ

نکلا۔ سیٹ کر کے اُس نے سرنج رزاق کے ہاتھ میں دی۔

”یہ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم میں اتارو۔“

”یہ کیا ہے؟۔۔۔“

”تمہارا علاج۔۔۔ اس میں سولی لیٹر کیمیکل ہے۔ جو پہلے تو تمہارے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز

کرے گا۔ پھر بڑی آہستگی کے ساتھ تمہارے دل کو ختم کرتا جائے گا۔ تمہارے گھر والے دو ہفتوں سے پہلے

واپس نہیں آنے والے۔ گلی محلے والوں کے ساتھ تمہاری بات چیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہذا کوئی بھی تمہاری

غیر موجودگی کو محسوس کر کے بھاگتا ہوا تمہاری تلاش میں نہیں آنے والا۔ بڑے آرام سے یہاں اسی مقام پر لیٹ

کر موت کا انتظار کرنا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں موت کی وجہ ہارٹ ایفیک شو ہونا۔ بھلا تمہاری کہاں کسی کے

ساتھ کوئی دشمنی ہے۔ تم نے تو آج تک کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچائی۔ تمہاری موت کے بعد لوگ اچھے نام سے ہی

یاد کریں گے۔“

سرنج پکڑا ہاتھ بُری طرح سے کانپ رہا تھا۔ ہاتھ پر پہلے سے ہی خون کے دھبے موجود تھے۔ رزاق کا سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ موت سامنے نظر آئی تو اُسکے آنسو نکل آئے۔

”مجھے معاف کر دو۔ میں یہ کام چھوڑ دوں گا۔ آج کے بعد کسی کے بچے کو نہیں پھونکا۔“

منگو کو باتوں میں لگا کر رزاق نے اپنی جانب سے چلا کی دیکھائی۔ سرنج کے ساتھ منگو پر اُچھل کر حملہ آور ہوا۔ مگر وہ آگے سے پوری طرح تیار تھا۔ اُس نے اُس کا وار اُسی پر پلٹتے ہوئے رزاق کا ہاتھ موڑ کر سرنج کا منہ دل کی جانب کیا اور ایک ہی جھٹکے میں سرنج اُس کے دل کے عین اُپر پھوٹ کر دی۔

”میں مرنا نہیں چاہتا ہوں۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔“

رزاق اونچی آواز میں فریاد کرتا رہ گیا۔ اُس کو اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے غافل ہونے میں چھ سات منٹ لگ ہی جانے لگے۔

منگو نے خالی سرنج اُسکے جسم اے نکال کر ایک بیک میں رکھنے کے بعد اپنی جیب میں ڈالی۔ رزاق کی جیب کی تلاشی لیکرفون نکال لیا۔ لینڈ لائن کا سیٹ بھی نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اُس کا ہاسٹل لوڈ کر کے فرش پہ اُسکے قریب رکھ دیا۔ رزاق اب واسطوں پہ اُتر آیا تھا۔ مگر اُسکی آواز کم ہوتی جا رہی تھی۔ سیڑھیوں کے ساتھ لگتی دیوار سے باہر کود کر اندھیرے کا حصہ بن گیا۔ ظلم کی ایک داستان اپنے انجام کو پہنچی۔

☆.....☆.....☆

”حرا باجی کدھر ہو جلدی آؤ۔ اماں وڈی کی جانب سے تمہیں نمٹانے کی تیاریاں شروع کرنے کا حکم ہوا ہے۔“

حرامنہ صاف کرتی واش روم سے برآمد ہوئی۔ اور صائمہ کو گھورا۔

”صبح صبح کیا فضول گوئی کر رہی ہو۔؟۔۔۔“

”فضول گوئی نہیں جناب بڑی اہم اور اندر کی خبر لائی ہوں۔ وڈی اماں نے اُٹھتے ہی آج اپنے سارے بچوں کو میٹنگ روم میں طلب کیا۔ اور وہاں پر حکم صادر کیا ہے۔ اسی ماہ حرا اور قاطمہ کی شادی کر دی جائے گی۔“

حرا تو لیہ سینڈ پر رکھتے ہوئے تعجب کا اظہار کرتے ہوئی۔

”یہ لو بیٹھے بیٹھائے میری شادی کا خیال کدھر سے آ گیا۔ ابھی کل فریوڈ کے لیے لڑکی دیکھنے کے بعد رجیکٹ کر کے آئی ہیں۔ اور آج یہ شوشہ۔۔۔“

”فریوڈ بھائی کے لیے دیکھی جانے والی لڑکی اماں وڈی نے نہیں رجیکٹ کی۔ بلکہ فریوڈ بھائی کی والدہ ماجدہ کو اعزاز جاتا ہے۔ دیکھ لینا بیٹے کے لیے کوئی حور ہی بیاہ کر لائیں گی۔“

”ہاں جی وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔“

حرا نے کہا ہی تھا۔ جب عائشہ اندر داخل ہوتے ہوئے ہوئی۔

”بھابھی تمہیں مبارک ہو۔ اللہ نے تمہاری سُن لی۔ تمہارے لیے بے سجدے اور وظیفے رنگ لے آئے۔ آخر کار اتنے سالوں بعد گھر والوں کو تمہاری رخصتی کا خیال آ ہی گیا۔“

”انسان کی شکل اچھی نہ ہو تو کم از بات ہی اچھی کر لے۔ کب تم نے مجھے رخصتی کروانے کے شوق میں بے سجدے دیتے دیکھا ہے۔“

”ہائے اللہ روز تہجد کے وقت سجدے نہیں تو کیا مراقبہ کرتی ہیں۔“

”تم میرے ہاتھ لگو ذرا پھر میں تمہیں بتاتی ہوں۔ میری خالص عبادت کو مٹھلوک بنا رہی ہو۔“

حرا جو ہاتھ میں لیے عائشہ کی جانب لپکی جو ایک ہی جست میں کمرے سے نکل کر باہر کھڑی ہو گئی۔ زبان پھر بھی نہیں رُکی ہوئی۔

”آپ سے تو واسع بھائی سچے ہیں۔ جیسے ہی انہیں بتایا شادی ملے ہو گئی ہے۔ اُسی وقت دونوں ہاتھ آسمان کو اٹھا کر اللہ کا شکر بجالائے۔“

”میں مان ہی نہیں سکتی واسع نے ایسا کچھ کہا ہوگا۔ ہے تو وہ تمہارا بھائی مگر اللہ کا شکر ہے تم پر بالکل نہیں گیا۔“

”آپ کو میرا یقین نہیں تو براہ راست اپنے شوہر نامدار سے پوچھ لیں۔ واسع بھائی بتائیں ذرا حرا باجی کو آپ کتنے خوش ہیں۔“

واسع کا نام سنتے ہی حرا نے تیزی سے جوتا پھینک دیا۔ اور مڑی تو وہ دونوں ہاتھ کسر پر باندھ کر باری باری حرا کو اور اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا۔ بولا

”خوشی کی بات پر انسان خوش ہی ہوگا۔ اس لیے میں بھی خوش ہوں۔“

”اب بتائیں حرا باجی کیا کہتی ہیں۔؟۔۔۔“

حرا کے گال دھک رہے تھے۔ وہاں سے بھاگنے کی تیاریوں میں تھی۔ جھنجھلا کر بولی۔۔۔

”عاشی تم نے سدا بچہ ہی رہنا ہے۔ یا بڑا ہونے کا بھی کوئی پروگرام ہے۔“

”اس وقت تو گھر میں چھوٹی ہوں۔ ہاں کل کو میرے بھتیجے بھتیجیاں آ جاتے ہیں۔ تو ظاہری بات ہے خود بخود

بڑی ہو جاؤ گی۔“

”مجھے تو تمہارے سدھرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ وڈی اماں سے بات کرتی ہوں۔ وہ مجھ سے پہلے

تمہارا انتظام کریں۔“

”دیکھا باقاعدہ بھا بھی بننے کی ابھی ڈیٹ ہی ملی ہے۔ اور یہ ابھی سے ظالم ثابت ہو رہی ہے۔ واسع بھائی

سوچ لو بڑی نگڑی بیوی ملی ہے۔“

”سوچنے سمجھنے کا سٹیج بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اب تو سیدھا تخت یا تختہ ہوگا۔ کیوں نیگم صاحبہ؟“

واسع کے سوال پر حرا نے اپنی جادو گر لٹکا ہیں اٹھا کر ایک دفعہ واسع کی نظروں میں دیکھا اور وہاں سے کھسک

گئی۔ واسع کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رہ گئی۔ جسے پیچھے سے آئے فریود نے نشانہ بنایا۔

”اتنا جو مسکرا رہے ہو۔ کیا کمینہ پن ہے جو چھپا رہے ہو؟۔“

عاشی ہنستی چلی گئی۔ جبکہ واسع نے شرمندہ ہوئے بغیر فریود کے کندھے پہ ہاتھ جھڑا۔۔۔

”ٹھجھ سے زیادہ کوئی کیا کمینہ پن دیکھائے گا۔ ایک دل میں رہتی ہے۔ پھر بھی کس دیدہ دلیری سے رشتے

دیکھنے جاتے ہو۔“

”کون کون کون واسع بھائی جلدی بتائیں۔ فریود بھائی کے دل میں کون رہتی ہے۔“

فریود نے سر پیٹ لیا۔ واسع کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو لگاؤ اب میرا تماشا یہی کسر رہ گئی ہے۔“

”ہتائیں بھی واسع بھائی۔۔۔“

عائشہ پوری طرح بے صبری ہو رہی تھی۔ واسع نے بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”صاحبزادے کو ایک گوری پسند ہے۔“

”دیکھا مجھے پتا تھا۔ ہوئی نہیں سکتا فرود بھائی کسی لڑکی کے دم چھلے کے بغیر امریکہ سے لوٹ کر آتے۔ کتنے

فرما بردار بیٹے بنے گھوم رہے ہیں۔“

”کیا مطلب فرما بردار بنا گھوم رہا ہوں۔ میں فرما بردار ہوں۔ تبھی تو اماں کی مرضی کی لڑکی دیکھنے جاتا

ہوں۔ آئی بڑی۔۔۔“

”اچھا تو وہ گوری کا کیا بنے گا۔“

”اُس کا کیا بنتا ہے؟“

واسع بولا

”اُس کو بھی کوئی مل جائے گا۔ دل جگرے والا جو اپنی ماں سے نہ ڈرتا ہوگا۔“

”لعنت ہے تیرے جیسے بھائی پر کیا بکواس کر رہا ہے؟۔۔۔“

”آپ لوگ لڑو۔ میں جا کر سب کو یہ نئی خبر دیتی ہوں۔ اگر وڈی اماں اور چچی کو گوری پسند آگئی تو کیا پتا واسع

بھائی کے ساتھ ہی آپکی شادی بھی ہو جائے۔“

اس سے پہلے کہ وہ دونوں اُس کو روکتے۔ وہ تیز کام ٹرین کی طرح بھاگ گئی۔

فرود نے شرمندہ کرتی نظروں سے واسع کو دیکھا۔

”مجھے گھورنے کی بجائے میرا احسان مانو۔ تمہارا اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔“

”مسئلہ حل نہیں کیا بڑھایا ہے۔ اب میری ماں نے میری گتے والی کرنی ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟ کوئی نئی بات ہے۔“

”شاباش ہے۔ پر مجھے تمہارے چھوڑے گئے اس شوشے سے کوئی فائدہ ملتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ اُلٹا نقصان

ہونا ہے۔ امی نے مزید ایمر جنسی نافذ کر دینی ہے۔“

دونوں چلتے ہوئے باہر کوچل پڑے۔ فریود کی نظر تاشفہ پہ پڑی جوتل کے پاس بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔
ماٹھے پہ تیوری لیے بولا۔

”ایک تو یہ لڑکی جب دیکھو کوئی نہ کوئی کام ہی کرتی ہوتی ہے۔ کبھی فارغ کیوں نہیں ہوتی؟“
واسع نے بھی گردن موڑ کر اُس جانب دیکھا اور بولا۔

”ابھی پوچھ لیتے ہیں۔“
اگلے پل اونچی آواز میں کہا۔

”تاشفہ بہن یہ اپنا فریود جاننا چاہ رہا ہے۔ تم ہر وقت کام کام کام ہی کیوں کرتی ہو؟“

جواب میں تاشفہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ اور واسع کے سوال پر فریود کو خطرناک گھوری سے نواز کر واپس
کپڑوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔

فریودناک چڑھاتے ہوئے بد مزگی سے بولا۔

”یار یہ مجھے ہی کیوں گھورتی ہے؟۔۔۔“

واسع کا تہقہ بے اختیار تھا۔ جس کے جواب میں فریود نے اُسکو گھوری سے نوازا۔۔۔

☆.....☆.....☆

”واہ اڈ شہزادے زبردست چھا گئے ہو۔ یہ نئی والی ساری وڈ پوز کروڑوں میں جانی ہیں۔ جو جو تم نے کہا
سب پر عمل کیا ہے۔“

کیمرہ مین گلزار نے کیمرے کا میموری کارڈ نکال کر موتی کے آگے رکھتے ہوئے پُر جوش آواز میں کہا تھا۔
موتی آج بھی اپنی تیل لگی زلفوں اور واڑھی میں سرے والی آنکھوں کے ساتھ انتہائی پُر اسرار لگ رہا تھا۔ اُس
کے ہاتھ تیز رفتاری سے کی بورڈ پر ناچ رہے تھے۔

میموری کارڈ کو پی سی میں ڈالتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔
”آج نیچے سے اتنی رونے کی آوازیں کیوں آرہی تھیں۔“

”کچھ نہیں یار وہی روز کے ڈرامے آج بھی کوئی نیا لڑکا ہاتھ لگا تھا۔ اُسی نے سارا تہہ خانہ سر پہ اٹھائے رکھا۔ سالے کو دو دن بعد دیکھنا پیسہ آتے ہی سارا کچھ بھول جائے گا۔“

”تم کتنے سال سے یہاں پر کیمرو مین ہو؟۔۔۔“

”پہلے میں کیمرو مین نہیں تھا۔ یہ تو ڈاکٹر ضمیم نے مجھے ایک دودھ کیمرو تھمایا۔ پھر مجھے خود شوق ہو گیا۔“

موتی کی نظریں سکرین پر تھیں۔ ماتھے پہ ہلکی سی تیوری۔۔۔ آنکھوں میں مکمل سنجیدگی

”تو میری طرح تم بھی یہ کام شوقیہ طور پر کر رہے ہو؟۔“

”یار موتی لعنت بھیج ایسے شوق پر یار میں تو مجبوری میں ادھر پھنسا ہوا ہوں۔ تو اپنا یار ہے۔ تجھ سے کیا ٹھکانا۔ میرے بھائی پر قتل کا الزام لگ گیا تھا۔ یار ہم غریب لوگ نہ تو پولیس کو دینے کے لیے اندھا پیسہ نہ عدالتی کاروائی میں پورے آسکتے تھے۔ ہمارا کیس اس قدر کمزور تھا۔ میرے ایک دوست نے مجھے وسیم بھائی سے ملوایا۔ کہا اگر تو انکے کام آجائے تو یہ تیری مدد کر سکتے ہیں۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی۔ بلکہ وسیم نے اسٹام پیپر پر دستخط لے لیے۔ ہماری جانے بلا یہ پڑھے لکھے دو نمبر لوگ دل کے کس قدر کالے ہیں۔ میں حرف شناس تو تھا مگر تبت مت ماری گئی تھی۔ میں نے یہ نہیں پڑھا کہ وہ میرے سائن کروا کس شرط پر رہا ہے۔ کچھ اُس وقت میری ماں کے دن رات کے رونے گھر کی ٹینشن ہر چیز نے مل کر دماغ خالی کر دیا تھا۔ پر سائن کرنے کی دیر تھی۔ نہ جانے کیسے اور کیوں اگلی بیٹھی پر ہی میرا بھائی جیل سے باہر تھا۔ اور جانتے ہوا اسکی قیمت مجھے کیا دینی پڑی؟۔۔۔

میں زندگی بھر کے لیے ان دونوں بھائیوں کا غلام ہوں۔ نہ میں یہاں سے کام چھوڑ کر جاسکتا ہوں۔ نہ انکے کسی حکم کو پورا کرنے سے انکار کر سکتا ہوں۔ مجھے عید کے دو دن گھر جانے کی اجازت ہے۔ ورنہ میں یہاں سے زندہ نہیں نکل سکتا۔ شروع شروع میں جب ان دونوں بھائیوں کی اصلیت میرے سامنے آئی یقین مان دو دن تک کھانا نہ کھایا گیا۔ اور یہاں پر نیلام ہونے والی معصوم آہیں اور سسکیاں راتوں کو مرنے نہ دیتی تھیں۔ میں ساری ساری رات جاگ کر گوار دیتا۔ دن کو یہ لوگ ایک گھڑی فارغ نہ بیٹھنے دیتے۔“

”تمہارے گھر والوں نے تمہیں یہاں سے لیجانے کی کوشش نہیں کی؟۔۔۔“

گھوار کے چہرے پہ تاریک سایہ گورا۔۔۔

”یہ لوگ ہماری سوچ سے بھی زیادہ بچے ہیں۔ یہاں کام کرنے والا ہر فرد کسی نہ کسی مقام پر مجبور ہے۔ شروع میں میرے بھائی باپ نے مجھے واپس لیکر جانے کی ضد کی پر اُنکو میرے بھتیجے کے حوالے سے دھمکیاں دیکر ایسا خوفزدہ کیا گیا تھا۔ آج تک اُنکی دوبارہ ہمت نہیں پڑی اس طرف آنے کی۔ یہ لوگ بہت زیادہ طاقتور ہیں۔ پولیس اُنکے ساتھ ہے۔ ایک وہ حرام زادہ ایس ایچ او ہے۔ سرفراز احمد آج کل سنسنے میں آیا ہے۔ کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ یا پھر کسی ایجنسی کی نظر میں آ گیا ہے۔ چار دن پہلے ایس ایچ او کے گھر پر فائرنگ کے واقع میں ہم ان لوگوں کے چار پانچ بندے مارے گئے ہیں۔ وسیم بھی بڑی بُری طرح زخمی ہوا تھا۔“

موتی اپنا کام چھوڑ کر حیرت سے گلزار کو سُن رہا تھا۔ بولا

”ایس ایچ او کا اُنکے ساتھ کیا لین دین؟ اور اگر وہ روپوش ہے۔ تو اُنکے گھر پر اُنکے بندے کس نے مارے ہیں؟۔۔۔“

گلزار نے ایک احتیاط کے طور پر کمرے سے نکل کر ادھر ادھر کا ریڈور میں نظر دوڑائی پھر آ کر اپنی جگہ پر ٹنگ گیا۔ ”پیارے یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔ میرے ساتھ تو یہ سب باتیں اور سوال کر رہے ہو۔ کسی اور پر اعتماد کر کے اپنی موت کا سامان مت بنانا۔ ایس ایچ او جیسے بندے کو کیا پتا انہوں نے خود ہی لڑھکا دیا ہو۔ وہ تھا بھی کوئی بُری نسل کے گتے کا بچہ۔“

”کون؟۔۔۔“

”وہی یار ایس ایچ او سرفراز احمد۔۔۔ ایک نمبر کا بے غیرت۔۔۔“

”کیا وہ بھی یہی کام کرتا ہے؟۔“

”وہ بچے ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرواتا ہے۔ اُنکا بڑا اہم رُکن ہے۔ سارے ملک میں جہاں سے بچے اغوا ہو۔ اُسی کے گارڈ میں ادھر ادھر جاتا ہے۔ ادھر سے افغانستان میں بھی سپلائی کرتا ہے۔ پھر وہاں سے ادھر ایک ایک پھیرے کا کروڑ وکھاتا ہے۔ یار ایک بات میں جان گیا ہوں۔“

”وہ کیا؟۔۔۔“

گلزار نے موتی کے ہاتھ میں بُجھتا ہوا سگریٹ پکڑ کر بڑے بڑے دو چار کش لگائے۔ اور دھواں اُڑاتے

”رب بھی امیروں کا ہی ساتھ دیتا ہے۔ یار یہ لوگ اتنا اتنا بڑا گناہ کمار ہے ہیں۔ پھر بھی ان پر اللہ کا عذاب نہیں آتا۔ ایک غریب آدمی ہے۔ گلی میں کہیں سائیکل چوری کرتا پکڑا جائے۔ لوگ اُسکو مار مار کر شکل بگاڑ دیتے ہیں۔ ایسے ایسے لوگ بھی اُسکو مکے دھمو کے جھڑ رہے ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگی میں مکھی تک نہ ماری ہو۔ اور دوسری جانب ڈاکٹر اور ایس ایچ او جیسے لوگ ہیں۔ جو اس معاشرے کی جڑوں میں پانی ڈال گئے۔ نسلوں کو روگی کر دیا۔ پر آج بھی ہمارے لوگ انہی کو عزت اور تکریم سے دیکھتے ہیں۔ انکو گاڑیوں میں جاتا دیکھ کھڑے ہو کر سلام کرتے ہیں۔ انکے جوتے سیدھے کرتے ہیں۔ چھوڑ یار میں بھی کیا بکواس کر رہا ہوں۔ میں خود بھی تو یہ سب کر رہا ہوں۔ پر یار میرے بس میں نہیں ہے۔ ورنہ میں ان میں سے ایک آدھ کی جان تو لے ہی لیتا۔ پر مجھے علم ہے۔ اگر میں نے ایسی کوئی کوشش بھی کی تو یہ لوگ میرے گھر والوں کو جیل کوڑوں کے آگے ڈال دیں گے۔ پر قیامت والے دن میں نے اللہ سے یہ ضرور پوچھنا ہے۔ اختیار ایسے ظالموں کے ہاتھ کیوں دیا؟“

ایک سایہ دروازے سے کچھ دور رک گیا تھا۔

موتی نے تیزی سے گھڑا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بات بدل دی۔

”گھڑا از مجھے ڈاکٹر نعیم کی شخصیت بڑی جاندار لگتی ہے۔ میں نے آج تک اُن کے ساتھ براہ راست ملاقات نہیں کی۔ مگر میرا خواب ہے۔ اگر ایسا ہو جائے۔ میں تو خوشی سے مرنے والا ہو جاؤں گا۔“

گھڑا سمجھ گیا تھا۔ کوئی اُنکی بات سن رہا ہے۔ وہ بھی اُسی انداز میں بولا۔

”ہاں یار ڈاکٹر صاحب اپنی مثال آپ ہیں۔ غریب دوست انسان ہیں۔ ورنہ جتنی تنخواہ ہمیں یہاں پر مل رہی ہے۔ اتنی تو گورنمنٹ سیکٹر میں بھی نہ ملتی۔ میں تو دن رات ڈاکٹر صاحب کی صحت و تندرستی کی دُعا مانگتا ہوں۔“

”چل اب بس کر دے۔ دو نمبر مرید باہر جو بھی کوئی تھا۔ اب چلا گیا ہے۔“

موتی کے بتانے پر گھڑا ہنستے ہوئے مزید بولا۔۔۔

”نہیں پاپے مجھے کہہ لینے دے۔ میرا دل کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو روز کے روز ہار ڈالوں۔ پھولوں کے

نہیں جو توں کے۔ اللہ کرے اس کو یزید جیسی موت آئے۔ فرعون جیسا زوال آئے۔“

”مجھے اتنے دن ہو گئے ادھر آتے جاتے مجھے تو کبھی محسوس نہیں ہوا تم اندر سے اتنے دکھی ہو۔ بلکہ تم پر تو وسیم کو سب سے زیادہ اعتماد ہے۔“

”اعتماد بنایا ہے۔ اب اگر کام ہی یہی کرنا ہے۔ تو مر مر کر کرنے کی بجائے ہنس کھیل کر کر لینا بہتر ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے۔ جب سے انکو میری وفاداری کا یقین ہو گیا ہے۔ تنخواہ زیادہ ہو گئی ہے۔ میں اپنی خواہشیں مار کر جی رہا ہوں۔ تو کم از کم میرا خاندان تو عیش کرے۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا یار میں نکلتا ہوں۔ یہ کارڈ میں گھر لے جا رہا ہوں۔ اپنی لیپ ٹاپ سے ساری وڈیوز اپ لوڈ کر دوں گا۔“

”نہیں موتی تم کارڈ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اس کو ادھر ہی چھوڑ جاؤ۔ جو کام رہ گیا ہے۔ وہ کل آ کر کر لینا۔“

”کیا تمہیں میرے پر اعتماد نہیں ہے۔؟۔۔۔“

”بکواس نہ کر موتی بات اعتماد کی نہیں اصول کی ہے۔ کوئی بھی مواد گھر لیکر جانا اصول کی خلاف ورزی ہے۔“

”او کے چھوٹے ہاس مگر میں تو پہلے بھی کچھ کام گھر جا کر کرتا رہا ہوں۔“

”وہ پرائیویٹ ویڈیوز کو ایڈیٹ کرنے کا کام تھا۔ کہیں غم بھی ہو جاتا تو کوئی نقصان نہ ہوتا۔ ہم اپنا پیسہ وصول کر چکے تھے۔ مگر یہ نئی فائلز ہیں۔ جب تک آن لائن اپنا پیسہ وصول نہیں ہو جاتا۔ یہ انتہائی اہم ہیں۔“

”گھڑا تو بھی دو فلائی ہے۔ کچھ دیر پہلے جھکو کوس رہا تھا۔ ابھی انہی کے مال کی حفاظت کر رہا ہے۔“

”وہ تو موتی تو بھی کر رہا ہے۔ دن رات لگا کر ٹو نے نئے گا بک ڈھونڈے ہیں۔ صرف امریکہ میں کا ہی بزنس تین گنا بڑھ گیا ہے۔“

”یار جتنی دفعہ نیا گا بک آتا ہے یہ میری تنخواہ میں بیس ہزار کا اضافہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں تو خود ہی سمجھدار ہے۔ جب فائدہ مجھے ملے گا۔ کام تو کرنا ہی ہے۔ اچھا اب میں جا رہا ہوں۔ اللہ حافظ تو کمرہ لاک کر لینا“

موتی نکل گیا۔ گھڑا نے ایک دو وڈیو دیکھیں۔ اور کمرہ لاک کر کے اپنی رہائش کی جانب چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

”آپ ہمیں یہاں اس قید خانے میں چھوڑ کر یوں غائب کیوں ہوئے؟۔۔۔“

”مجھے کام تھا۔“

مریم نے جتنے غصے میں سوال کیا جواب اُتنا ہی تحمل سے دیا گیا۔

”مجھے ابھی اسی وقت اس جگہ سے جانا ہے۔ مزید ایک پل بھی ادھر نہیں رہوں گی۔“

”وجہ جان سکتا ہوں؟۔۔۔“

”جی ضرور۔۔۔ سب سے بڑی وجہ یہ آدمی منیر نیازی جو ہر وقت سر پہ سوار رہتا ہے۔“

”اُس کا نام منیر نیازی نہیں منیر مدثر ہے۔“

”ہاں جو بھی ہے۔“

”تم بد تمیز کیوں ہو؟۔۔۔“

”میں بد تمیز نہیں ہوں۔ میں غصے میں ہوں۔ بے بس ہوں۔ مجھے اپنی ماں یاد آتی ہے۔ اور میرے بھائی کو سوائے کھانے کے اور کسی کام میں کشش محسوس نہیں ہو رہی۔ جی بھر کر کھاتا ہے۔ پھر وہیں صوفے پر گیمز کھیلتے کھیلتے سو جاتا ہے۔ جب مزید لینے رہنا ممکن نہ رہے اُٹھ کر باتھ روم جاتا ہے۔ اور دوبارہ سے وہی عمل دہراتا ہے۔ ایسے میں مجھے کیا بہت خوش ہونا چاہیے؟۔۔۔“

منگو نے ایک نظر ارسلان پر ڈالی جو اس وقت بھی رس ملائی کا باؤل پکڑے بیٹھا تھا۔ پھر دوبارہ فوکس اُس پانچ فٹ کی دادی اماں پر آیا۔

”تماری امی کی تدفین ہو چکی ہے۔“

مریم کا روشن چہرہ لمحوں میں تاریک ہو گیا۔ آنکھیں بھرا آئیں۔

”ایسے کیسے امی کی تدفین کر دی۔ میں نے تو اُن کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ میری ماں تو چھین ہی لی تھی۔ ظالمون مجھے آخری دفعہ اُنکو جی بھر کر دیکھ تو لینے دیتے۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں روکے گا۔ میں یہاں ایک سیکنڈ نہیں رُکوں گی۔“

زار و قطار روتے ہوئے مریم ہال کے مین دروازے کی جانب بڑھی۔ منگو اور منیر کی آنکھ ملی۔ منیر نے سر

اثبات میں ہلاتے ہوئے۔ اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ پر کچھ کیز دبائیں۔ کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ اندر سے لاک ہو گیا۔

مریم نے دروازہ کھولنے کی پوری کوشش کی آخر پہ لاتے گھونے تک مار دیئے۔ مگر دروازہ نہ کھلا۔ تھک کر وہیں فرش پہ گھٹنوں میں سر دیکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کتنی دیر تک اُس کپاؤنڈ میں مریم کے سسکیاں گھونجتی رہیں۔

جب سسکیاں تقریباً دم توڑ گئیں۔ منگو نے فریج سے پانی والی بوتل لی اور ٹشو کا ڈبہ لیکر اُسکے برابر آ بیٹھا۔
”یہ پانی لی لو۔“

مریم نے کچھ کہے بغیر پانی قحام لیا۔ مگر فوراً سے پیا نہیں۔ چہرہ صاف کرنے کے بعد ہاتھ میں پکڑی بوتل کے منہ پر انگلی پھیرتے ہوئے آنسوؤں سے ڈھلی آواز میں بولی۔۔۔
”منگو جو کچھ میرے خاندان کے ساتھ ہوا ہے۔ اسکے پیچھے کیا وجہ ہے؟۔۔۔“
”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”آپ کو سب خبر ہے۔ پلیز مجھے بتادیں۔ میری ماں کی جان کیوں لی گئی۔ اُنہوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ قصور وار تو میرا باپ ہے۔“
منگو نے چونک کر مریم کی جانب دیکھا۔

”امی کو ماموں نے بتایا تھا۔ ابو کا اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک دفعہ کسی اغوا کے کیس میں ابو کا نام لیا جا رہا تھا۔ امی نے بہت لڑائی کی۔ تب ابو نے وعدہ کیا وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے ہیں۔ جس سے خاندان کی عزت پر کوئی حرف آئے۔“

منگو کو سمجھ نہ آئی یہاں وہ کن الفاظ کا استعمال کرے آیا اس لڑکی کو تسلی دے کہ تمہارا باپ نیک آدمی ہی ہے۔ اُس نے تم لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ قانون کی ٹوپی پہن کر وردائیں نہیں کرتا تھا۔ تم جو بھی سوچ رہی ہو۔ سب غلط ہے۔ یا سیدھے سے سارا کج بتا دئے۔

گہرا سانس کھینچ کر رہ گیا۔ ویسے بھی آج کل پے در پے ایسے انکشافات سامنے آرہے تھے۔ اُسکی ٹیم کا

ہر آدمی اپنی جگہ دنگ تھا۔

”تم اگر چاہو تو میں تمہیں تمہاری والدہ کی قبر پر لے جاسکتا ہوں۔“

”پلیز مجھے لے جائیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہوں گی اُنکو کہاں دفنایا گیا ہے جنازے میں کون

کون شریک ہوا۔ کیا کسی نے ہم بہن بھائی کے بارے میں نہیں پوچھا۔“

”جنازہ تمہارے ماموں کے گھر سے اُٹھا ہے۔ ساری رسومات اُنہوں نے ہی کی ہیں۔ فی الحال تم لوگوں کی

گم ہڈی سب کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ میں نے تمہارے ماموں کو سچ بتانے کے ساتھ ہی

خاموش رہنے کی سخت ہدایت کی ہے۔“

”کیا میں اپنے ماموں کے گھر جاسکتی ہوں؟۔۔۔“

”نہیں۔۔۔“

منگو کا لہجہ قطعی تھا۔ اپنی بات کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اُسکے موبائل پر پیج آر ہے تھے۔ جبکہ مریم ضدی انداز

میں بولی

”کیوں نہیں؟۔۔۔“

”یہ سوال کر کے تم مجھے حیران کر گئی ہو۔ ابھی تک میں تمہیں بڑی سیانی سمجھ رہا ہوں۔ اس وقت تمہارا لاپتہ

رہنا ہی تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔“

”ہم کب تک ایسے ٹھپ کر بیٹھیں گے؟۔“

وہ مریم کے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ ماتھے پہ سلوٹوں کا جال تھا۔ منیر کی سوالیہ نظریں اُس پر جمی ہوئی

تھیں۔ وہ چلتا ہوا منیر کے پاس گیا اور فون کی سکرین اُسکے سامنے کر دی۔

جسے دیکھ کر منیر کے منہ سے گالی نکلتے نکلتے رہ گئی۔

”یہ کیا مصیبت ہے سر؟۔۔۔ ساری زندگی حرام کام کرنے کے بعد کیا اس بے غیرت نے موت بھی حرام کی

قبول کرنی ہے۔“

”اگر میرے وہاں پہنچنے تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو چکا ہو تو میں پوچھنا نہیں بھولو۔۔۔“

اُس کی نظر ارسلان کے ہاتھ میں پکڑے فون پڑی تو اپنی بات درمیان میں چھوڑ کر تن فون کرتا اُسکے سر پر پہنچا۔

”یہ کس کا فون ہے؟۔۔۔“

ارسلان اُسکی آواز میں اُچھے غصے پر ذرا سا گھبرا یا۔

”یہ۔۔۔ یہ میرا فون ہے۔ ابو نے پچھلے سال دلوا یا تھا۔“

”کیا تم نے اس فون کو اس گھر میں استعمال کیا ہے؟ کسی کو کال کی ہے؟ یا کسی کی کال سنی ہے؟۔“

”نہیں فون میں کال کرنے کے پیسے نہیں ہیں۔ بس کالٹر سیو کی ہیں۔“

”کس کی کالٹر؟۔۔۔“

”ابو کے دوست کی۔۔۔“

منیر نے اُسکو درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”یہ سوال اب فضول ہے۔“

ساتھ ہی منیر نے سی سی ٹی وی سکرینز کی جانب اشارہ کیا۔ باہر گلی اوپر چھت اور گھر کے پچھلے جانب گلی میں لگے کیمروں میں جو منظر نظر آ رہے تھے۔ اُن کے مطابق اُنکا گھر اس وقت پورے طور پر پولیس کے گھیرے میں تھا۔

منگو نے رکھ کر ایک تھپڑ ارسلان نے گال پر جڑا۔ پاگل دے پھر کس باپ کے ساتھ باتیں کرتے رہے ہو؟۔“

ارسلان نے گال پر ہاتھ رکھ کر منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔۔۔

”صرف ڈاکٹر نعیم سے ہی بات کی تھی۔ وہ تو ابو کے بیسٹ فرینڈ ہیں۔“

”وہ بے غیرت انسان تمہاری ماں کا قاتل ہے۔ تمہاری بہن بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ سوائے کھانے کے تمہیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ مرداب ادھر باہر ہر طرف تمہارے رشتے دار آچکے ہیں۔ آگے سے نکلو تب بھی مرد گے۔ پچھلا رستہ اگلے والے سے بھی آسان ٹارگٹ ہے۔“

اُس نے فون زمین پر پھینک کر اپنی جوتے کی بھاری ہیل کے ساتھ دو چار ضربوں میں فون توڑ دیا۔

منیر نے اپنا سر ہی پیٹ لیا۔ جھنجھلا کر بولا۔

”موٹے چار دن سے مجھے عیاشی کروارہا ہوں۔ اُسکا صلہ تم نے یہ دیا۔“

”مجھے کیا علم تھا وہ دشمن ہے۔ اور یہ کونسا کوئی ایکشن قلم چل رہی ہے۔ جہاں ویلن فٹ سے نمبر ٹریس

کروالے۔ اور ویلن کے پاس اتنی جدید ٹیکنالوجی کہاں سے آئی ہے۔“

”وہ تیرا ماما بڑی دور تک رسائی رکھتا ہے۔ تم نے اُسکو کیا بتایا تھا۔“

”وہی جو سچ ہے۔“

”سچ کیا ہے؟“

”یہی کہ آپ ایک سیکریٹ ایجنٹ ہو۔ آپکا نام منگو ہے۔ آپ نے ہماری جان بچائی ہے۔ آپ ابو کے آدمی

ہیں۔“

”دل تو کر رہا ہے۔ اُلٹے ہاتھ کی ایک اور لگاؤ۔ کیا یہ ہمیشہ سے ایسا ہی پاگل ہے؟۔۔۔“

مریم جو اپنا رونا دھونا بھول کر آنکھیں پھاڑے سکرین کے شیشوں پر نظر آتے باوردی جوانوں کو دیکھ رہی

تھی۔ منگو نے اُسکا اُڑتا ہوا رنگ دیکھ کر ماحول کو بڑے مزاح رکھنے کی کوشش میں پوچھا تھا۔

مگر مریم نے جواب دینے کی بجائے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”اتنی ساری پولیس ہمارے پیچھے کیوں آئی ہے؟ ہم نے کون سے جرم کئے ہیں۔ اگر قسمت میں گولی ہی لکھی

ہے۔ تو ہمیں اُس دن ہمارے اپنے گھر میں ہی مر جانے دیا ہوتا۔ یہاں آج پرانی دہلیز پر تو نہ مرتے۔“

منیر نے آنکھیں گھمائیں۔

”سرا ایک بات تو میں گارنٹی کے ساتھ کہنے کو تیار ہوں۔ یہ لڑکی انڈیا ڈرامے بہت دیکھتی ہوگی۔“

”بھائی منیر نیازی موت دروازے پہ کھڑی ہے۔ اور آپکو ہری ہری سو جھڑی ہیں۔“

ارسلان کی بات پر منیر نے اُسکی گردن پر ایک ہاتھ جھڑا۔

”سارا تیرا قصور ہے۔“

”منیر یا تم ہی عقل کو بہن بولو۔“

”سوری سران لوگوں کے ساتھ ہر وقت کی بحث نے مجھے فضول گوئی کا عادی بنا دیا ہے۔“

”ہاں جی نظر آرہا ہے۔ چلو اب نکلنے کی کرو۔“

”ہر کوئی اپنی ہی بولی بولے جارہا ہے۔ کوئی میری بھی سن لو۔ میں ہرگز باہر نہیں جاؤ۔۔۔“

گولیوں کی برسات نے مریم کو خاموش کروادیا۔

باہر سے ہیوی فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ جیسے میدان جنگ لگا ہو۔ مریم اور ارسلان اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ کر فرنیچر کے پیچھے ٹھپ گئے۔ مگر منگو اور ارسلان جانتے تھے۔ یہ گھبرائٹ پروف تھا۔ باہر والے جتنی مرضی کوشش کر لیتے گولی دیوار، کھڑکی یا دروازے سے اندر نہیں آتی تھی۔

منگو نے منیر کو اشارے میں کچھ پوچھا۔ جس کے جواب میں اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے مین بیڈروم میں گئے۔ الماری کے سب سے نچلے خانے میں سے پیڑول کی بوتلیں نکال کر منگو باہر آیا۔ جبکہ منیر اپنے سارے ایپ ٹاپ ’ٹیب‘ فون وغیرہ ایک بیگ میں ڈال رہا تھا۔ منگو نے گیس بند کی مین سوئچ سے بجلی بند کی۔ پیڑول کی بوتلیں کھول کر سارے فرنیچر دروازوں پر چھڑک دیا۔

مریم حیرت سے اُس کا عمل دیکھ رہی تھی۔ چہرہ خوف سے سفید پڑ رہا تھا۔ ارسلان تو باقاعدہ رو رہا تھا۔ مگر وہ دونوں مشینی انداز میں اپنے کام میں مصروف رہے۔

اب باہر دروازوں کو توڑنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ شور تیز ہوتا جا رہا تھا۔ موت قریب سے قریب آرہی تھی۔ منگو نے مریم اور ارسلان کو بازو سے پکڑا اور بیڈروم کی جانب لے گیا۔

”منگو میں جل کر مرنا نہیں چاہتی ہوں۔ یہاں ہر طرف پیڑول کی بو ہے۔ اگر باہر سے ایک بھی گولی اندر گھس آئی۔ یہ گھر دھماکے سے پھٹ جائے گا۔“

”فکر نہ کرو ایسا کچھ بھی ہونے سے پہلے ہم یہاں سے جا چکے ہونگے۔“

کمرے میں مریم اور ارسلان کے لیے ایک اور حیرت کا سامان موجود تھا۔

منیر نے بیڈا پر کوکھڑا کیا ہوا تھا۔ جو کے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا۔ بیڈلو ہے کے بڑے بڑے پائپ ملا کر بنایا گیا تھا۔ جسکو ریموٹ کی مدد سے اوپر اٹھایا گیا تھا۔

بیڈ کے نیچے کی جگہ سے کارپٹ ہٹا کر ایک لوہے کا دروازہ کھولا گیا تھا۔

منیر نے پہلے اپنا بیک پیک اُس دروازے سے نیچے پھینکا۔ پھر خود کود گیا۔ منگو نے ٹارچ جلا کر نیچے ماری
منیر بیک کندھے پہ ڈالنے کے بعد اپنی ٹارچ جلا رہا تھا۔

”کلیئر۔۔۔؟۔۔۔“

منگو کے پوچھنے پر منیر نے لیس سرکہہ کر گرین سگنل دیا۔

منگو ارسلان کی جانب مڑا۔

”اب تمہاری باری ہے۔“

”میں نہیں کو درہا۔ نہ جانے کتنی گہرائی ہو۔ میری ٹانگہ واگ ٹوٹ گئی تو پھر؟ نیچے چو ہے سانپ اور بچھو
وغیرہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

باہر سے آنے والی آوازوں سے صاف پتا لگ رہا تھا۔ وہ لوگ آری کی مدد سے لاک کاٹ رہے تھے۔
جسکا مطلب یہی تھا۔ سات آٹھ منٹ میں وہ لوگ گھر کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور
اس سے زیادہ وقت اُنکو یہاں سے محفوظ مقام پہ جانے کے لیے درکار تھا۔

منگو نے ارسلان کو اٹھایا اور اُسکے لاکھ واڈا کرنے کے باوجود نیچے گڑھے میں اُتار دیا۔

ارسلان چیخ رہا تھا۔ جس پہ منیر نے اُسکے منہ پر ٹیپ لگا کر اُسکی بولتی بند کی۔

منگو نے مریم کی طرف دیکھا۔

جواپنے آنسو ہتھیلی کی پٹت کے ساتھ صاف کر کے آگے بڑھی۔ ہاتھیں نیچے کو لٹکائیں پھر چھلانگ ماری۔
باہر کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اب گھر کے اندر سے جوتوں کی آواز آرہی تھی۔

منگو نے جیب میں سے گریڈ برآمد کیا۔ اُسکی پن نکال کر پورے زور سے باہر کی جانب پھینکا۔ خود گڑھے
میں کود کر اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا۔

گڑھے میں روشنی صرف اُسکی ٹارچ کی ہی تھی۔ منیر پہلے ہی ارسلان اور مریم کو لیکر آگے جا چکا تھا۔

ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ جب اپنے سر کے اوپر زمین کا پتلی محسوس ہوئی۔ جس دروازے سے وہ

سُرنگ میں داخل ہوئے تھے۔ اُسکا دروازہ ٹوٹ کر سرنگ میں گرا تھا۔ جس کی وجہ سے گرد کا ایک بہت بڑا بادل اُٹکوا پنی لپیٹ میں لے گیا۔ ع

ایک ہاتھ میں نارچ اور دوسرے میں پٹل پکڑے وہ چلنا ہو کر سب سے آگے چل رہا تھا۔

سُرنگ آگے جا کر پارک میں ختم ہوئی۔ مگر اُسکے آگے لگا دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔

منگو نے اُٹکوتھوڑا پیچھے ہو کر کھڑے ہونے کا بولا۔ اور لاک والے حصے پر قائل کیا۔ دروازہ کھل گیا۔

پہلے وہ خود باہر آیا۔ ابھی وقت تو اتنا نہیں تھا۔ مگر اندھیرا پھیل چکا تھا۔

علاقے میں پولیس کی گاڑیوں کے سائرن گونج رہے تھے۔ اُس نے نارچ بند کر دی۔ اور منیر کو باہر آنے کا

اشارہ کیا۔ منیر کے پیچھے وہ بہن بھائی بھی نکل آئے۔

”ادھر کھڑے ہونا۔ خطرناک ثابت ہوگا۔ تم ارسلان کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ خیال کرنا یہ تھوڑا بیوقوف

ہے۔ کہیں پھر سے تمہارے لیے کوئی مشکل نہ پیدا کر دے۔“

منیر نے سرخم کیا۔ اپنے بیک میں سے چار ہیٹ نکال کر ایک اپنے سر پہ رکھا۔ باقی کے اُن تینوں کو دیئے۔

اُن چاروں کا حلیہ انتہائی بُرا ہو رہا تھا۔ سارے کپڑے گرد آلود تھے۔ چہروں پر مٹی کی تہہ جی نظر آرہی تھی۔ اصل

شکل و صورت کے برعکس وہ لوگ کارٹون لگ رہے تھے۔

منگو نے ایک ارسلان کا ہیٹ اُسکے ہاتھ سے لیکر مضبوطی سے اُسکے سر پہ پہنایا۔

”منیر جو بھی کہے گا۔ تم اُسکی بات انکوری نہیں کرو گے۔ کیونکہ تمہاری وجہ سے اگر مزید کوئی نقصان ہوا۔ تو بیٹا

میں جوتے مار مار کر تمہیں بندر بنادوں گا۔ سُن رہے ہو؟“

”میں منیر کی بجائے آپکے ساتھ کیوں نہیں جاسکتا ہوں۔“

”اکٹھے جانے میں خطرہ ہے۔ اسلیے میں مریم کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ تم منیر کے ساتھ جاؤ۔ منزل پر پہنچ کر

ملیں گے۔“

”آپ کے ساتھ مریم ہی کیوں جائے گی۔ میں بھی تو جاسکتا ہوں۔ مریم منیر کے ساتھ چلی جائے۔“

منگو نے ارسلان کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ وہ یقیناً ڈر رہا تھا۔

”مریم لڑکی ہے۔ اُسکے حوالے سے میں خود کو ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ اسلیے تم چپ چاپ منیر کے ساتھ جاؤ۔ بحث کا وقت نہیں۔ اور ڈرنا بھی مت کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس گلی سے نکل کر تم لوگ مین سڑک پر جاؤ گے۔ وہاں سے کوئی بھی آتی جاتی پبلک ٹرانسپورٹ لو او دسیدھے ہیڈ کوارٹر پہنچو۔ ادھر ادھر کہیں نہیں جانا۔“

اس دفعہ منیر مزید کچھ کہے بغیر ارسلان کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

مریم کو آنے کا اشارہ کر کے منگو منیر کی مخالف سمت میں چل پڑا۔

آج پھر مریم کو منگو کے ہم قدم ہو کر چلنے میں پوری طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ ایک ایک قدم کسی جن کی طرح اٹھاتا تھا۔ مریم تو پہلے ہی بیچاری اندر سے سہی ہوئی تھی۔

اب بھی دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

”منگو! ہستہ چلو میرے سے اتنی تیز نہیں چلا جا رہا۔“

منگو نے گردن موڑ کر دیکھا۔ مگر قدم نہیں روکے۔

”ہمارے چاروں طرف پولیس پھیلی ہوئی ہے۔ ہمیں جلد از جلد اس علاقے سے نکلنا ہے۔ اسلیے ہمت سے

کام لو۔“

آگے گلی میں اچانک سے ایک گاڑی موڑ کاٹ کر ادھر کو آئی۔ منگو نے نارمل انداز میں اپنے قدم اٹھانے کا عمل جاری رکھا۔ کیونکہ ہیڈ لائٹس سیدھی دونوں پر پڑ رہی تھیں۔

مریم گھبرا کر بھاگنے لگی تھی۔ جب بروقت منگو نے اُسکی کلائی تھام کر سرگوشی کی۔

”سامنے مت دیکھو نیچے نظریں کر کے چلتی چلی آؤ۔ بھاگنا نہیں ہے۔“

ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں کے درمیان یہ بازار کافی چوڑا تھا۔ یہاں سے وہ گھر تو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مگر دھویں کے بجھو کے نظر آ رہے تھے۔ پلاسٹک کے جلنے کی بو کے علاوہ انسانی چیخوں اور آہو بکا کی آوازیں صاف آ رہی تھیں۔

مریم کا ہاتھ اپنی گرفت میں لیے وہ گاڑی کے پاس سے گزر گیا۔ جب ہی آدمی نے گاڑی رُکوائی اور نیچے اُتر

کر منگو کی جانب آیا۔

”تم کون ہو؟ اور کہاں سے آرہے ہو؟“

”میں یہاں کارہائشی ہوں جی۔ میری گلی میں دھماکا ہوا ہے۔ وہیں سے آرہا ہوں۔“

”دھماکا تو اس طرف ہوا ہے۔ تم تو مخالف سمت سے آرہے ہو۔“

”اس گلی سے آئے ہیں جناب“

اُس نے وہاں سے نکلتی تنگ گلی کی جانب اشارہ کیا۔

”اچھا اچھا یہ ساتھ کون ہے؟“

”چھوٹی بہن ہے۔ اسکے سر میں چوٹ آئی ہے۔“

منگو نے دل میں شکر کیا کہ وہ سر تا پیر مٹی میں اٹا ہوا تھا۔

سامنے والا بھی کوئی گھماک آدمی تھا۔ کیونکہ تو زنگیوں سے دونوں کو سرتاپا جانچتے ہوئے اُس نے گاڑی کی

ڈرائیونگ سیٹ پر موجود کاسٹیل کو آواز دی۔

”شکور ڈرائیونگ بورڈ پر پڑی پانی کی بوتل تو ادھر لاد۔ اس باجی کا سارا چہرہ گرد آلود ہے۔ ڈرائیونگ دھلوا

دو۔ خدمتِ خلق کرنا ہی ہمارا اولین فرض ہے۔“

ڈرائیونگ پانی والی بوتل لیکر آگیا۔ پہلے والے نے اپنی جیب سے فون نکال کر اسکی سکرین پر پن ڈالنے کے

بعد گیلری کھول کر ایک تصویر نکالی۔

منگو قد میں اُس آدمی سے اونچا تھا۔ جسمانی طور پر گاڑی والے دونوں آدمی منگو کے مقابلے میں بے کٹے

تھے۔ مریم کا ایک ہاتھ ابھی بھی منگو نے تھام رکھا تھا۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

فون والی تصویر کسی اور لڑکی کی نہیں بلکہ مریم کی ہی تھی۔

پانی کی بوتل کھول کر کاسٹیل نے مریم کی جانب بڑھائی۔

”بی بی اپنے چہرے کی گرد صاف کرو۔“

مریم نے بوتل پکڑی مگر وہ ہاتھ سے گر گئی۔ کاسٹیل بوتل اٹھانے کو نیچے ٹھکا تھا۔ جب منگو کے بھاری بوٹ

کی ضرب نے اُسکے ناک کی ہڈی توڑ دی وہ وہیں زمین پر گر کر تر پنے لگا۔ اُس کے ناک سے بھل بھل خون بہہ

رہا تھا۔

”مریم جا کر گاڑی میں بیٹھو۔۔۔“

منگو کے حکم پر مریم گاڑی کہ جانب بھاگی۔

جبکہ دوسرا آدمی اس دوران منگو پر بندوق تان چکا تھا۔

”تو وہ تم ہی ہو۔ ہمارے بندے مار کر ہمیں ہی چکا دیکر بھاگ رہے ہو۔ کیا نام تھا تمہارا۔۔۔“

منگو۔۔۔ اب دیکھتا ہوں۔ تو یہاں سے زندہ کیسے جاتا ہے۔“

منگو نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

سامنے والے نے گولی چڑھائی منگو کو وقت مل گیا وہ تیزی سے اپنے پیروں پر ٹھکا سا رازن دونوں ہاتھوں پر ڈال کر اپنی ایک ٹانگ کو پورے زور سے حریف کی گھٹنوں پر مارا۔ وہ پہلی بار میں ہی لڑکھڑا گیا۔ گرنے کے دوران اُس نے منگو پر فائر کھول دیا۔ وہ آگے سے ٹھکا بھاگا بھی مگر ایک گولی اُسکی بائیں ران کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ درد کی شدید لہر نے اُسکو چند لمحوں کے لیے بالکل مفلوج کر دیا۔

رکوع کی صورت میں ٹھکے ہوئے اُس نے اُس جانب نظر ڈالی جہاں گھر جاہ ہوا تھا۔ وہاں بہت سے لوگ نظر آرہے تھے۔ فائر کی آواز پر اُنکی توجہ اس طرف ہو چکی تھی۔ منگو جانتا تھا۔ یہ وقت انتہائی قیمتی ہے۔ اگر ابھی نہ بھاگا تو وہ خود تو مرے گا ہی پر یہ ظالم لوگ مریم کے ساتھ بہت بُرا سلوک کریں گے۔

جیسے ناک پہ لگی تھی۔ وہ تو ابھی تک سیدھا پڑا کراہ رہا تھا۔ دوسرا لیٹے لیٹے ہی اپنی گن کے میگزین میں گولیاں بھر رہا تھا۔ موبائل پر نمبر ملانے کے بعد اُس نے سیٹ ابھی کان پہ رکھا ہی تھا۔ جب منگو کے بھاری بوٹ نے اُسکو ہوش کی دنیا سے غافل کر دیا۔

منگو نے ٹھک کر اُس کا فون اٹھایا۔ اور لنگڑا کر چلا ہوا گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

اُس کا خون نکل رہا تھا۔ مگر چونکہ اُسکے ٹراؤزر کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ دیکھنے میں سب ٹھیک ہی لگا۔

ٹی شرٹ کے اوپر اُس نے فل آستین کی کالی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جسے اُتار کر جلدی سے ران کے اوپری

حصے پر باندھ دیا۔ تاکہ خون زیادہ نہ بہے۔

مریم نے وحشت زدہ آنکھوں سے منگو کے عمل کو دیکھا۔ پھر اپنے شک کی تصدیق کرنے کے لیے ڈرتے ہوئے اُسکے ٹراؤزر کے گیلے نظر آتے حصے پر انگلی رکھ کر محسوس کیا۔

”ہائے میرے اللہ منگو بھائی آپ تو زخمی ہیں۔ کیا آپکو گولی لگی ہے؟۔۔۔“

اُس کی تشویش اور سوال و جواب کو مکمل طور پر انور کرتے ہوئے بیک ویو مرسیٹ کیا۔ دور سے کچھ ہیولے گاڑی کی جانب آتے دیکھائی دیئے۔

اُس نے ہینڈ بریک ہٹائی اور گاڑی کو کنٹرول میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھا دیا۔

ایک فائدہ اُسکو اُسکو یہ مل گیا۔ گاڑی کسی گورنمنٹ افسر کی تھی۔ اُس نے روڈ پر آتے ہی گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔ جوفن اُس آدمی سے چھین کر لایا تھا۔ اُسکے سپیڈ ڈائل پہ ایک نمبر فیڈ تھا۔

منگو نے وہ نمبر ملایا۔ دوسری بیل پر ہی فون اٹھانے کے بعد کوئی بے صبری سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے صرف اچھی خبر کا انتظار ہے۔ کیا وہ پکڑے گئے؟۔ اور اُس منگو کو زندہ حالت میں میرے پاس لانا۔

تاکہ میں بھی دیکھوں آخر کس مائی کے لال میں جرات آئی کہ وہ میرے منہ لگے۔“

”تمہاری باتوں نے ثابت کر دیا ہے۔ تم بھینا ڈاکٹر نعیم بول رہے ہو۔ مبارک ہو جنکی تلاش میں تم نے

پولیس کی وردی میں اپنے کرائے کے ٹیو بیجے تھے۔ وہ لوگ تو بالکل محفوظ ہیں۔ پر اپنے آدمیوں کی خبر لے لو۔ کافی

تو مہتر ہوئے ہیں۔ مرنے والوں کی تعداد سے میں ناواقف ہوں۔“

”کون بول رہا ہے؟۔۔۔“

”میں بول رہا ہوں منگو۔۔۔ ڈاکٹر بیماری۔۔۔ تجھے میں پہلا اور آخری موقع دے رہا ہوں۔ سرفراز کے

بچوں کو اُنکے حال پہ چھوڑ دئے۔ ورنہ موت تو تیری ویسے بھی میرے ہاتھوں ہی لکھی ہے۔“

ڈاکٹر نعیم نے گالیوں کی بو جھاڑ کر دی۔

”منگو یا پنگو تو جو کوئی بھی ہے۔ تیری بھلائی اسی میں ہے۔ تو سرفراز کے بچوں کو میرے حوالے کر کے اس

معاملے سے نکل جا۔ ورنہ میں تیرا دی حشر کروں گا۔ نہ تجھے موت آئے گی اور نہ ہی تو زندہ رہے گا۔“

”میں سرفراز کے بچے ہی کیا۔ سرفراز کو بھی تیرے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ تو بس مجھے کہیں سے باہر مراد

برآمد کر دئے۔“

”کون با بر مراد میں کسی با بر مراد کو نہیں جانتا ہوں۔“

”تپری یادداشت کے تمام بیچ جو وقت کے ساتھ ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ میں بہت جلد روبرو کر چھ ایسا سیٹ کروں گا۔ تجھے ہر اس بچے کا نام یاد آ جائے گا۔ جسے مار کر تو نے ماضی کے صفحات میں دفن دیا ہوا ہے۔“

منگو نے فون بند کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

آدھے گھنٹے مسلسل گاڑی چلاتے رہنے کے بعد اس نے ایک جگہ گاڑی روکی۔ اور مریم کو باہر نکلنے کا بولا۔

اپنی جگہ سے نکل کر اس نے جیب میں سے ایک ریمورٹ نکال کر اس کا بٹن دبایا۔

وہ سکریپ گاڑیوں کا ورک شاپ تھا۔ منگو نے ریمورٹ کا بٹن دبایا تو اندھیرے میں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹ آن ہو کر بند ہو گئی۔

جیسے اپنی موجودگی کا پتا دیکر انتظار میں خاموش ہو گئی۔

پچھلے سے لائی گاڑی چابی اندر ہی لگی چھوڑ کر دوسری کی جانب بڑھ گیا۔

”یہ گاڑی کس کی ہے؟۔۔۔“

”اپنی ہے۔ تم جلدی اندر بیٹھو۔۔۔“

”آپکو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ پلیز بھائی کسی ہاسپٹل میں چلو!“

”نہ نہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ سب سے پہلے تمہیں محفوظ کرنا ہے۔ اُسکے بعد کچھ اور۔۔۔“

اُسی جگہ پر بیٹھ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا وہاں رکھا ایک سفید رنگ کا بیگ نکالا۔

بیگ میں فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ مریم دیکھتی ہی رہ گئی۔ منگو نے بیگ سے ایک سرنج لیکر مطلوبہ محلول سے بھری اور پھر کانپتی گرفت کے ساتھ اپنی ٹانگ میں ٹیکالگانے کے بعد پوری طرح سے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ یقیناً شدید تکلیف میں تھا۔

”میں تمہیں اپنے افسر کے گھر چھوڑنے جا رہا ہوں۔ تم وہاں بالکل بے فکر ہو کر رہنا۔ میں ایک دو دن میں تمہیں لینے آؤں گا۔ تمہارے باپ نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ جب تم اپنی امی کی قبر پر جانے کے لیے ضد کر

رہی تھیں۔ اُس وقت مجھے میچ موصول ہوا تھا۔ ڈاکٹر اپنی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر اُسکے بچنے کی زیادہ اُمید نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی زبان سے صرف موت مانگ رہا ہے۔ ارسلان منیر کے ساتھ رہے گا۔ اُس کے لیے پریشان مت ہونا۔“

اُس نے اپنے فون پر نمبر ملایا۔

”اسلام وعلیکم سر میں آپکے دروازے پہ موجود ہوں۔ پلیز ایک مہمان کو قبول کریں۔“

”منگو یہ معاملہ جتنا کنفیڈنشل رکھا جانا تھا۔ اب اتنا ہی اُچھالا جائے گا۔ کیونکہ خبروں تک رسائی حاصل کر گیا ہے۔“

”سر لوگ صرف قیاس آرائیوں سے کام لے رہے ہیں۔ اس وقت ساری تفصیل میں جانے کا میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ باہر آکر اس بچی کو اندر لے جائیں۔“

”منگو میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے تمہارے ساتھ جانا ہے۔“

اُس نے گاڑی ایک گیٹ کے سامنے روکی۔

”پاگلوں والی بات نہ کرو مریم۔ جاؤ شاباش جلدی سے اندر جاؤ۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کیا پتا ڈاکٹر کے آدمیوں نے ارسلان اور منیر کو پکڑ لیا ہو۔“

”میں منیر کو کہہ دیتا ہوں۔ وہ تم سے رابطہ کر کے ارسلان کے ساتھ بات کروادے گا۔ ادھر احسان اللہ

صاحب کی بیٹی کے ساتھ تمہارا وقت اچھا گزرے گا۔ اُنکا نام ایمین صالحہ ہے۔ اور وہ ایک سائنکالوجسٹ ہیں۔“

مریم نے اپنے آنسو صاف کئے۔ اور آگے بڑھ کر منگو کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر ملی۔

”اللہ حافظ منگو۔۔۔“

منگو کتنی دیر اپنی جگہ بل بھی نہ سکا۔ چیف احسان اللہ خود گیٹ پر آئے تھے۔ مریم گاڑی سے نکل کر اُنکی جانب بڑھی۔ منگو نے چیف کو ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس وقت درد اور اُداسی نے ایسی حالت کر دی کہ اُسکو صرف ایک ہی چہرہ یاد رہ گیا۔ جی چاہ رہا تھا۔ اُڑ کر اُس کے پاس چلا جائے۔ کچھلی دفعہ اچانک سے اُسے سامنے جا کر منگو نے اُسکو حیران تو کر ہی دیا تھا۔ مگر اُسکے

بغیر اجازت اُسکے لبوں کے جام پی کر اُسکو ناراض بھی کر چکا تھا۔ پہلے وہ منگو کے میج کے انتظار میں رہتی تھی۔ اور آج کل منگو دیوانہ ہوا تھا۔ کیونکہ وہ ناراضگی دیکھانے میں اتنی سخت ثابت ہو رہی تھی۔ اُس کے ایک میج کا جواب تک نہ دے رہی تھی۔ اور وہ ہر روز پاگلوں کی طرح دس دفعہ معافی مانگ رہا تھا۔ وہ جتنا دور بھاگ رہی تھی۔ منگو کے اندر اُسکو پانے کی پیاس اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ جانے اس پیاس کے مقدر میں وصال کی گھڑیاں تھیں۔ یا فقط فراق ہی فراق تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر نعیم کا سفید چمک دار چہرہ اس وقت غصے سے نیلا کالا ہو رہا تھا۔

”تم سب کے سب حرام خور ہو۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ کل اُس نے ہمارے ایک خاص بندے رزاق کو مارا ہے۔ اور آج تم سب کی مال بہن کر گیا ہے۔ تم لوگوں سے ایک آدمی نہیں پکڑا جا رہا۔ ابھی تو وہ خوبار بار تم لوگوں کے سامنے آ رہا ہے۔ تو یہ حال ہے۔ اگر اُسکو ڈھونڈنا پڑ جاتا تو کیا بنتا۔“

وسیم کا فیکچر ہونے والا بازو ابھی تک پلاسٹر میں تھا۔ جسکی وجہ سے وہ کہیں آجا نہیں رہا تھا۔ اس صورت میں باہر کا کام ڈاکٹر نے اپنے خاص محافظوں کو سونپا ہوا تھا۔ جن کا انچارج اس وقت سر جھکائے بے عزتی کر وار رہا تھا۔

”سر ہمارا زیادہ نقصان پٹرول پر بھڑکنے والی آگ کی وجہ سے ہوا ہے۔ چار لوگ مجلس گئے ہیں۔ تین چار کو ہسپتال بھیج کر ادھر آ رہا ہوں۔ ہماری پوری کوشش ہے۔ ہم بہت جلد اُسکو پکڑ لیں گے۔“

”خاک پکڑو گے۔ تم لوگ جو کر سکتے تھے۔ کر چکے ہو۔ وہ کوئی عام کھلاڑی نہیں لگ رہا ہے۔ یقیناً اُسکے پیچھے کوئی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ چند دن کے لیے تم سب میں سے کوئی بھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ سب کے سب لوگ انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ۔ اسی ساری مصروفیت ترک کر دو۔ مجھے یہاں کوئی بندہ نظر نہ آئے۔ وسیم موتی اور ٹکڑا زار کو بول کر نیچے تہہ خانوں کو تالے لگا دو۔ سب ثبوت یہاں سے نکال کر ضائع کر دو۔ اور باقی جو جو کچھ ضروری ہو۔ وہ پرسور والے گھر میں منتقل کر دو۔ وسیم تم خیال کر لینا۔ اور میری ساری فیملی کی ذمہ داری کے لیے کلکس کروا کر کل ہی انکو یہاں سے نکال دو۔“

”مجھے کچھ دنوں کے لیے ضروری کام سے کراچی جانا ہے۔ وہاں کے کام کو بھی کچھ دیر بند کرنا ہوگا۔ کم از کم جب تک یہ سارا معاملہ دب نہیں جاتا۔“

”بھائی تمہارے خانے میں جو بچے بند ہیں۔ اُنکا کیا کرنا ہے؟۔۔۔“

”اُن سے جان ٹھہراؤ اگر خود سے کہیں دفعہ ہو جاتے ہیں۔ تو ٹھیک ورنہ مار دو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں۔ اگر کوئی ایجنسی ادھر ریڈ کرنے آئے۔ اُنکو یہاں پر کچھ بھی نہیں ملنا چاہیے۔ نچلا گودام سارا دوائیوں سے بھر دو۔ کیمرے وغیرہ سب غائب کرو۔ اور یہ سب رات کے رات ہونا چاہیے۔ دن چڑھنے سے پہلے تم سب کے سب اپنی شکلیں گم کر لینا۔ جاؤ اب کام کرو جا کر۔“

کمرہ خالی ہونے کے بعد ڈاکٹر نے اپنا موبائل اٹھایا۔ اور اپنے بہنوئی کا نمبر ملایا۔

”اسلام ولیکم ظفر بھائی آپ سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔“

”ہاں ہاں بس یہی سمجھ لیں۔“

”مجھے ایک آدمی کی کھوج ہے۔ اُسکا نام منگو ہے۔ مجھے یہ پتا کروا کر دیں یہ کس ایجنسی کے لیے کام کرتا ہے۔ اسکا ڈیلر کون ہے۔ اسکو باہر مراد والا کیس کس نے دیا ہے۔“

”اگر یہ مشکل کام ہے۔ تو بہنوئی صاحب یاد رہے۔ آپ جیسے نالائق میٹرک فیل کو اسمبلی تک پہنچانے کا کام بھی آسان نہیں تھا۔ مگر ہم نے اپنا پیسہ بے دریغ لگایا۔ صرف آج کے دن کے لیے سنا آپ نے۔۔۔!! آمیدہ مجھے نفی میں جواب دینے سے پہلے ہزار دفعہ سوچتا۔“

اُس نے فون بند کر کے میز پر بیٹھ دیا۔ اپنے ڈیسک کے دراز میں سے براڈ ریڈ ہسکی کی بوتل نکال کر پینے لگا۔ عام طور پر وہ ایسے بوتل کو منہ لگا کر پینے کو بدتہذیبی سمجھتا تھا۔ مگر اس وقت اُسکی ذہنی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ منگو کے منہ سے باہر مراد کا ذکر بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔ نعیم باہر مراد کو بھولا نہیں تھا۔ اور ویسے بھی یہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ وہ تو برسوں پہلے والے عابدین عباس کو بھی نہیں بھولا تھا۔

دونوں میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں انتہائی خوبصورت بچے تھے۔ بہت صبر اور محنت کے بعد نعیم کے ہاتھ لگے تھے۔

اُس کا شاطر دماغ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ منظر سے غائب ہو جانا ہی موزوں لگ رہا تھا۔
اُس نے دہسکی کی خالی بوتل بن میں پھینکی اور اپنی گاڑی کی چابی لیے وہاں سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

”نافعہ ان میں سے جو جوڑا تمہیں پسند ہے۔ وہ تم لے لو۔“

سیماب کے کہنے پر اُس نے اپنے سامنے گھلے پڑے جدید کٹ اور ڈیزائن کے مختلف سوٹوں پر نظر دوڑائی۔
اب بہن کو یہ سمجھانا تو مشکل تھا۔ مجھے رنگوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور وجہ جانتی ہو کیا ہے؟۔ وجہ وہ شخص ہے۔ جس
سے پہلے اور جس کے بعد مجھے کسی اور کا نام بھی یاد نہیں ہے۔ اُسکی جانب سے ایک آواز آجائے تو میں جی اُٹھتی
ہوں۔ آج کل میں نے اُسکی آواز پر لبیک کہنا چھوڑ دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اپنی ہی شاہرگ کو اپنے
ہی ہاتھوں سے کاٹ رہی ہوں۔ بھلا اُسکے بغیر میں جی سکوں گی؟۔۔۔ مجھے اپنے دل کے اُس حصے سے بڑی
نفرت ہے۔ جو ہر دم اُسی کے گیت گاتا ہے۔ دل کے اُس حصے سے اور بھی نفرت ہے۔ جو اُسکو بھول جانا چاہتا
ہے۔ بھلا اُسکو کیوں بھولنا جسکو یاد کرنے میں زمانے لگے۔ شعور کی دنیا میں داخل کس نے کیا؟۔۔۔ اُس
نے۔۔۔

بار بار بار مخاطب کر کے اپنی آواز سننے پر مجبور کس نے کیا؟۔۔۔ صرف اُس نے۔۔۔

یہ احساس کس نے دلوا یا کہ دنیا میں ماں باپ اور بہن بھائی کے علاوہ بھی کوئی رشتہ ایسا ہے۔ جو آپکا خونی
تعلق نہیں ہے۔ پر جان سے عزیز ہے۔

”کہاں گم ہو جاتی ہو؟۔۔۔“

”ہاں کہیں نہیں۔۔۔“

”تو پھر جلدی اپنی پسند بتاؤ۔ بچے گاڑی میں باپ کو تنگ کر رہے ہونگے۔ پھر ایویں اُنکا پارہ ہائی ہو جانا
ہے۔“ سیماب کا اشارہ اپنے شوہر کی جانب تھا۔ جو بچوں کو لیکر گاڑی میں انتظار کر رہے تھے۔

”یہ والا کیسا رہے گا۔ تمہارے پاس پیلے رنگ کا کوئی بھی جوڑا نہیں ہے۔“

”چلیں یہی لے لیتی ہوں۔“

”بڑا احسان کرو گی۔“

اُسکو جواب دینے کے بعد سیما ب دُکاندار سے مخاطب ہوئی۔

”بھائی یہ چاروں سوٹ پیس پیک کر دیں۔ اور انکا فائل مناسب ریٹ بتائیں۔“

”میری باجی جو ریٹ میں نے پہلے بتایا ہے۔ وہ بالکل مناسب ہے۔ یقین مایے ہماری تو خرید اُتنے میں نہیں بیٹھتی۔“

”تم لوگ ہر دفعہ ہی کہتے ہو۔“

”میری باجی اپنی پسند بھی تو دیکھو ناں چیز آپ سب سے اچھی پسند کرتی ہو۔ اور پیسے دیتے وقت کنجوس بن جاتی ہو۔“

”تو بہ استغفار تم لوگوں کے ساتھ سرکھپانا دس نفلوں کا کھانا ہے۔ یہ لو پکڑو اس دفعہ تو میں جلدی میں ہوں۔ مگر اگلی دفعہ کسر نہیں کھاؤ گی۔“

سیما ب نے جلدی میں رقم نکال کر دُکاندار کے سامنے رکھی۔ جو کہ اُنکے گاؤں کا لڑکا تھا۔ سیالکوٹ شہر میں اُسکی کپڑے کی دُکان تھی۔

اب دونوں بہنیں مارکیٹ سے نکل کر گاڑی کی جانب جا رہی تھیں

”آپنی تم مواحد بھائی کی شرافت کا کچھ زیادہ ہی فائدہ نہیں اُٹھاتی ہو۔“

تاہفہ کی بات پر سیما ب کو پوچھنا پڑا۔۔۔

”وہ کیسے۔۔۔؟“

”پہلے گلگت کے ٹرپ سے بہنوں اور امی کے لیے چیزیں لائی ہو۔ اور اب یہ سوٹ دلوادے ہیں۔“

”ہاں تو اپنی جیب سے دلوائیں ہیں۔ مواحد کا کیا گیا ہے۔ جو اُسکو اعتراض ہو گا۔“

”یہ بھی اچھی غنڈا گردی ہے۔ بیوی اگر اپنا کمانے والی ہو تو کیا وہ یوں شوہر کا جی جلائے گی۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں نے صرف اپنی ماں بہنوں کے لیے شاپنگ نہیں کی۔ مواحد کی امی اور بھابیوں کے لیے بھی کی ہے۔ بہن تو اُسکی ہے کوئی نہیں۔ میں کونسا دوسرے دن تم لوگوں کو گفتش دیتی ہوں۔ یہی کبھی جب

موقع بن جائے۔ شادی کے بعد تو میں نے امی کی کوئی مدد نہیں کی ہے۔“

”شادی سے پہلے جو اتنا کچھ کر دیا وہی کافی ہے۔ اب بس اپنا اور میاں کا خیال کرو۔ ہماری فکر مت کیا کرو۔ ہم لوگ مرے میں ہیں۔“

”آج خاص کرایہ نے مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنے کو کہا تھا۔ اسی لیے چھوٹی کو بھی ساتھ نہیں آنے دیا۔“

”ایسی کیا بات تھی۔ جس کے لیے اس قدر رازداری برتی گئی۔“

”نافہ تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔“

بچہ راستے اُس کے قدم تھم گئے۔ پیچھے آنے والی عورت اُس کے ساتھ ٹکرائی۔ اور برہمی کا اظہار کرتے ہوئے سائیڈ سے نکل گئی۔ سیماب نے اُسکو ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔

اُسکے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ مگر رنگ بدل گیا۔

”ناشی کیا بیوقوفی ہے۔ اتارش والا بازار ہے۔ تیزی سے آنے جانے والے لوگوں کے درمیان میں ایک دم کھڑے ہو جانا انتہائی خطرناک ہے۔“

”اُس سے زیادہ خطرناک آپ کی بات ہے۔“

سیماب نے نافہ کی دیران نظروں میں دیکھا۔ دل ڈوب گیا۔ گاڑی میں بیٹا شوہر بچے سب بھول کر اُسکو ساتھ لیے ایک فوڈ شاپ میں آگئی۔

”بیٹھو ادھر۔۔۔“

ساتھ ہی اُسکے لیے ٹھنڈا پانی آرڈر کیا۔ نافہ کے ہاتھ ٹھنڈے برف ہو رہے تھے۔ چہرہ لٹھے کی طرح سفید۔۔۔

سیماب کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

”ناشی تم مجھے ڈرا رہی ہو۔ رشتہ آیا ہے۔ ہم نے رشتہ طے نہیں کیا۔ یہ لو شاباش پانی پیو۔۔۔!“

”آپی پانی پینے سے من کی آگ نہیں بجھتی نہ کم ہوتی ہے۔ پھر مجھے پانی کیوں پلا رہی ہو۔ کوئی فائدہ نہیں

ہونا۔ مجھے علم تھا۔ ایک دن میں نے سولی چڑھائے جانا ہے۔ پر مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ دن اتنی جلدی آجانا ہے۔“

”شادی ہونے سے کوئی سولی نہیں چڑھتا پلگی۔ ہمارے امی ابو کی شادی ہوئی تھی۔ میری ہوئی ہے۔ ساری دنیا میں کڑوڑوں لوگ ہر روز اس بندھن میں بندھتے ہیں۔ یہ تو بڑا مبارک رشتہ ہے۔“

”آپنی اپنے جیسے خوش بختوں کی مثال نہ دو۔ میرے جیسے بد بخت اگر نظر میں ہیں تو ان کی مثال لا دو۔“

”تاشی میری جان اپنے سے محبت کرنے والوں کو یوں ازیت نہیں دیتے اللہ کو یہ بات پسند نہیں ہے۔“

”خوشی سے کون خود کشی کرتا ہے آپنی۔“

”تاشی وہ باہمت لوگوں کو بہت پسند کرتا ہے۔“

”پسند تو بڑی چھوٹی چیز ہے آپنی۔ کیا وہ اُن سے محبت بھی کرتا ہے؟۔۔۔“

سیماب کے آنسو چھلک پڑے۔۔۔ دوپٹے کے پلو میں جذب کرتے ہوئے تھوڑے وقفے بعد جب بولنے کے قابل ہوئی تو کہا۔

”یہ اُسکی محبت ہی ہے۔ جو ہمارے دلوں کو تمہارے حق میں حد سے زیادہ نرم کر دیا ہوا ہے۔ وہ جن سے

محبت کرتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اُسکی محبت ڈال دیتا ہے۔“

”پھوپھی شمیم کو تو مجھ سے شدید نفرت ہے۔“

”اُس کا یہاں کیا ذکر۔۔۔؟۔“

”اگر اللہ کو مجھ سے محبت ہے۔ تو وہ شمیم پھوپھی کے دل میں میرے لیے محبت کیوں نہیں ڈال دیتے۔“

”دیکھو وہ عورت ہمارے لیے اتنی اہم بالکل نہیں ہے کہ ہم اُسکی باتوں کو یوں زمین پر سوار کریں۔“

”ایسا کہہ دینے سے تکلیف تو ختم نہیں ہوگی۔ یہ حقیقت ہے۔ وہ ابو کی بہن ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے۔ وہ

ہمارے گھر بہت آیا کرتی تھیں۔ ابو سے بے انتہا محبت تھی۔ مگر پھر میری وجہ سے انہوں نے پہلے ہمارے گھر آنا

چھوڑا۔ پھر ابو کو بھی چھوڑ دیا۔ صرف میری وجہ سے آپنی صرف میری وجہ سے امی کو اپنے بیوگی کے دن حالات کے

ساتھ اکیلے لڑکر گزارنے پڑے ہیں۔ فقط میری خاطر اُنکی سُسرال اور میکے نے اُنکو تنہا کر دیا۔“

”تو ہم کونسا مر گئے ہیں۔ ہم زندہ ہیں۔ الحمد للہ بہت بہتر حال میں ہیں۔ اپنی محنت کے سر پر اپنے پیروں پہ کھڑے ہیں۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ لوگوں نے ساتھ چھوڑا تھا۔ اللہ نے تو تنہا نہیں کیا۔“

”تنہا کرنا اور کیا ہوتا ہے آپ؟۔۔۔“

”نافع وہ لوگ ہمارے لیے اہم نہیں ہیں۔ تم اہم ہو۔ اب کیا تم دوسروں کے کیے کی سزا بھی ہمیں دو گی۔“

”آپ کو میری وجہ سے کوئی تکلیف آئے آپ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔“

”تو پھر رشتے کے نام سے ڈرنا چھوڑ دو۔“

”مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔“

”کیوں نہیں کرنی ہے؟۔۔۔“

”وجہ آپ بہ خوبی جانتی ہیں۔“

”نافع انسان پر آزمائشیں آ جاتی ہیں۔ مشکل وقت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کوئی مصیبت آ جاتی ہے۔ ااکا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اُس کیفیت یا اُس مشکل کو ساری عمر کے لیے اپنے اوپر طاری کر کے رکھیں۔ انسان کو اللہ نے لکیریں پینے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ ایک ہی بات کو زین پر سوار کر کے ساری عمر کا روگ پالنے کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ اللہ نے تو یہ بھی اجازت نہیں دی کہ انسان دنیا داری سے کٹ کر اللہ اللہ کرتا جنگلوں کو نکل جائے۔ پھر وہ کیسے چاہے گا کہ اُس کا بندہ یا بندی ایک آزمائش کے پیچھے اپنے آپ کو یوں تنہا کر لے۔“

”میں نے کب خود کو تنہا کیا ہے۔ آپ سب تو میرے ساتھ ہو۔ بس میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”دیکھ میری جان سب سے پہلے اپنے دماغ میں ایک بات بٹھالے۔ تو یورپ کی بسنے والی کو بیکوری نہیں ہے۔ جو اپنی مرضی کے سر پہ ساری عمر شادی نہ کرے کام کرے اچھا کمائے کھائے اور یونہی عمر بتا دے۔ تو مشرق میں پیدا ہونے والی ایک پاکستانی لڑکی ہے۔ جس معاشرے میں بسنے والے بچا نوے فیصد مرد کی خواہش یہی ہوتی ہے۔ اُنکی شادی ایک کم عمر لڑکی سے ہو۔ بچس سے لڑکی کی عمر اوپر گئی نہیں اور ماں باپ نے اس بات کو سر پر سوار کر لیا ہوتا ہے۔ لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اور ہماری امی بھی یہیں کی پٹی بڑھی ہیں۔ وہ بھی دن رات اب تمہاری شادی کی فکر میں رہتی ہیں۔ کیونکہ نہ تو تمہارے سر پر باپ ہے نہ بھائی اب جو کرتا ہے۔ میں نے اور امی

نے ہی کرنا ہے۔“

”اگر واقعی کچھ کرنا چاہتی ہیں تو پھر ایک احسان کر دیں۔“

”وہ کیا۔۔۔؟۔۔۔“

”میری شادی کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔“

”تاشی میں جانتی ہوں۔ تمہارا بہت عرصے سے کسی لڑکے کے ساتھ رابطہ ہے۔ کیا تم دونوں صرف دوست ہو یا کچھ اور بھی ہے؟۔“

تاشہ کو لگا جیسے دل سینے کی قید سے نکل کر دھڑک رہا ہو۔

کہیں سیما ب اُس کے چہرے پر آنے والے رنگ نہ دیکھ لے اس ڈر سے اُس نے چہرہ چھکا لیا۔

”کیا وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟۔۔۔“

تاشہ کے گالوں سے دُھواں نکلنے لگا۔

”میں آپکو بتا چکی ہوں آپنی مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔“

”اسکا مطلب ہے۔ وہ لڑکا تمہارے ساتھ سنجیدہ ہے۔“

”میں نے یہ بھی نہیں کہا۔۔۔“

”پہیلیاں تو مت بھجواؤ تاشی۔۔۔“

”گھر چلیں۔۔۔؟۔۔۔“

”اگر تم خود اُس سے شادی کی بات نہیں کرنا چاہتی ہو۔ تو کم از کم مجھے ہی اُسکا نمبر دے دو۔ میں اُسکی مرضی جان لوں گی۔“

”کیا کہیں گی؟۔ میری بہن سے بھیک میں شادی کر لو۔“

”بھیک میں کیوں؟۔ اگر تم اُس سے محبت کرتی ہو۔ تو کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا؟۔۔۔“

تاشہ نے حیرت سے بڑی بہن کو دیکھا۔۔۔

”آپنی مجھے اُس سے محبت نہیں ہے۔“

”تافہ میں اتنی بھی اندھی اور بیوقوف نہیں ہوں۔ جتنی نظر آتی ہوں۔ تم مجھے خبر دے دو باقی کام میرا ہے۔“
 ”نمبر لے لیں۔ مگر اسکو کال کرنے سے پہلے مجھے زہر دے لینا۔“
 ”اب یہ بکواس کس لیے۔“

”کیونکہ مجھے شادی نہیں کرنے ہے۔“

”تمہاری سوئی ابھی بھی وہیں کی وہیں انگی ہوئی ہے۔ اسکا مطلب میرے اتنا سرکھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”سرکھپانے سے مسائل حل ہو جاتے تو آپنی میں نے خود اپنے ساتھ بہت سرکھپایا ہے۔ مگر حاصل وصول کچھ نہیں ہوا۔“

”تافہ تم گھر سے نکل کر نوکری کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ خاص کر جو نوکری اس وقت کر رہی ہو۔ وہ فیصلہ کس قدر مشکل تھا۔ مگر امی کی خاطر تم نے ہاں کر دی۔ چندہ اب بھی امی کا خیال کرو۔ وہ تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ ابھی کے ابھی ہی شادی کر دینی ہے۔ آج رشتہ آیا ہے۔ ابھی ہم کوئی دو چار ماہ کا وقت سوچنے کے لیے لیں گے۔ میں چاہتی ہوں۔ تم اس دوران اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لو۔ اپنی سوچ کو اس نقطے پہ لاؤ۔ شادی ضروری عمل ہے۔ سب کی طرح تمہاری بھی ہونی ہے۔ اگر چاہو تو اپنی ڈاکٹر کے ساتھ ڈسکس کر لینا۔ جو تمہارے تحفظات ہوں۔ تم ڈاکٹر کے سامنے کھل کر بیان کر سکتی ہو۔ وہ یقیناً تمہاری مدد کرے گی۔“

تافہ اپنے اندر کی جنگ بہن کے سامنے نہ رکھ سکی۔ چاہ کر بھی نہ رکھ سکی۔ آنکھوں میں نمی لئے گردن ہلا دی۔
 سیما ب اتنے میں ہی مطمئن ہو گئی۔ چلو مانی تو۔

واپسی کا سارا راستہ جو چُپ تافہ کے لبوں پر لگی تھی۔ وہ چُپ رات تک قائم رہی۔ کھانے کے بعد ٹی وی دیکھا۔ سیما ب کے بچوں نے چھوٹی خالہ کے ساتھ مل کر خوب شور و غل کیا۔ وہ تب بھی خاموش نظروں سے سب دیکھتی رہی۔ چہرہ ہر تاثر سے پاک تھا۔

امی بار بار اُسکو دیکھ رہی تھیں۔ دل میں خود کو کوسا بھی

”شائد شادی والی بات ابھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بازار جانے سے پہلے کتنی خوش تھی۔ اب یوں ویران بیٹھی

ہے۔“ سیماب نے انہیں تسلی دی۔

”پریشان نہ ہوں۔ آج یا کل بات تو کرنی ہی تھی۔ اور اسکا رد عمل تب بھی ایسا ہی آتا تھا۔ شادی کے نام پر اپنی ہم عمر لڑکیوں سا رویہ کبھی نہیں اپنائے گی۔ امی آپ کمزور نہ پڑیں۔ آپکا حوالہ دیکر میں نے اسکو بلیک میل کرنا ہے۔ اور اگر آپ ہی نرم پڑ گئیں۔ اس نے پھر قابو نہیں آتا۔ اسلیے اُسکی جانب سے کچھ عرصہ آنکھیں موندھ لیں۔ یہی ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔“

”اچھا بڑی آپاجی۔ اور وہ رشتے والوں کو کیا جواب دینا ہے۔؟“

”اُٹکو کہہ دیں ہمیں سوچنے کے لیے وقت درکار ہے۔ اس دوران لڑکے کے بارے میں چھان بین بھی کروا لیں گے۔“

”رشتے والی عورت لڑکے کی تصویریں دیکر گئی ہوئی ہے۔ تم مناسب سمجھو تو تلافیہ کو دیکھا دو۔ اگر اُسکو لڑکا ہی پسند نہ ہوا۔ تو کیوں اُسکو ذہنی کوفت کا شکار رکھنا۔“

”آپ صبر کریں۔ ابھی تو نہیں مگر جب اگلی دفعہ ٹھنٹی پرائے گی۔ جب دیکھائنگے۔۔۔“

”جیسے مناسب سمجھو۔ اُٹھو اب گیارہ بج گئے ہیں۔ سو جاؤ بچے بھی سارے دن کے تھکے ہوئے ہیں۔“

سب سے پہلے تلافیہ اپنے کمرے میں گئی۔ اور کمرہ اندر سے لاک کر لیا۔ عام طور پر بھانجی کو اپنی ساتھ سلاتی تھی۔ پر آج وہ بالکل خالی تھی۔ کسی کو دینے کے لیے دو حرف محبت کے نہ تھے۔

بیڈ پر گھسلی آنکھوں سمیت چت لیٹے لیٹے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ فون منٹھی میں بند تھا۔ پر آج کل اُس نے فون کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ پچھلی ملاقات پر جوئے درکھول کر گیا تھا۔ تلافیہ نے ابھی تک اُسکو معاف نہیں کیا تھا۔ کیا حق تھا اُسکو؟ وہ کیوں اتنا قریب آیا؟ کیوں ایک حد پار کر گیا؟۔۔۔ کیا میں نے اُسکو اس قدر پیہا کی کی اجازت دی؟

مگر اُس نے اجازت مانگی کب تھی۔ وہ کب کبھی کوئی کام اجازت مانگ کر کرتا ہے۔ بغیر اجازت کے زندگی میں آیا۔ بغیر اجازت کے دل میں برا بھلا ہوا۔ اور اب بغیر اجازت کے اپنا اسیر کر گیا۔ وہ کیسے اُسکو بتاتی تمہاری خوشبو ابھی تک تصور میں آباد ہے۔ یہ خوشبو نہ ہاتھ دھونے سے جاتی ہے۔ نہ ہونٹ پونچھنے سے جاتی

ہے۔ وہیں کی وہیں ہے۔ آؤ اور یہ واپس لے جاؤ۔

کبھی کبھی اُسکو یہ خیال آتا۔ کیا کسی سے اس قدر محبت جائز بھی ہے؟۔۔۔ کیا اس شدت کی محبت کی اجازت ہے؟ جہاں تمہارا دل اگلے کے سارے گناہ معاف کر دئے۔ دل اُسکو قصور وار تک نہ گردانے۔ کیوں؟۔۔۔ فون کی بیپ نے خیالوں کی دنیا سے نکالا۔

سکرین پر اُسی کا نمبر تھا۔

ہاتھ بے اختیار ہو کر نوٹیفیکیشن کھولنے لگے۔

”میں تمہارے دروازے کے باہر کھڑا ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ پھر خیال آیا اُسکو کیا علم میں کہاں ہوں۔ اسی لیے لکھ بھیجا۔

”کس دروازے کے باہر۔۔۔“

جواب فون پہ نہیں آیا۔ بلکہ کمرے کا جو کمرہ باہر کو کھلتا تھا۔ اُس پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔

تاشقہ کو لگا یقیناً کوئی مذاق ہوگا۔ دوپٹے کا بھی ہوش نہ رہا۔ بیڈ سے اُتری اور آگے بڑھ کر جلدی سے لاک

کھول کر دروازے کا ایک پٹ وا کیا۔ سامنے گہرے اندھیرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

روئی ہوئی آنکھیں، کچھ ڈھونڈتی ہوئی بے تاب نظریں۔۔۔ سفید ٹراؤزر پہ پیلا ٹکرتا۔ لمبے سلکی ہال گھٹاؤں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔

جب کوئی نظر نہ آیا۔ چہرے پہ مایوسی اور آنکھ میں پانی ایک ساتھ آیا تھا۔ اور وہ جو اندھیرے میں جھاڑی کی

اوٹ سے یک ٹک اُسکے روشنیاں لٹاتے سراپے کو دیکھ رہا تھا۔ گہری سانس بھر کر لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

وہ دروازہ بند کر رہی تھی۔ جب خون سے رنگا ہاتھ درمیان میں نظر آیا۔ اُسکے حلق سے چیخ برآمد ہوتی ہوتی رہ

گئی۔ کیونکہ اگلے ہل وہ کمرے کے اندر اُسکے بالکل سامنے موجود تھا۔

”اسلام علیکم“

سلام لینے سے پہلے وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر چکا تھا۔

وہ سر اٹھا کر آنکھیں جھپکے بغیر اُسکو دیکھے جارہی تھی۔ مگر کچھ غلط تھا۔ آج وہ ہمیشہ کی طرح فریش نہیں لگ رہا

تھا۔ چہرے پر پسینے سے سارے بال چپکے ہوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ تکلیف میں ہے۔

”کیا ہوا ہے؟۔۔۔“

”شکر ہے تمہیں خیال آ گیا۔ ورنہ مجھے لگا ساری رات ادھر ہی کھڑا رکھوں گی۔“

”کیا ہوا ہے؟۔۔۔“

”کوئی لگی ہے۔“

تافہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کہاں؟ کب؟ کیوں؟ کیسے؟۔۔۔“

”مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ پہلے بیٹھ جاؤں؟۔۔۔“

وہ جیسے ہوش میں آئی۔

”ہہ ہاں۔۔۔ ادھر۔۔۔“

جلدی سے بیڈ پر پڑا کمبل ایک طرف کر کے اُسکے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ پھر کھڑکی کے پردے برابر کئے۔ اندر واپے دروازے کا لاک پھر سے چیک کیا۔

منگو کو بیٹھنے میں انتہائی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلسل ڈرائیونگ کرنے سے ٹانگ میں سوجن ہو گئی تھی۔

بیڈ پر بیٹھنے کی بجائے وہ ٹانگیں لٹکا کر نیم دروازہ ہو گیا۔

پریشانی سے تافہ کے ہاتھ چہرہ پھول رہے تھے۔ اب غور سے اُسکی ٹانگ کو دیکھا۔ تو کلیجہ حلق میں آتا محسوس ہوا۔ ٹراؤزر خون سے بھرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ جس شرٹ سے ٹانگ کو باندھا گیا ہوا تھا۔ وہ بھی خون سے بھری ہوئی تھی۔ دونوں کے رنگ گہرے ہونے کی بنا پر وہ پہلی نظر میں جان نہیں پائی تھی۔ غور کرنے پر نظر آیا تھا۔

”میں ڈاکٹر کو بلاؤں۔۔۔؟۔۔۔“

تافہ کی بات پر اُس نے فوراً سر اٹھایا۔

”ہرگز بھی نہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا۔ تو میں خود چلا جاتا۔ کیا کمرے میں کوئی ریڈیو وغیرہ ہے۔ تو چلا دو

”تاکہ میری آواز باہر نہ جائے۔“

تاہفہ میکا کی انداز میں مڑی بال لہرائے اور وہ اُسکی زلفوں میں الجھ گیا۔

تاہفہ نے اپنا موبائل کھولا۔ سب سے اوپر جو قوالی آئی اُسے پلے کرتے ہوئے فون کو سٹریو کے ساتھ جوڑ دیا۔ آواز اتنی تیز نہیں تھی۔ مگر اتنی ہائی ضرور تھی۔ جواب اُنکی باتوں کی آواز کو مچھا سکتی۔

سٹریو آن کر کے وہ واپس اُسکی جانب مڑی کہ اب اگلا حکم؟۔۔۔ کمرے میں نصرت کی آواز گونج رہی تھی۔
تمنا ہی کہ یونہی بسر ہو

تیری چوکھٹ ہو اور دیوانے کا سر ہو

وہ اُسی کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ سفید بیگ کھول کر سارا سامان نکال دو۔“

تاہفہ نے عمل کرنا چاہا مگر ایک تو وہ اتنا قریب تھا۔ دوسرا جو اس وقت اُسکی حالت تھی۔ اس سب کے اثر میں
تاہفہ کے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے۔ ہلکی سی گرہ نہ کھولی جا رہی تھی۔
وہ دھیرے سے مسکرایا۔

نہ دنیا نہ منصب نہ زر کے لیے

یہ سرو وقف ہے تیرے در کے لیے

ہاتھ بڑھا کر اُسکے کانپتے ہاتھوں پر اپنی گرفت رکھ کر بیگ کا منہ کھول دیا۔

ملا میری فطرت کو دیوانہ پن

تیرے حُسنِ دیوانہ زر کے لیے

”اتنا سا کام تھا۔ گھبرا کیوں رہی ہو؟۔۔۔“

تمہارے تبسم کی اک اک ادا

قیامت ہے اہل نظر کے لیے

”آپکا اتنا زیادہ خون بہہ گیا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔“

اٹھادر سے چلمن کو اے محو ناز
دیکھا اپنا رخ لحد بھر کے لیے

”میں تو اپنے طبیب کے پاس ہی آیا ہوں۔ جسمانی تکلف تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے پاس دوا موجود ہے۔ ابھی پٹی کر کے دوا لے لوں گا تو آرام آ جائے گا۔ کیا یہ تمہارے اصلی بال ہیں؟ یا ویک لگائی ہے؟۔۔۔“
اُسکے سوال پر تافہ کا ہاتھ بے اختیار اپنے سر پر گیا۔ جواب دینے کی بجائے اُس نے تیزی سے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ دیا۔ جونہی ہاتھ نیچے کئے۔ جوڑا کھل گیا اور بال دوبارہ سے بکھر گئے۔

ہمیشہ ہمیں دیکھنا ہے تمہیں

تم ہی ہو ہماری نظر کے لیے

وہ پھر سے مسکرا دیا۔ جبکہ شرم سے تافہ کے گال دھک رہے تھے۔

”مجھے ڈرینگ کرنی ہوگی۔ پلیز خون دیکھ کر گھبرانا مت۔ ورنہ یہ نہ ہو۔ اپنی بجائے مجھے تمہارا علاج کرنا پڑ جائے۔“

تافہ نے کسی بچے کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

منگو نے ایک ایک کر کے بیک میں سے ساری چیزیں نکال کر اپنے پاس بیڈ پر رکھیں۔

سب سے پہلے شرٹ کھولی پھر کینچی اٹھائی۔ پانچے سے لگ کر جہاں پر زخم تھا۔ وہاں تک پینٹ کاٹ دی۔
اب زخم کھل کر نظر آیا تو تافہ نے دل تھام لیا۔ گہرا سُرخ خون زخم کے اوپر تہہ کی صورت میں جما ہوا تھا۔

دروازے پہ ہونیوالی دستک سے وہ بُری طرح اُچھلی۔۔۔

گھبرا کر منگو کو دیکھا۔ جو اُسی اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔

مگر اُسکی سنجیدہ نظریں دروازے سے ہوتی واپس تافہ پہ آ کر رُک گئیں۔ تافہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
”ک کون؟۔۔۔“

دوسری طرف سے حرمین کی کڑک دار آواز آئی۔

”ناشی باجی نصرت فتح علی خان کو سننے کا یہ کونسا وقت ہے؟۔۔۔“

اُسکو سمجھ نہ آیا کیا جواب دئے۔ اگر دروازہ کھلنے کا مطالبہ ہو گیا تو کیا کرے گی۔

”وہ میرا دل کر رہا ہے۔ صرف دو چار گانے سن کر بند کر دو گی۔“

”خود سنیں ناں کس نے منع کیا ہے۔ پر آپ تو ساری گلی کو سن رہی ہیں۔“

”حرمینی جا کر سو جاؤ تنگ نہ کرو۔“

اس دفعہ اُس نے ڈانٹ سے کام لیا۔

دوسری طرف حرمین بھی جل کر بولی۔

”پتا نہیں کس پہ چلی گئی ہیں۔ مجال ہے جو کبھی کوئی کام نارمل لوگوں والے کئے ہوں۔ سنتی رہیں ساری رات بلکہ سنا تی رہیں۔“

تاہفہ پلک جھپکے بغیر اُسکو دیکھ رہی تھی۔ جو حرمین کی بات بڑے غور سے سننے کے بعد سنجیدہ نظروں سے تاہفہ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

تاہفہ نے سکون کا سانس لیا مزید کوئی آواز نہ آئی تھی۔ جسکا مطلب تھا۔ حرمین واپس اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

”محبت میں کیا کیا نصیر اہل دل

تڑپتے رہے چارہ گر کے لئے۔۔۔

اگر جو امی یا اُسکی بہنوں کو علم ہو جائے اس وقت اُسکے کمرے میں ایک جوان مرد موجود ہے۔ امی تو بے یقینی سے ہی مرجائیں گی۔

مواعد بھائی کا کیا رد عمل ہوگا۔ وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”مجھے پانی ڈالنے کے لیے ایک برتن چاہیے۔“

منگو کی آواز پر وہ ایک دفعہ پھر سوچ کی دنیا سے باہر نکلی۔ سارے کمرے میں نظر دوڑائی۔ بیڈ سائیڈ پہ پلاسٹک کا باؤل نظر آیا۔ جس میں دن کے وقت مافیہ نے خربوزہ کاٹ کر رکھا تھا۔

واش روم سے باؤل دھونے کے بعد لا کر اُسکے سامنے رکھا۔

ایک پیکٹ میں پانی تھا۔ جسے کاٹ کر باؤل میں نکالنے کے بعد اُس نے ایک مختلف قسم کا پیکٹ اُس میں کس کیا۔ پھر کاٹن کو اُس میں ڈبوڈبو کر زخم کو صاف کیا۔

منگو نے اپنی شہادت کی انگلی سے گولی کی جگہ کے اور گرد و باؤ ڈالا۔ تازہ خون اُبل کر باہر آیا۔ اُسکے چہرے کا رنگ ہٹا رہا تھا۔ اُسکو کتنی تکلیف کا سامنا تھا۔ وہ تو اپنے کام میں مصروف تھا۔ مگر بیڈ سے چند قدم کی دوری پہ کھڑی وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔ جب اُس نے ایک پیکٹ سے ٹیوزر نما آلا نکالا۔ تاحفہ نے آگے بڑھ کر اُسکا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اس سے کیا کریں گے؟۔۔۔“

”گولی اندر ہی ہے۔ اُسکو نکالنے کی کوشش کرنے لگا ہوں۔“

”ہرگز نہیں آپ میرے سامنے یہ سب نہیں کریں گے۔ ساری دنیا چھوڑ کر ایک میں ہی ملی تھی۔ جسکے سامنے اپنے آپ کو اس افیت کا شکار کر رہے ہیں۔“

”ہاں میں کہیں سڑک کے کنارے گاڑی روک کر یہ سب کرنے کے بعد تمہارے پاس آ سکتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں میرا خیال تمہاری جانب ہی گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ محبت اپنے محبوب کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا۔ سوچا چلو اللہ نے موقع دیا ہے۔ فائدہ اُٹھایا جائے۔ میری حالت پر تم خوش ہوتی ہو یا پریشان۔۔۔“

ابھی اُسکی بات منہ میں تھی۔ تاحفہ کا ہاتھ اُٹھا اور اُسکے گال پر پڑا۔

وہ اپنے گال پہ ہاتھ رکھ کر ششدر سا اُسکو دیکھے گیا۔ پھر ہنسنے لگا۔

”چلو تمہیں بھی اپنا حصہ نکالنے کا موقع ملا۔ اب صلح سمجھوں؟۔۔۔“

”جو حرکت آپ نے کی تھی وہ انتہائی گھٹیا تھی۔“

”اب بتانے کا کیا فائدہ یہ تھپڑ تباہ مارنا تھا۔ جب میرے سینے سے سر لگا کر رونے بیٹھ گئی تھیں۔“

”اچھا اب یوں مجھے شرمندہ کریں گے۔“

”کیوں نہیں۔ شرمندہ ہونے والی بات تو کوئی نہیں ہے۔“

”آپ جیسے بے شرموں کے لیے تو واقعی نہیں ہے۔“

”دیکھو ایویں جو تم میرے سوئے ہوئے جذبات جگانے کی کوشش کر رہی ہو۔ باز آ جاؤ آج میں کوئی عملی مظاہرہ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ بلکہ پہل کبھی بھی میری طرف سے نہیں ہوتی۔“

”ہاں ہاں میں ہی ہر دفعہ آپ کے پاس جاتی ہوں۔ آپ نے تو کبھی میرا راہ نہیں روکا۔“

”اگر تمہاری پاس آنے کی بجائے میں کہیں اور جاؤں گا۔ تب بھی برداشت نہیں ہوتا۔“

”آزما دیکھیں۔“

”کیوں ایسے فضول دعوئے کرتی ہو۔ تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”کس سوال کا؟۔۔۔“

”تمہارے بال اصلی ہیں یا مجھے قابو کرنے کے لیے دیگ لگائی ہوئی ہے۔“

”ہاں دیگ لگائی ہوئی ہے۔ مجھے خبر تھی ناں آپ آنے والے ہیں۔ اُسی خوشی میں میک اپ کیا مہندی لگائی دیگ لگائی۔ اب خوش؟۔۔۔“

وہ ٹھسے میں سوچے بغیر بول گئی تھی۔ اور سامنے والا اپنے ہاتھ روکے بس اُسکو دیکھتا رہا۔

”تاہفہ بیگم اگر بھول گئی ہو۔ تو میں یاد کروادوں۔ میں ایک بڑا عام سا انسان ہوں۔ اور تمہارے عشق میں گوڑے گوڑے گرفتار ہوں۔ اس لیے ایسا خوبصورت نقشہ کھینچنے وقت ذرا خیال کرو۔ پر میری خواہش ضرور ہے۔ میری زندگی میں ہی ایسا دن آ جائے۔۔۔۔۔“

تاہفہ کو اُسکی بات پہ ایک دفعہ پھر بڑا غصہ آیا۔ جو منہ میں آتا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے بک دیتا ہے۔ اُس نے پکٹ میں سے سرجیکل دستانے نکالے اپنے ہاتھوں پہ چڑھائے۔ منگو کے ہاتھ سے ٹویزر لے لیا۔ اور اُسکی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے۔ آج میرا دن ہے۔ اللہ نے اگلے پچھلے سارے حساب برباک کرنے کے لیے ہی آج آپکو میرے حوالے کیا ہے۔“

منگو کا منہ او کی شہیپ میں گھلا۔ مگر اُسکو کچھ بھی کہنے کا موقع دیئے بغیر تاہفہ نے اُسکے سینے پہ اپنے دونوں ہاتھوں کا زور ڈال کر پیچھے کولٹا دیا۔

وہ منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

”یا اللہ خیر کرنا۔ جس نے آج تک پیر میں چمھا شیشہ نہیں نکالا ہو گا وہ گولی نکالنے کے چکر میں ہے۔“

تاحفہ نے اپنی انگلی کو اُسکے زخم پر رکھ کر دبا یا۔ جس پر منگو اپنی جگہ اُچھلا۔

”او مر گیا۔ کیا کر رہی ہو؟ پہلے کم درد ہے؟۔۔۔“

”یہ وارننگ تھی۔ اب اگر منہ کھولا تو یہ قینچی مار دوں گی۔“

”تم عملی طور پر بھی خطرناک ہو۔ صرف دیکھنے میں ہی نہیں۔“

اس دفعہ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پوری توجہ سے کاشن کے ساتھ زخم کو صاف کرنے لگی۔ وہ آنکھ پر بازو

رکھے لیٹا رہا۔

تاحفہ نے نزدیک سے سوراخ کا معائنہ کیا تو ٹانگیں کانپ گئیں۔

پھر بھی ڈرتے ڈرتے آگے کو سوراخ کے پاس لا کر کھولنا چاہا تو ہاتھ کانپ رہے تھے۔

وہ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد اٹھ بیٹھا۔

”ہاں جی بیگم صاحبہ نکل گئی ساری افسری۔۔۔ لائیں پھر پروفیشنل ہاتھوں کا کمال دیکھیں۔“

اگلا عمل چند منٹ میں ہوا۔ منگو نے دوسرے بھر کر ٹانگ میں لگائیں۔

گولی زیادہ اندر نہیں تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد نکل گئی۔ پہلے وہ نہیں بولا۔

مگر بعد میں ایک بوتل تاحفہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”جب میں اشارہ کروں اسکو سوراخ کے اوپر ڈالنا۔“

منگو نے اپنے منہ میں تو لیا دیا۔ اور سر کو ہلایا۔

تاحفہ نے دل کھول کر وہ لیکوڈ اُسکی ٹانگ پر ڈالا۔ ایک دفعہ تو منگو کو آنکھوں کے سامنے تارے ناچتے

دیکھائی دے سرہانے میں منہ دیکر اپنی آواز کو دبا گیا۔

جب ذرا اثر کم ہوا تو کانپتے ہاتھوں سے سر جیکل ٹیپ کے ساتھ سوراخ کو اچھی طرح بند کر کے اوپر ڈیرینگ

لگا کر واپس لیٹ گیا۔

ابھی تک گہرے گہرے سانس بھر رہا تھا۔ چہرہ اور شرٹ پسینے سے تر ہوتے تھے۔

تافہ کے دماغ نے بروقت عمل کیا۔ اُس نے ایک گلاس میں پانی ڈالا ساتھ دو اینیوں میں نظر آتی آبروفین کی دو گولیاں اُسکی ہتھیلی پر رکھ دیں۔

”یہ کھالیں۔“

وہ کچھ بھی کہے بغیر گولیاں نگل گیا۔ وہیں لیٹے لیٹے وہ چند منٹ میں ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ کتنی دیر تک بیڈ کے قریب کھڑی ہو کر اُسکو سوتا ہوا دیکھتی رہی۔

ہمت کر کے اُسکے پیروں کو بھاری بوٹوں سے آزاد کیا۔ پھر کھینچ کر جڑا ہیں بھی اُتار دیں۔ اُسکی ساری ٹانگ پیرموزہ جی کے جوتے پر بھی خون جما ہوا تھا۔ تافہ کو فکر ہوئی نہ جانے ایک ہی رات میں کتنا خون ضائع ہو گیا ہوگا۔ کیا یہ ہر روز ایسی صورتحال سے گزرتا ہے۔

واش روم سے چھوٹے ٹب میں پانی بھر کر لائی جس میں تھوڑا سا ڈیٹول ملا یا تھا۔

پانی بیڈ کے قریب رکھ کر اپنے ہال لپٹ کر پونی سے کس کر جوڑا بنایا۔

باری باری دونوں پاؤں اٹھا کر ٹب میں رکھتے ہی اُسکے پسینے چھوٹ گئے۔ دس نمبر کا پاؤں اتنا بھاری اوپر سے وہ خود تو سو یا پڑا تھا۔ تو لپٹا گیا کر کے ساری ٹانگ کو صاف کیا۔ یہ الگ بات اُسکے اتنے قُرب سے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ شرم سے نظریں تھکی ہوئی تھیں۔ اس وقت بس یہ خیال رہ گیا۔ یہ تو کہیں بھی مدد کے لیے منہ کر سکتا تھا۔ سب پر مجھے ترجیح دیکر میرے پاس آیا ہے۔ اور میں اُسکو پونہی خون میں لتھڑے کپڑوں میں پڑا چھوڑ دوں۔ ڈاکٹر بھی تو لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ اُن میں لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ اچھا چلو اپنے ملک میں اتنا عام نہ ہو۔ پر باہر کے ممالک میں تو عورتیں پیرامیڈیک بھی ہیں۔ ایکسیڈنٹ یا کسی بھی قسم کی فیمل ٹرومہ انجری میں انسان کے سارے کپڑے اُتار دیتے ہیں۔۔۔ وہ جو ڈاکیومنٹریوں میں دیکھاتے ہیں۔ سارے اصل زندگی کے واقعات ہیں۔

وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن اُسکا ٹراؤزر اُتارنے کے عمل میں ہلکان ہو رہی تھی۔ حالانکہ منگو نے نیچے باکسرز پہنے ہوئے تھے۔ جنگلی لمبائی گھٹنوں تک تھی۔

جب بہت لڑائی کے بعد بھی ٹراؤزرنہ اُتر تو اُس نے آسان حل نکالنا کئی سے سارا کاٹ دیا۔ پھر پورا زور لگا کر اُس کے نیچے سے کھینچ کر ایک طرف رکھا۔

”تو یہ یہ انسان ہے یا کوئی جن۔۔۔“

ٹانگیں نیچے کو لٹکی ہونے کی وجہ سے پٹی پہ خون کے دھبے اُبھرنے لگے تھے۔ یقیناً بلیڈنگ پھر سے شروع ہو رہی تھی۔

”اب ٹانگیں اٹھا کر بیڈ پہ کیسے رکھوں؟۔۔۔“

ہمت کر کے ایک ایک پاؤں اٹھا کر جیسے تیسے بیڈ کے اوپر رکھ دیا۔ اوپر چادر ڈال دی۔ ساری بیڈ شیٹ پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اپنی الماری میں سے ایک بڑا سا بیگ نکال کر سارے خون آلود کپڑے پٹیاں سرنجیں سارا اُلجھ ڈال کر گرہ لگا دی۔

تب کا سارا پانی بھی سُرخ ہو رہا تھا۔ جسے بدلنے کے بعد نیا پانی ڈال کر لائی۔ تو یہ بھی دھویا۔ سارا فرش صاف کیا۔ اُس کا جوتا صاف کیا۔ اپنی طرف سے سارا کام ختم کر کے کمرے میں آئی۔

سٹریوپہ اب چوتھا گانا چل رہا تھا۔

جگجیت سنگھ کہہ رہے تھے

ٹھکی ٹھکی سی نظر بیقرار ہے کہ نہیں

دبا دبا سا سہمی دل میں پیار ہے کہ نہیں

ٹواپنے دل کی جواں دھڑکنوں کو گن کہتا

میری طرح تیرا دل بیقرار ہے کہ نہیں

تیری اُمید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو

کچھ بھی مجھ پہ اعتبار ہے کہ نہیں

کچھ غزل کے الفاظ کا اثر تھا۔ کچھ جذبات کا غلبہ وہ چلتی ہوئی بیڈ کے قریب آئی۔ ایک نظر وال کلاک پہ ڈالی رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اُس نے موسیقی بند کر دی۔ کمرے کی مین لائٹ

بھی بند کر دی۔ اس ڈر سے کہ کسی کو اندر کا منظر نظر نہ آئے۔ جوں جوں رات بیت رہی تھی۔ اُس کا دماغ زیادہ اچھے سے کام کرنے لگا تھا۔

تو لیے کو پانی میں بھگونے کے بعد اچھی طرح نچوڑا۔

پہلے اُس پہ جھک کر اُسکی سیدھی ہتھیلی صاف کی جس پہ خون جما ہوا تھا۔ اسی طرح دوسرا ہاتھ بھی صاف کیا۔ اب غور سے اُسکو دیکھا تو دل کو کچھ ہوا۔

وہ بالکل بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ موٹی موٹی آنکھیں بند تھیں۔ پریشان گھیسو پیشانی پہ پڑے تھے۔ سر ہلکا سا ایک طرف کو مڑا تھا۔ دو چار سیکنڈ اُسکو دیکھتی رہی آیا سانس آ جا رہی ہے۔ مگر جتنی دیر وہ اُسکو دیکھتی رہی کوئی حرکت معلوم نہ ہوئی۔ پانی وغیرہ سب بھول کر بیڈ پر اُسکے کے برابر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ پہلے ناک کے آگے اُنکلی رکھی۔ کچھ محسوس نہ ہوا۔ نافہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ تیس چالیس سیکنڈ تک اُس نے اُسکے ناک کے آگے اُنکلی رکھے رکھی۔ مگر وہ سانس نہیں لے رہا تھا۔ گردن پہ کان کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُسکی نبض دیکھی۔ جو معمول کے مطابق تھرک رہی تھی۔ اُسے کچھ تسلی تو ہوئی مگر پھر خیال آیا۔ ہارٹ ایک والے بندے کی بھی نبض ہی تو یک دم نہیں رکتی ہے۔ اگر سانس نہیں لے رہا ہے۔ جسم میں آکسیجن کیسے جائے گی۔ آکسیجن نہ گئی تو دماغ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ قومہ میں تو نہیں چلا گیا۔ اتنی ہیوی بلیڈنگ کے بعد ہو سکتا ہے۔ اسکا شوگر لیول لو ہو گیا ہو۔ قوت مدافعت کمزور ہو جائے تو دماغ تک آکسیجن جانا بند ہو سکتی ہے۔

اُس نے سر جھکا کر اپنا کان اُس کے دل پر رکھا۔

ایک دو تین چار۔۔۔ مضبوط تو انا دھڑکن ایک تسلسل کے ساتھ قائم تھی۔

نبض چل رہی ہے۔ دل دھڑک رہا ہے۔ پھر یہ سانس کیوں نہیں لے رہا۔

منگو کا ایک ہاتھ سینے پہ دھرا تھا۔ دوسرا پہلو میں رکھا ہوا تھا۔

اُسکو خود کو احساس نہ ہو سکا کہ وہ آنسوؤں سے رو رہی ہے۔

”یہ سانس کیوں نہیں لے رہے۔“

”پلیز آنکھیں کھولیں۔“

پہلے اُسکے کندھے ہلائے۔ پھر اُسکے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیکر آواز دی۔
”پلیز مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے آنکھیں کھولیں۔“
منگو کا وجود بے حس و حرکت پڑا تھا۔

”فون؟۔۔۔ فون۔۔۔ میرا فون کہاں ہے۔ امی۔۔۔!!۔۔۔ انکو آ کر دیکھیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ مانی
آپی پلیز انکو بچالو۔۔۔ سانس نہیں آرہی۔۔۔“
وہ رونے کے ساتھ ساتھ آوازیں دیتی دروازے کی جانب بھاگنے لگی تھی۔ جب منگو نے اُٹھ کر اُسکا ہاتھ پکڑ
کر روک لیا۔

منگو حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ یہ سب بھول کر کہ اُسکی ماں اور بہن منگو کو یہاں موجود
پاکر تاحفہ کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ ہر خطرہ نظر انداز کر گئی۔ بدنامی بھی تو ہونی تھی۔
”امی جلدی آئیں ناں۔۔۔“
وہ ہسٹریا ہو رہی تھی۔ منگو نے جلدی سے اُسکے منہ پر ہاتھ رکھ کر آواز دہائی۔۔۔ اُسکو اپنے ساتھ لگا کر تسلی
دینے کی کوشش کی۔۔۔
”تاحفہ میں ٹھیک ہوں۔ کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے سامنے سانس لے رہا ہوں۔ بول رہا
ہوں۔“

وہ اب بھی نارمل نہیں ہوئی تھی۔ نیم تاریکی میں خالی الذہنی سے اُسکو دیکھنے لگی۔
”آپ کو سانس نہیں آرہی تھی۔“
”وہ میں نے جان بوجھ کر روکی تھی۔“
”کیوں۔۔۔؟۔۔۔“

مجھے یقین نہیں تھا تم میرے مذاق کو اتنا سنجیدہ لے جاؤ گی۔“
وہ دھیمی سی آواز میں بولی۔۔۔

”جس شخص کے بغیر آپ ادھر رہے ہوں۔ وہ آپکے سامنے بے جان پڑا ہو۔ آپ کیا کریں گے؟۔۔۔“

”میں معافی مانگتا ہوں۔“

اُس نے تاحفہ کی پیشانی پہ بوسہ لیا۔

نرم لمس سے اُس کے آنسو صاف کر دیئے۔

”میں ڈر گئی تھی۔“

”میں دیکھ سکتا ہوں۔“

”گوئی کیسے لگی؟۔۔۔“

”کام کے دوران۔۔۔“

”کیسا کام؟۔۔۔“

”نیک کام۔۔۔“

”اگر دل پہ لگ جاتی تو؟۔۔۔“

دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ منگو نے اپنی شہادت کی انگلی سے اُس کے چہرے پہ آئی آوارہ لٹ کوکان کے پیچھے اڑسایا۔

”تاحفہ موت برحق ہے۔ جس سے کوئی نہیں بھاگ سکتا۔“

”پر آپ تو موت کو ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔ جب تم میرے لیے دُعا کرو گی۔ مجھے کیا ڈر ہوگا۔“

”میں ایک دُعا بہت کرتی ہوں۔“

”وہ کیا؟۔۔۔“

”جب موت آئے۔ پہلے میرے طرف آئے۔“

کئی پل خاموشی میں گزر گئے۔ منگو نے گہرا سانس اندر کھینچا۔۔۔ مسکراتی ہوئی آواز میں بولا۔۔۔

”چلو آج ایک بات تو کلیئر ہو گئی۔“

”وہ کیا۔۔۔؟۔۔۔“

”وہ جو شاعر کہتا ہے۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“

تاشقہ کے گال سُرخ ہوئے۔ اُس سے نظر پُراتے ہوئے اُسکی آنکھوں کی بجائے نظر منگو کے گلے کی ہڈی پر جم گئی۔ جو اُسکے بولنے پر ہلتی تھی۔ تاشقہ کا جی چاہا ہاتھ لگا کر محسوس کرے۔

”سیماب آپنی مجھ سے آپکا نمبر مانگ رہی تھیں۔ وہ کہتی ہیں۔ انہیں علم ہے کہ میں کسی کے ساتھ انوالو ہوں۔“

منگو کے لبوں پہ بڑی جاندار مسکراہٹ۔۔۔

”تم نے کیا کہا؟۔۔۔“

”میں نے نمبر دینے کی حامی بھری ہے۔ مگر دو لگی نہیں۔“

”کیوں؟۔۔۔“

”آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ بیٹھنے سے خون نکلنے لگے گا۔“

”آرام بہت ہو چکا اب مجھے واپس جانا ہے۔ تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”جواب ضروری نہیں ہے۔ نمبر دینا بھی ضروری نہیں ہے۔“

”نمبر کس لیے چاہیے تھا؟۔۔۔“

”وہ۔۔۔“

تاشقہ نے اُسکی گرفت سے اپنے ہاتھ چھڑوائے اور بیلے سے کھڑی ہو گئی۔

”تاشقہ بات کرو۔ کیا وہ؟۔۔۔“

”وہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ جاننا چاہتی ہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گئی۔

”تاشقہ جی آپ مجھے تجسس سے کیوں مارنا چاہ رہی ہیں۔“

”وہ آپ سے پوچھنا چاہتی ہے۔ آپ مجھ سے شادی کریں گے۔ یا ویسے ہی دل لگی کر رہے ہیں۔“

منگو ہنسا اور پھر ہنستا چلا گیا۔

تاؤفہ پہلے پچھتائی کہ بھلا اسکے سامنے اس بات کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب مذاق بناتا رہے گا۔ جب وہ کافی دیر تک وقفے وقفے سے ہنستا رہا تو تاؤفہ نے ٹرسی کا گھٹن اٹھا کر اُسکی جانب اُچھالا۔ جسے کچھ کر کے اُس نے پوچھا۔

”تاؤفہ جی آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ بندہ شادی کرے گا یا صرف دل لگی تک رہے گا؟“

”مجھے لگتا ہے۔ آپ سے زیادہ مجھ پہ دل لگی کا الزام آتا ہے۔“

”اوہ۔۔۔ یہ بھی اچھا ہے۔ مگر کیسے۔۔۔؟“

”مجھے نہیں لگتا ہے۔ ہم کبھی اس سے آگے جا سکتے۔“

”وہ بیڈ سے نکلا اور کمرے کی لائٹ جلا دی۔“

تاؤفہ کی نظر سیدھی اُسکی ران پہ بندھی بینڈ تاج پہ گئی۔ سفید پٹی پہ سُرخ داغ واضح ہو رہے تھے۔

وہ اُسکے قریب آ کر بولا۔

”تم جب اپنے اور میرے حوالے سے کوئی بات کرو۔ میں تمہارا چہرہ دیکھتے ہوئے تمہیں سُنتا چاہتا ہوں۔“

اب بتاؤ ہمارا رشتہ کس مقام سے آگے نہیں جائے گا؟“

”جس مقام پر ہے۔ اس مقام سے آگے نہیں بڑھے گا۔“

”کیا میں یہ جاننے کی جسارت کر سکتا ہوں۔ اس قدر یقین کی بنیاد کیا ہے؟۔۔۔“

”میرے یقین کی بنیاد یہ ہے کہ آپ مجھ سے وابستہ تو ہیں۔ مگر مجھے جاننے نہیں ہیں۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے۔ رشتے قائم اور کامیاب تب ہی ہوتے ہیں۔ جب فریقین ایک

دوسرے کو جانتے ہوں؟۔۔۔“

”ہاں کم از کم ایک دوسرے کی خوبیوں، خامیوں کا ادراک ہونا چاہیے۔“

”تمہاری محبت کیا محبوب کو جان لینے کے بعد ہوتی ہے؟۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ جب تک آپ کسی کو برت نہیں لیتے۔ کسی کے ساتھ کچھ وقت نہیں گزارتے۔ اُسکی دن رات کی

روٹین قریب سے نہ دیکھی ہو۔ وہ اپنے قریبی رشتوں کو کیسے نبھاتا ہے۔ لین دین میں کیسا ہے۔ یہ سب تو برتنے

کے بعد پتا چلتا ہے ناں۔ تو پھر محبت پہلے کیسے ہو سکتی ہے؟۔ جو دو لوگ میلوں دور سے صرف فون کی تاروں سے جڑیں ہوں۔ اُنکا تعلق درچوئل سچائی تو ہے۔ مگر حقیقی سچائی نہیں ہے۔“

منگو بڑے غور سے اُسکو دیکھ رہا تھا۔

”تم دوبارہ سے موضوع کو اُس سچ پہ لے جا رہی ہو۔ جہاں ہماری لڑائی ہونا لازمی ہے۔“

”میں سچ بیان کر رہی ہوں۔“

”تمہارا سچ ہمیشہ منفی ہی کیوں ہوتا ہے؟۔۔۔“

”کیونکہ حقیقت منفی ہے۔“

تاشفہ کو اپنے آنسوؤں پہ سخت غصہ آرہا تھا۔

”اگر تمہارے میرے درمیان فرضی سچائی ہے۔ تو کیا تمہارے آنسوؤں کو اور جو تھوڑی دیر پہلے تمہاری میرے لیے فکر پریشانی تھی۔ یہ سب کچھ بھی فرضی ہے۔ نظر کا دھوکا ہے؟۔۔۔“

”دیکھا اب تو آپ کو سمجھ جانا چاہیے۔ ہر دفعہ میں آپکے لیے نئی ذہنی اذیت پیدا کرتی ہوں۔ آپ بہت جلد اُکتا کر بھاگ جائیں گے۔ میرے ذہنی مسائل ہیں۔ جنکا حل کسی کے پاس نہیں ہے۔“

وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ پاس گیا۔ اُسکی بھیگی پلکوں والی خوبصورت آنکھوں میں دیکھا۔ تاشفہ کے ہاتھ سے ٹشو لیکر اُسکا چہرہ صاف کیا۔

”ایک بات تو طے ہے۔ تمہارے اس رویے کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔ میں اپنے پراجیکٹ سے ذندہ سلامت نکل آیا۔ تو پھر تمہاری کھوج میں نکلوں گا۔ مگر ابھی کے لیے اتنا جان لو جان من۔۔۔ اگر آپکے پیارے کسی تکلیف میں ہوں۔ اُس صورت میں تعلق توڑ لینا عقل مندی نہیں ہے بلکہ اُس وقت میں دوست کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کہ ضرورت ہوتی ہے۔“

”اس بات پر میں آپکی ہی بات آپ کو ٹھانڈی لگی۔ وقت سے پہلے بڑے بڑے دعوئے نہیں کرنے چاہیے۔“

”تاشفہ میری محبت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت چاہتی ہو؟۔ تم ہر دفعہ مجھے خود سے دور دھکیلتی ہو۔ میں ہر دفعہ واپس تمہارے پاس ہی آتا ہوں۔“

”مجھے آپ سے فقط ایک وعدہ چاہیے۔“

”بولو۔۔۔“

”آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ کوئی آپکو میرے خلاف بہت غلط باتیں بتائے۔ مجھے بُرا بھلا بولے۔ میرے کردار پہ گند اچھالے آپکو مجھ سے نفرت ہو جائے۔ میری شکل دیکھنے کو بھی جی نہ مانے۔ تب بھی آپ مجھے دھکاریں گے نہیں۔“

”میں نے آج تک کسی دنیاوی رشتے سے کبھی کوئی اُمید نہیں باندھی۔ مگر پچھلے چھ سال سے آپ میری سوچوں کا محور ہیں۔ میں نے اپنے دل و دماغ کو صرف آپ کے لیے وقف رکھا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ دنیا میں اگر کسی عورت سے محبت کریں۔ تو وہ بس میں ہوں۔ آپ جس سے چاہے محبت کر لیں۔ جس سے مرضی شادی کر لیں۔ میں آپکی وفاداری نہیں مانگتی۔ میں فقط عزت مانگتی ہوں۔ جو میرا حق ہے۔ میں یہ مان مانگتی ہوں۔ آپ کبھی مجھے میرے ماضی کے حوالے سے پوچھ گچھ نہیں کریں گے۔ مجھے یہ مان چاہیے کہ میں نے اس اعلیٰ ظرف انسان سے محبت کی ہے۔ جس نے مجھے دنیا والوں کے سامنے معترف کر دیا ہے۔ مجھے آپکا مان چاہیے ہے۔ مجھے خود غرض سمجھیں۔۔۔“

منگو نے اُس کے کانپتے ہونٹوں پر اُنکی رکھ کر اُسکو خاموش کروا دیا۔

”تمہاری ساری گفتگو کے جواب میں ایک شعر کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اُس نے تافہ کے اوپر والے ہونٹ پر اُنکی پھیری۔۔۔ اور گٹھار بھری آواز میں بولا۔۔۔

سُرخِ اودھے بُلاں دی

ایسی تپسی مٹھلاں دی

تافہ سانس روکے اُسکو دیکھتی رہ گئی۔ جسکی آنکھیں جذبے لٹا رہی تھیں۔

”اگر کبھی آزمائش کا لمحہ آیا تافہ اور تم مجھے ڈمگاتے پاؤ تو میری نصیحت ہے۔ مجھے میرے ہی ہتھیار سے

سینے پہ گولی مارنا۔ میں غدار نہیں ہوں۔ پھر اپنی عزت کو کیسے دھوکا دوں گا؟۔۔۔“

اپنی بات پوری کرنے کے بعد وہ گُرسی پہ بیٹھ کر جوتے پہنے لگا۔

”پونے چار ہو گئے ہیں۔ اگر میں اندھیرے میں یہاں سے نہ گیا تو آگے جو ہوگا۔ اُسکی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جانے سے پہلے میں چاہتا ہوں۔ تم مجھے کوئی بہت اچھی بات بتاؤ۔ جسے سوچ کر میرا آج کا دن خوشگوار گزرے۔“

تاہفہ کچھ بھی کہے بغیر الماری تک گئی۔ بڑے ٹھہیہ خانے کی چابی لگائی۔ ایک کالے رنگ کا پیکٹ نکالا بیڈ کے پاس آئی۔ پیکٹ کی زپ کھول کر نیا کور سفید لٹھے کا مردانہ شلوار قمیض نکال کر بیڈ پر رکھا۔

وہ ایک جوتا پمپن چمکا تھا۔ دوسرا ہاتھ میں تھا۔ اور ہاتھ درمیان میں ہی رُک گئے۔ نظریں اُس سفید لباس پہ جمی تھیں۔ وہاں سے نہیں تو تاہفہ کے سنجیدہ چہرے پہ جاڑکیں۔

جو ایک دفعہ پھر الماری کے اُسی خانے تک گئی۔ واپس آئی تو ہاتھ میں لائٹ براؤن پشاور چمپل تھی۔ ایک دفعہ پھر مڑی اور اس دفعہ ہاتھ میں مردانہ پرفیوم اور ہیر برش تھا۔

وہ باکس دیکھ کر ہی جان گیا تھا۔ وہ اُسی برینڈ کا پرفیوم تھا۔ جو وہ روزمرہ استعمال کرتا تھا۔ وہاں اب بات کہنے سننے سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ وہ پوچھے بغیر بتا سکتا تھا۔ یہ ساری چیزیں اُسی کے لیے خریدی گئی تھیں۔

تاہفہ پہ نظر پڑی تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسکو دیکھ رہی تھی۔ جو جوتا پہنتا تھا۔ وہ بھی اُنا روایا۔

بیڈ پر رکھا لباس تھام کر واش روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد باہر آیا۔ اُسی خاموشی سے بیٹھ کر جوتے پہنے اور آکر اُسکے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تاہفہ نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ باکس سے پرفیوم برآمد کیا اور بازو لہبا کر کے اُسکی کالر کے اندر دونوں جانب گردن پہ لگایا۔

منگو بے ہیر برش اُسکے ہاتھ میں دیا اور سر کا نیچے جھکایا۔

تاہفہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں نمی۔۔۔ دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا کر اُسکے گیلے بالوں کو اُسی کے مخصوص سٹائل میں سیٹ کیا۔ اور ہاتھ واپس پہلو میں گرا لئے۔

منگو نے اُسکو بانہوں میں بھرا اور کان میں شرگوشی کی۔

”تھینک یو۔۔۔“

اُس سے دور ہوتے ہوئے آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

”اجازت ہے؟۔۔۔“

تافہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

اُس نے تافہ کی پیشانی چومی اور گند والے بیک میں اپنے پُانے جوتے ڈالے اور جس دروازے سے آیا تھا۔ اُسی سے باہر نکل گیا۔

تافہ نے برش بیڈ پر رکھا۔ اور تیزی سے دروازے تک آئی۔ صحن میں نظر دوڑائی مگر وہ اتنے سے وقت میں ہی غائب ہو چکا تھا۔

دل میں اُسکی سلامتی کی دعا مانگتے ہوئے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔

وہ خود تو چلا گیا تھا۔ مگر اُسکی خشو یہیں تھی۔ تافہ نے احتیاط سے سارا کمرہ سمیٹا۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ اور بیڈ پر اُسی جگہ لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ جہاں وہ لیٹا تھا۔ اُسی زاویے پر اپنا سر رکھا۔ جس زاویے پر اُس کا سر پڑا دیکھا تھا۔

مُسکراہٹ ہونٹوں سے جُدا نہ ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ نیند نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

☆.....☆.....☆

”موتی یار تو کدھر مرا ہوا ہے۔“

ساری رات سے گلزار اُسکا نمبر ٹرائی کر رہا تھا۔ جو صبح ساڑھے چار بجے جا کر اُٹھایا گیا۔ گلزار کا صبر جواب دے گیا تھا۔

”سائے ساری رات کا کدھر مرا ہوا ہے۔ تیرے گھر بھی ہو کر آیا۔ اُدھر بھی تالا لگا ہوا تھا۔“

”معاف کر دے یار امیرے کزن کی شادی تھی۔ اُس کے لیے پسرور گیا ہوا تھا۔ اُدھر سے آرہا ہوں۔“

”اوئے تو پسرور آیا ہوا ہے؟۔“

گھوڑے کے جوش کے جواب میں موتی نے ناگھچی سے ہاں کی۔۔۔

”کہاں پہنچے ہو؟۔۔۔“

”یار ایسا لکھوٹ سے دھرم کوٹ کو نکلنے والی سڑک پہ ہوں۔“

”شکر ہے اوما لکا۔ میں بھی ادھر ہی ہوں۔ دھرم کوٹ چوک پہنچنے میں کتنی دیر باقی ہے؟۔۔۔“

”یہی کوئی پانچ دس منٹ کیونکہ سڑک بنی ہوئی ہے۔ اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم ادھر رُک کر ہمارا انتظار کرو۔ میں سفید رنگ کے مزدے میں ہوں۔ بس تمہیں دس پندرہ

منٹ ہی رُکنا پڑے گا۔ ہم قریب ہی آگئے ہیں۔ کیا تم اپنی گاڑی پر ہو؟۔“

”نہیں یار یہ شہزادی کرائے پہ لی ہے۔ گرے رنگ کی مرسدی ہے۔ سمجھا کر اپنے ٹور دیکھ کر ایک دفعہ تو

رشتے داروں کی انگلیاں منہ میں رہ گئیں۔“

”مجھ بے غیرت کو رشتے داروں کی پڑی ہوئی ہے۔ پیچھے ہماری بینڈنگ گئی ہے۔“

ہائے ایسا کیا ہو گیا؟۔۔۔“

”یار بس دنوں کا ہیر پھیر چل رہا ہے۔ آج ہی ہیڈ آفس خالی کرنا پڑا۔ ساری رات نکل گئی۔ مگر اللہ کا شکر

ہے۔ ساری صفائی ہو گئی۔“

”یار اچھے تیری بات کی کچھ سمجھ نہیں آرہی۔“

”موتی یار نشہ تو کرتا نہیں ہے۔ مگر ہے تو پکا جاج۔۔۔ سیدھی سی بات ہے۔ پر تیری کھوپڑی میں نہیں آتی۔“

”تو بھی تو سیدھے سے بتانے کی بجائے پتا نہیں کیا پہیلیاں شروع کر دیتا ہے۔“

”یار ہم لوگ خطرے میں ہیں۔ ڈاکٹر کے پیچھے کوئی ایجنسی لگ گئی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نے سارا کام بند

کرنے کا بولا ہے۔۔۔ خود بھی یہاں سے جا رہا ہے۔ پہلے کراچی اور پھر وہاں سے بیرون ملک۔ وہاں بیٹھ کر

پیسہ پھینکے گا۔ کیس کی فائل دب جائے گی۔ پھر کوئی ایس ایچ او آئے گا۔ فائل کو ہمیشہ کے لیے غائب کروادے

گا۔ اس طرح سے ڈاکٹر پھر اپنے کام پر واپس آجائے گا۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا یار کیا ہماری نوکری بھی گئی؟۔۔۔ میں نے تو اتنی بڑی کمپنی ڈالی ہوئی ہے۔ وہ کہاں سے

دیا کرونگا۔“

”اوہ موتی تو اپنا جگر ہے یار۔ پھر کاہے کو گھبرانا۔ میں نے وہاں سے اتنا مال تو اڑا ہی لیا ہے۔ جو تیرا میرا خرچہ نکالتا رہے گا۔“

”کیا مطلب ہے؟ پیسے چوری کر کے لائے ہو۔“

”اوہ ڈگ دمانہ۔۔۔ ڈاکٹر کا حکم تھا۔ پُرانا سارا ریکارڈ جلا دیا جائے۔ جو زیادہ اہم ہے وہ پسرو والے اُنکے پُرانے گھر میں منتقل کر دیا جائے۔“

”اچھا تو تم اب وہاں جا رہے ہو؟“

”ہاں تو اور کیا یہ سڑک نتھیا گلی کو جاتی ہے؟“

موتی کا تہقہ بڑا جا ہمار تھا۔

”بے غیرت ہنس رہا ہے۔ آج ہی کام کا دن تھا۔ اور تو کزن کی شادی پہ مرنے اڑتا رہا۔ اوئے مجھے تیری گاڑی نظر آ گئی ہے۔ سالے اس گاڑی کا تو کرایہ بھی پچاس ہزار سے کم نہیں ہوتا۔“

”مجھے کیا علم تھا۔ اپنی روزی روٹی پہ لات پڑنے والی ہے۔ میں اپنی کٹارہ پہ ہی آ جاتا۔“

سفید مزدہ دھرم کوٹ چوک میں رُکا۔ گلزار اگلی سیٹ سے نکل کر وہاں کھڑی مرسیڈیز ٹوئٹی ٹین جی ایل کے کلاس کی جانب بڑھ گیا۔

گلزار موتی کے برابر بیٹھے ہوئے حیرت سے بولا۔

”سالے بڑی ٹشپوئیں مار رہے ہو۔ لگتا ہے آج اپنا شیر نہایا ہے۔“

”کر لے کر لے گئے والی۔ میں روز ہی نہاتا ہوں۔“

مزدہ آگے نکل گیا۔ موتی نے گاڑی اُسکے پیچھے لگائی۔

”ہاں آج صابن سے نہائے ہوئے ہو۔“

موتی نے ہنسنے پر اکتفا کیا۔

”مزدے میں کون کون ہے؟۔۔۔“

گلوڑار کے چہرے پہ ایک سایہ گدرا۔۔۔

”کچھ سامان ہے۔ کچھ استعمال شدہ لاشیں۔“

موتی کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔۔۔

”مجھے علم ہے۔ میں تمہارے جیسا فنکار نہیں ہوں۔ اس لیے سادہ الفاظ میں بات کیا کرو۔ اب بتاؤ دوسری

گاڑی میں کون کون ہے؟“

”ڈرائیور ہے۔ اور ایک گارڈ باقی کچھ سامان اور بچے۔“

”کتنے بچے۔۔۔؟۔۔۔“

گلوڑار کے چہرے پہ رقم تھا کہ یہ معلومات دینا اُسکے لیے آسان کام نہ تھا۔

”دس۔۔۔“

”اوہ تو کیا وہ اب ڈاکٹر کے پُرانے گھر رہیں گے؟“

”تو یہ سوال وجواب بند کر کے گاڑی کی رفتار تیز کر۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی جان جائے گا۔ اُنکے ساتھ کیا

ہونے والا ہے۔ بلکہ آج تیری وقاداری کا ٹیسٹ ہے۔“

”کیسی وقاداری اور کس سے وقاداری؟۔۔۔“

”پروفیشنل وقاداری پیارے پروفیشنل وقاداری۔۔۔ جس کا کھانا اُسی کا گانا والی وقاداری۔“

”تمہاری باتیں سر پر سے گزرتی ہیں۔“

گلوڑار بے ہنگم تہقہ مار کر خاموش ہو گیا۔

گاڑی میں عجیب سی خاموشی کا راج ہو گیا۔ ایک اور چوک آیا۔ جس پر موتی نے پوچھا۔

”بھلا یہ کونسی جگہ ہے؟۔۔۔“

”یہ وڈالا سندھواں ہے۔“

”پسرور کتنی دور ہے؟“

”پیارے پیارے بہت دور ہے۔ ابھی وڈالا آیا ہے۔ پھر سرانوالی آئے گا۔ اُسکے بعد میاں والی بنگلہ اُس

سے آگے سترہ۔۔۔ اُسکے آگے پناں دا تھے۔ پھر کہیں جا کر پسرور آئے گا۔“

”بڑا لمبا سفر ہے۔“

”ہاں مگر اتنا بھی نہیں۔ جتنا لمبا سفر زندگی کا ہے۔“

”کہاں یا زندگی تو آج کل انتہائی مختصر ہو گئی ہوئی ہے۔“

”ہاں کئی تو جینے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔“

موتی نے تعجب سے پوچھا۔

”حیرتی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”یار تجھ سے کیا چھپانا۔ آخر آج حیرے ہاتھ سے نکلی گولی سے بھی آج کچھ جانیں جانی ہیں۔“

”کس کی گولی کس کا ہاتھ میں نے تو آج تک بندوق کی شکل تک نہیں دیکھی۔“

”آج دیکھ لے گا۔ کیونکہ ڈاکٹر نے آخری حکم دیا ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“

”جب وہ کسی کی موت چاہتا ہے۔ تو وہ آخری حکم جاری کرتا ہے۔ تاکہ اُس آدمی کو گولی مار دی جائے۔“

”آج کس کو گولی مارنے کا حکم ہوا ہے۔“

ٹھلوار کافی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”میاں والی بنگلہ آئے تو بیل پار کرنے کے بعد گاڑی اُلٹے ہاتھ کو جانے والی مکی سڑک پر ڈال لینا۔ وہاں

تمہیں اپنے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔“

”اس گفتگو کے دوران دو دفعہ سر گھمانے کے بہانے موتی نے اپنے کام میں موجود آٹے کو ٹھیک کیا تھا۔

ٹھلوار کے فرشتوں کو بھی نہ خبر تھی۔ کہ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی تیسرا بھی سُن رہا ہے۔

میاں والی بنگلہ آیا۔ بیل سے اترتے ہی موتی نے گاڑی مزدے کے پیچھے بائیں ہاتھ کو ڈال دی۔ راستہ کچا

تھا۔ اور مزدے نے خوب دھول اڑائی۔ جو پوری سپیڈ سے بھاگتا جا رہا تھا۔

دو چار کلو میٹر جانے ایک سُنسان سے مقام پر آخر کار مزدہ رُک گیا۔ نہر کے کنارے اُگی کائی کی لمبائی

سات آٹھ ٹٹ تھی۔ جس میں بہت اونچی قامت والا انسان بھی آسانی سے غائب ہو جاتا۔

موتی نے مزدے سے ہٹ کر پیچھے ہی گاڑی روک دی۔

اُس کے دل کی دھڑکن بڑے ٹھہرے اور تحمل انداز میں چل رہی تھی۔ آنکھوں میں گہری وحشت تھی۔ مگر دل کی گہرائیوں میں خطرناک ارادے تھے۔ بہت ہی خطرناک۔۔۔

”گلو ار گاڑی سے نکل کر مزدے کی جانب گیا۔ جبکہ موتی گاڑی سے نکل کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

دور افق پر سورج نے اپنی پہلی جھلک دیکھنا شروع کر دی تھی۔

تاریکی کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ یہ ظلمت کے آخری پل تھے۔

موتی نے اپنی ساری زندگی اس سے خوفناک اور بے بس منظر نہیں دیکھا تھا۔ جو وہ اس وقت دیکھ رہا تھا۔

دس سے پندرہ سال کی عمر کے دس بچے جن کی آنکھوں پہ کالی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جن کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے۔ اُن پر ماسور گارڈ نے کلاسکوف پہنی ہوئی تھی۔ جانوروں کی طرح اُنکو ہانک کر کائی کے پیچھے لیکر جا رہا تھا۔

موتی کی مٹھیاں اتنی زور سے بند تھیں۔ کہ اُنکھوں کی گرہیں سفید ہو رہی تھیں۔

جڑے کی ہڈی سختی سے بچینی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔

گلو ار نے ٹی ٹی کامیگزین چڑھایا اور موتی کی سمت میں دیکھ کر آکھ مارتے ہوئے بولا۔

”آجاشنہادے تجھے نئی دنیا کی سیر کرواؤں۔ جہاں انسان کی قیمت سالے گئے سے بھی گئی گزری ہے۔“

موتی اُسکے پیچھے آیا۔ تو قدم مضبوط گردن اٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے مٹھیاں کھول کر ہاتھوں کو دو چار دفعہ کھولا

بند کیا۔

کائی کی اندر گارڈ نے تمام لڑکوں کو ایک لائن میں کھڑا کیا ہوا تھا۔ اُنکے چہرے نہر کی جانب تھے۔

گلو ار کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ جب وہ بولا۔

”اللہ کی قسم مجھے آج بھی بندہ مارتے ہوئے اُتار ہی ڈر آتا ہے۔ جتنا ڈر پہلی دفعہ انسانی جان لینے پر آیا تھا۔

میں کئی کئی دن سو نہیں پاتا۔ مگر میں یہ سب کرنے پر مجبور ہوں۔ مجھے اللہ معاف کرے۔“

اُس نے ٹی ٹی لائن میں سب سے پہلے لڑکے کے سر پر تانا۔ گولی چڑھائی۔

اس بات سے بے خبر کہ اُس کے پیچھے کھڑے موتی کا ہاتھ اپنے ہولشر کی جانب گیا تھا۔ کالا لک اُس اُسکے ہاتھ میں تھا۔

فضا میں فائر کی آواز گونجی بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔

گارڈ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلیں اس سے پہلے کے وہ موتی کا نشانہ لیکر وار کرتا۔ موتی کے گالک سے ایک اور گولی نکلی اور گارڈ کا کام کر گئی۔

گلو ار مٹی پہ گرا اپنے آخری سانس بھر رہا تھا۔ موتی آن اُسکے سر پہ کھڑا ہوا۔

”میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر تمہارے اندر کی سفاکی نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ تم ڈاکٹر کے کام کو غلط سمجھتے تھے۔ مگر تم نے کبھی اس ظلم کو روکنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ آج کس قدر بے دردی سے ان بچوں کو مارنے والے تھے۔ میں اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں۔ تمہیں ایک لاوارث لاش بنا کر پانی میں نہیں پھینکو گا۔ بلکہ تمہاری لاش کو تمہارے ورثہ تک پہنچا دیا جائے گا۔“

اس دوران وہاں پر دو گاڑیاں آن رُکی تھیں۔ جن میں سے مَل چار آدمی نکلے۔ اور ہاتھوں میں ہتھیار لیے ایک تو مزدے کے ڈرائیور کو قابو کر کے کھڑا ہو گیا۔ باقی کے تینوں گاڑی کے پیچھے بھاگے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

موتی کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ جس سے وہ بچوں کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ رہا تھا۔

اپنے بندوں کو دیکھ کر وہ اپنا کام اُن کو سونپ کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے۔ تیز بولتا ہدایت دے رہا تھا۔۔۔

”کوشش کرنا ان لوگوں کی غیر موجودگی کی خبر اگلے تین چار گھنٹے تک لاہور نہ پہنچے۔ مجھے ڈاکٹر تک پہنچنا

ہے۔ باقی کا پلان منیر دیگا۔“

”جی سر۔۔۔ اللہ نگہبان۔۔۔“

”اللہ نگہبان دوست۔۔۔“

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ سڑک تک آنے تک اُس کے پیچھے صرف دھول کے بادل بچے تھے۔
جی ٹی روڈ پہ گاڑی اپنی منزل کو ڈالنے کے بعد اُس نے فون ملا کر پیکر آن کیا۔
فون سٹیرنگ کے نیچے ڈیش بورڈ پر رکھ کر اپنا سارا فوکس سامنے روڈ پر رکھا۔
”ہیلو سر۔۔۔ شکر ہے آپکی کوئی خبر تو آئی۔“

”منیر۔۔۔“

”جی سر۔۔۔“

”یہ بیویوں والے ڈائلاگز مت مارا کرو۔ میری بات غور سے سُنو۔“

”جی سر۔۔۔“

”ڈاکٹر نعیم آج کسی وقت کراچی کے لیے نکلنے والا ہے۔ اگر میرے اُس تک پہنچنے سے پہلے وہ نکل گیا۔ تو پوری تسلی کرو وہ انرپورٹ پر روک لیا جائے۔ اُسکا بھائی وسیم فیملی کے ساتھ ہوگا۔ اُسے بھی دھرو۔ باقی چار ٹیمیں تشکیل دیکر جتنی جگہوں سے ہم نے دورانِ تفتیش مال برآمد کیا ہے۔ اُن جگہوں پہ فل آن ریڈ پڑوانی ہے۔ اس ایکشن میں اپنے ساتھ سوائے رہنجز کے اور کسی کو شامل نہ کیا جائے۔ ساری ریکوری سارا کچھ اٹھیہ رکھا جائے گا۔ میڈیا میں بھی وہ خبر جائے گی جو ہم بھیجنا چاہیں گے۔ سُن رہے ہو؟“

”جی سر۔۔۔“

”تمام ٹیمیں ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رہ کر ایک وقت میں ہی ایکشن کریں تاکہ ایک پارٹی کو دوسروں کو الٹ کرنے کا وقت نہ مل سکے۔“

”جی سر۔۔۔“

”ڈاکٹر کی طرف میں خود جاؤں گا۔ کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جی سر۔۔۔“

”جنٹلمین گیٹ ٹو ورک اللہ پاک ہمارے حامی و ناصر ہوں۔“

”انشا اللہ سر۔۔۔ اللہ تمہاں سر۔۔۔“

”اللہ نگہبان۔۔۔“

کال بند ہوتے ہی اُس نے گاڑی اگلے گٹر میں ڈالی اور ایکسپریس پر دباؤ بڑھا دیا۔

گاڑی ہوا سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ حالانکہ جس سڑک پہ وہ جا رہا تھا۔ وہ پنجاب کی مصروف ترین سڑکوں میں شمار ہوتی ہے۔ اب بھی چھ بجے جانے والے بسوں کے نمبر نکل چکے تھے۔ اور رنگ برنگی بسیں اپنے مخصوص ہارن بجاتی بڑی شان سے آ جا رہی تھیں۔ اسکے علاوہ دودھ کے گوالے مختلف دیہاتوں سے دودھ لیکر شہر کو روانہ تھے۔ اس دفعہ پھر اُس نے گاڑی دھرم کوٹ چوک سے شارٹ کٹ درمیان سے جانے والی سڑک پر ڈالی جو آگے جا کر کاموکی کے قریب ٹکٹی تھی۔

لاہور پہنچتے پہنچتے آٹھ بج گئے تھے۔ ٹول پلازہ پہ پیسے دینے کے لیے وہ ڈیش بورڈ کے دراز کی جانب ٹھکا تو نظریٹ کے نیچے گری یو ایس بی پر پڑی۔

ماتھے پہ تیوری آئی۔ وہ یو ایس بی اُسکی نہیں تھی۔ تھینا گلزار کی جیب سے گری تھی۔ ڈیش بورڈ میں اُس نے ہر وقت تھوڑا ٹھہرا رکھا ہوتا تھا۔

راوی کے پل سے رنگ روڈ کی طرف ڈال کر اُس نے ٹھک کر یو ایس بی اٹھائی۔ یو ایس بی میں کیا ہے۔ جاننے کے تجسس میں اُس نے گاڑی اگلے شولڈر پہ اتار لی۔ گاڑی سائیڈ پہ روک کر اپنی ڈیکی میں رکھا لیپ ٹاپ نکال کر لایا۔

ڈرائیونگ سیٹ پہ ٹانگیں باہر کو لٹکا کر بیٹھتے ہوئے اُس نے لیپ ٹاپ آن کیا۔ جب ونڈوز آن ہو گئیں تو یو ایس بی لگائی۔

اسکے ساتھ ہی انگلیاں تیزی سے کے ساتھ کیز پر بھاگنے لگیں۔

یو ایس بی میں کئی فائلز سیو تھیں۔

وہ سرسری سب پر نظر ڈال رہا تھا۔ جب سب سے خلی فائل کے ٹائٹل نے حیران کیا۔

”انجیلز ان ہیل۔۔۔“

اُس نے سب سے پہلے وہی فائل کھولی۔

اُس قائل میں فقط دو ویڈیوز تھیں۔

وہ جانتا تھا۔ ان ویڈیوز میں کچھ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی اُس نے اندر ہی اندر دُعا کی ”یا اللہ رحم۔۔۔“
”پہلی ویڈیو میں سب سے پہلے نظر آنے والا چہرہ ڈاکٹر نعیم کا تھا۔ جس کے ساتھ ایس ایچ اوسر فراز موجود تھا۔

اگلا چہرہ جو کیمرے کی آنکھ نے کیچ کیا تھا۔ وہ ہابر مراد کا تھا۔

سہا ہوا چڑیا کا بچہ بھرائی ہوئی آنکھیں کپکپاتے لب چہرے پر آنسوؤں کے نشان۔۔۔ اُس کے آگے بس انسانیت کی نچلے سے بھی نچلے درجے کی تذلیل رہ گئی۔

اُسکو لگا وہیں بیٹھے بیٹھے بصارت پتھر اگئی ہے۔ سماعت میں سوائے آہوں اور سسکیوں کے اور کچھ نہ بچا۔

اینڈ پر ایک تصویر تھی۔ ہابر مراد کو مُردہ وجود کی تصویر۔۔۔“

پانچ منٹ تک بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کے بعد اُس نے اگلی ویڈیو پر کلک کیا۔

ویڈیو چلتے ہی اُسکے سر پہ آسمان آگرا۔

جس کے بلے تلے وہ دھنستا چلا گیا۔

وہ ایک دس سالہ بچی تھی۔ جو چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ اُس کو دو لوگوں نے پکڑ رکھا تھا۔ سکول یونیفارم پہ دو پونیاں پہنے گلے میں پانی والی بوتل لٹک رہی تھی۔

”بھائی کو چھوڑ دو۔ میرے بھائی کو چھوڑ دو۔ اُسکو موت مارو۔ اُسکا خون نکل رہا ہے۔ عابدین آنکھیں کھولو۔

عابدین سانس نہیں لے رہا ہے۔ امی جی کدھر ہیں۔ آکر دیکھیں عابدین سانس نہیں لے رہا ہے۔ میرے ابو

کدھر ہیں۔ میں نے اپنے ابو کے پاس جانا ہے۔“

وہ اپنے بازو ٹھہرانے کی کوشش میں اُچھل اُچھل کر کک مار رہی تھی۔

تب کیمرے کے پیچھے سے ایک آدمی سامنے آیا۔ اُس نے لڑکی کے گال پر بے دردی سے تھپڑوں کی بارش کر دی۔

”چیخ چیخ ہی بند نہیں ہو رہی۔ تم دو سائڈ سے ایک بالشت بھر کی لونڈی نہیں قابو ہو رہی۔ سارا مزا خراب

کر دیا۔ اُس نے لڑکی کی پونی پکڑ کر پوری قوت سے کھینچی جس سے وہ تڑپ تڑپ گئی۔ جبکہ وہ آدمی اُسکا گال پہ بوسہ لیتے ہوئے خباثت سے بولا۔

”چلو وہ تو لڑھک گیا۔ کیا خیال ہے۔ کیوں نہ لگے ہاتھ تمہاری بھی بولتی بند کر دی جائے۔“

تبھی کمرے کا دروازہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ایک مردہ بچے کی تصویر آئی۔ ادھر ویڈیو بند ہو گئی۔ اُسکواپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

سالوں گزر جانے کے باوجود وہ وقت ابھی تک بھولا نہیں تھا۔ عابدین عباس کوئی اور نہیں تاحفہ عباس کا بھائی تھا۔ ویڈیو میں موجود لڑکی بھی تاحفہ عباس تھی۔

غصے اور نفرت سے منگو کا جسم کانپ رہا تھا۔ یو ایس بی نکال کر اپنی جیب میں رکھی۔ لیپ ٹاپ ایک طرف ڈالا۔ گاڑی واپس جی ٹی روڈ پر آ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ڈاکٹر کی ذاتی رہائش گاہ پہنچا۔ اب معاملہ ذاتی نوعیت کو ہو گیا تھا۔ یا جان نہیں یا مان نہیں۔ کہتے ہیں ناں محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

دور سے ڈاکٹر کے گھر کی عمارت کو تاڑتے ہوئے وہ گاڑی سے نکلا۔ ڈکی کھول کر سامنے پڑے سامان میں سے ہلٹ پروف جیکٹ اٹھا کر پہنی۔ سر پہ ہیلیمٹ پہنا۔ تقریباً چار پانچ فل میگزین اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونسنے۔ گا لگ پہلے ہی ہولسٹر میں تھا۔ اُسکو نکال کر ٹانگ پہ باندھا۔ اور اپنی رشمن میڈائے کے ٹولیو اٹھانے کے بعد گاڑی کو لاک کرتا۔ ہوا سیدھا ڈاکٹر کے گیٹ کی جانب گیا۔ پہلے اُس نے اپنا وائرلیس سسٹم سیٹ کر کے گریں ٹوگو کا سگنل دیا۔

ساری عمارت گاڑی کے گھیرے میں تھی۔

بارہ راؤنڈ کے میگزین کو اُس نے بڑے اطمینان سے ایک ایک گولی کر کے فائر کیا۔

وہ جو گاڑی کی فوج نظر آرہی تھی۔ لمحوں میں ہی شدید کر اس فائرنگ کے بعد خاموشی چھا گئی۔

پوری طرح الرٹ ہو کر ہر سمت میں دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھتا رہا۔ ساری عمارت میں افراتفری پھیل گئی۔

اُس نے کسی کو بھی جان سے نہیں مارا بلکہ ٹانگ یا ہاتھ پر مار کر راستے سے ہٹایا۔

زخمی گارڈ کے سر پہ رُک کر پوچھا۔

”ڈاکٹر کدھر ہے؟۔۔۔“

”مجھے نہیں پتا۔“

اُس نے ایک دفعہ پھر اے کے بارہ سیدھی کی اور گارڈ کی دوسری ٹانگ پر گولی مار دی۔

جس سے وہ روتا بلکتا ترہا بولتا چلا گیا۔

”پہلی منزل پر اُس کا کمرہ ہے۔ اس وقت ڈاکٹر ادھر ہی موجود ہے۔“

”یہی بات پہلے بتا دیتے تو اچھا نہیں تھا۔“

اندر داخل ہونے تک کوئی مزاحمت نہیں ہوئی مگر جیسے ہی وہ داخلی دروازے سے اندر گیا۔ آگے سے

زبردست فائرنگ سے واسطہ پڑا۔ اگر وہ بروقت پیچھے کوند ہوتا۔ تو یقیناً گولی اُس کے سر کو ہیلو ہائے کر گئی ہوتی۔

اندر سے لگا تار فائر آتے رہے۔

اُس نے مین دروازے کی بجائے کچھلی جانب کا جائزہ لیکر پائپ کے ذریعے پہلی منزل پر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

بندوق کا ہیلت گلے اور کندھے پہ ڈال کر تالی نیچے کور کھی۔ اور بڑی تیزی سے پائپ کے ذریعے چڑھ کر پہلی منزل

کی گھلی کھڑکی میں کود گیا۔

وہاں بہت سے کمرے تھے۔ جن میں عام طور پر یہ پتہ لگانا مشکل ہوتا کہ ڈاکٹر کس کمرے میں ہوگا۔ مگر اس

وقت دو گارڈ ایک دروازے کے سامنے ہائی الرٹ کھڑے تھے۔

اُس کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔

دو گولیاں اور دونوں گارڈ گر گئے۔

دروازہ اندر سے لاک تھا۔ اُس نے لاک کا نشانہ لیکر گولی چلائی۔ لاک ٹوٹنے ہی دروازہ وا ہو گیا۔ جسے

پوری طرح کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔

ڈاکٹر گہرے نیلے رنگ کی ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس اپنے اُڑے ہوئے حواس کو قابو کرتے ہوئے فون پہ کسی

کو گالیاں دے رہا تھا۔ مدد ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ کس ادارے کی جرات ہوئی جو اُس نے مجھ جیسے شریف اور معزز شہری کے گھر پر اس طرح سے دھاوا بولا ہے۔“

اُس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ آگے بڑھ کر ڈاکٹر کے ہاتھ سے فون لیکر دیوار میں مارا اور اُس کے اوپر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

پہلے تو وہ کھلا ہٹ کا شکار نعیم مار کھاتا گیا۔ مگر پھر آگے سے تھوڑی مذاحمت کرنے کی کوشش میں اور بھی پٹا۔
 ”چلو اب ہاتھ پاؤں مارنا بس کرو۔ باعزت شہری۔ کیونکہ آج تمہیں بچانے کوئی نہیں آرہا۔ اس وقت اس کمرے میں تم اور میں ہیں۔ اور ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ سلامت یہاں سے نکل کر جائے گا۔“
 ”موتی تم۔۔۔؟۔۔۔ میرے ملازم ہو کر تم نے مجھ سے غداری کی ہے؟۔“

”میں تمہارا ملازم نہیں۔ اپنے آپ کا ملازم ہوں۔ موتی تم تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھا۔“
 ”تو پھر تم کون ہو؟۔۔۔“

اُس نے اپنے چہرے پہ لگائی نکلی داڑھی اُتار دی۔

”میرا خیال ہے۔ تمہیں اندازہ لگانے کی اجازت دی جانا تمہارا حق ہے۔“

ڈاکٹر کے چہرے پہ ایک سایہ سا گھبراہٹ۔

”منگو۔۔۔؟۔۔۔“

”تم شاطر ہو۔ اور شاطر انسان کی سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ وہ دماغ کا استعمال کرنا جانتا ہے۔ اب ذرا نکلاؤ اپنے آدمیوں کو۔ ایک سال کا کتابت اپنی حفاظت کے لیے خرچ کرتے ہو۔ اتنی اتنی مہنگی کمپنیوں کے جدید ترین ٹریننگ لیکر آنے والے گارڈ رکھے ہوئے ہیں۔ تمہارے کمرے تک آتے ہوئے مجھے ٹوٹل چھ منٹ لگے ہیں۔ دو تو پائپ چڑھتے ہی لگ گئے۔ وہ دو منٹ نکال لو تو پیچھے بچے چار منٹ۔۔۔ تمہارے گارڈ صرف چار منٹ تک تمہیں محفوظ رکھ سکے۔ وہ بھی اس لیے کیونکہ تم اندر تھے۔ باہر ہوتے تو اللہ کہ قسم میں ایک منٹ بھی ضائع نہ کرتا۔“

ڈاکٹر کے منہ ناک سے خون نکل رہا تھا۔ ترتیب سے سجے رہنے والے بال گھونسلا بن گئے تھے۔ بیڈ پہ گرا

ہانپ رہا تھا۔

اپنے ہاتھ سے منہ ناک کو محسوس کرنے کے بعد منہ سے خون تھوک کر بولا۔

”جس نے تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے۔ میں تجھے اُس سے دو گنی قیمت دینے کو تیار ہوں۔“

”تو میری قیمت لگائے گا؟۔۔۔“

منگو نے اپنی بندوق کا دستہ رکھ کر اُس کے دانتوں پہ مارا۔۔۔ خون کا فوارا چھوٹ گیا۔ جس میں یہ دیکھنا مشکل تھا۔ کتنے دانت ٹوٹے۔

”پلیز مجھے مزید نہ مارو۔“

”بتا با بر مراد کو کیسے اغوا کروایا؟۔۔۔ اُس کو ہی کیوں؟۔۔۔“

”میں سب بتا دوں گا۔ اگر تم مجھے مزید نہ مارنے کا وعدہ کرو۔ میں اپنا ہر جرم قبول کر لوں گا۔ مجھے گرفتار کرلو۔ میں اپنا کیس عدالت میں لڑنا چاہتا ہوں۔“

”تم مکار ہو۔ تو میں تم جیسوں کی سانس پینے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ مجھے میرے سوال کا جواب دو۔ اُسکے بعد میں اپنا ارادہ بناؤں گا کہ تمہارے ساتھ کیا کرنا ہے۔ منہ کرنا ہے۔ تم مجھے کس حد تک سچائی بتاتے ہو۔“

”میں سب بتا دوں گا۔ با بر مراد کے ماں باپ میرے ریگولر کسٹمرز ہیں۔ وہ ہر دفعہ اپنی ماں یا باپ کے ساتھ میرے کلینک آتا تھا۔“

”پھر۔۔۔؟۔۔۔“

”ڈاکٹر نے بیڈ شیڈ کے ساتھ اپنا منہ صاف کیا۔ لہوڑ کا نہیں تھا۔“

”مجھے وہ اچھا لگتا تھا۔ وہ جب بھی میرے کلینک پہ آیا۔ میرا جی چاہتا کسی طرح اسکو پُرا لوں۔ مگر میں چیک اپ کے بہانے سوائے چھونے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی اس بے بسی پہ غصہ بھی بہت آتا تھا۔“

منگو اپنے فون پہ اُسی ویڈیو بنا رہا تھا۔

”اُس تک رسائی کیسے حاصل کی؟۔۔۔“

”میں نے اُسکی گلی میں جو ایک دوکان والا ہے۔ اُسکو خریدا تھا۔“

”کتنے میں؟۔۔۔“

”پندرہ لاکھ میں۔۔۔ یہ اُس نے منہ سے مانگا تھا۔ اگر وہ اُس وقت مجھ سے دو کروڑ کا مطالبہ کرتا۔ میں اس قدر بے تاب تھا۔ میں دو کروڑ بھی دینے کو تیار ہو جاتا۔“

”وہ دکان دار پندرہ لاکھ لیکر مان گیا؟۔“

ڈاکٹر طنز یہ ہنسا۔۔۔

”تم کیا سمجھتے ہو؟ سارا معاشرہ تم جیسا غیرت مند ہے؟ اُس دکان دار نے اس کے علاوہ مجھے لڑکوں کی وڈیوز بنا کر بیچی ہیں۔ بچے جب اُسکی دکان پہ آتے ہیں۔ بہانے سے اُنکو اندر نکالتا ہے۔ فری میں چیزیں دینے کے لالچ میں اُن سے چھوٹی موٹی جنسی شرارتیں کروا کر ریکارڈ کرتا ہے۔ پھر میرے جیسے بیوپاریوں کو بیچتا ہے۔ جنگلی ڈائریکٹ انٹرنیشنل مارکیٹ تک رسائی ہے۔ ہم آگے مہنگے دام بیچ کر منافع کماتے ہیں۔ خود بھی کھاتے ہیں۔ یاروں کو بھی کھلاتے ہیں۔“

اُس دن شام کے وقت بابر اُسکی دکان پر آیا تھا۔ جسے اُس نے نشہ آور گولیاں جوس میں ملا کر پلانے کے بعد اپنے گھر لے گیا۔ جو کہ دکان کے عقب میں واقع ہے۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد میرے بندے جا کر اُسکو لے آئے تھے۔“

”اغوا کرنے کے کتنے دن بعد اُسکی موت ہوئی؟۔۔۔“

فییم نے نظر پڑائی۔۔۔ مگر منگو کے جوتے سے لگی ٹھوکر نے منہ کھول دیا۔

”وہ اُسی دن ہی مر گیا تھا۔“

”کون کون؟۔۔۔“

”میں اور ایس ایچ او۔ ساتھ میں پروفیسر بھی تھا۔“

”ویڈیو میں تو تم اور ایس ایچ او ہو۔“

”پروفیسر کبھی ویڈیوز میں نہیں آیا۔ اُسکو اپنا آپ ظاہر کرنا پسند نہیں ہے۔ دیکھو اب میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم نے میرے اعتراف کی ویڈیو بھی بنالی ہے۔ اب مجھے اریسٹ کرلو۔“

”اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ پہلے مجھے اپنے پرور چھوڑنے کی وجہ تو بتاؤ۔ تمہارا تعلق پرور سے ہے۔ لاہور شفٹ ہونے کی کیا وجہ تھی۔؟۔۔۔“
 ”میرا کام۔۔۔؟۔۔۔“
 ”کونسا کام۔۔۔“
 ”میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ مجھے لاہور بڑی مارکیٹ لگا۔ جہاں میں زیادہ کما سکتا تھا۔“
 ”اصل وجہ بتاؤ گے یا میں تمہارے باقی کے دانت بھی توڑوں؟“
 اُس نے ڈاکٹر کو مارنے کے لیے بیڈ سائیڈ پر رکھا لیپ ابھی اٹھایا ہی تھا۔ جب ڈاکٹر نے دفاع میں اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔
 ”ہیلز مجھے مت مارو۔ میں بتاتا ہوں۔“
 ”بکو۔۔۔“
 ”مجھ پہ ایک بچے کو قتل کرنے کا الزام لگا تھا۔ آگے پیچھے پیسہ دیکر جان چھڑوائی پھر یہاں بھاگ آیا۔“
 ”وہ بچہ کون تھا۔؟۔۔۔“
 ”وہ بھی بڑا خوبصورت تھا۔ وہ تقریباً باہر کا ہی ہم عمر تھا۔ وہ بھی باہر کی طرح تکلیف نہ سہہ پایا۔ موقع پہ ہی جاں بحق ہو گیا۔“
 ”مجھے کہاں ملا۔۔۔؟۔۔۔“
 ”روز میرے کلینک کے سامنے سے گزور کر سکول جاتا تھا۔ میں پورے چار ماہ اپنا کلینک اُسکی وجہ سے صبح سات بجے کھولتا رہا تھا۔“
 منگو نے اپنی جیب میں سے ایک شیشی نکالی۔۔۔
 ”کیا اُس کو بھی اغوا کروایا تھا؟۔۔۔“
 ”یہ شیشی میں کیا ہے؟۔۔۔“
 ”کیا اُسکو بھی اغوا کروایا تھا؟۔۔۔“

اُس نے شیشی کا ڈھکن کھولا۔ اندر سے بھاپ نکلی۔۔۔

”تو تم کیا کرنے لگے ہو؟۔۔۔ میں اپنے جرم کا اقرار کر چکا ہوں۔ مجھ پہ کیس چلاؤ۔“

”میں نے پوچھا ہے کیا اُسکو بھی اغوا کر کے مارا تھا؟۔۔۔ اغوا کیسے کیا تھا؟ اُس لڑکے کے ساتھ ایک لڑکی بھی تو تھی۔“

منگو نے شیشی سے چند قطرے ڈاکٹر کے گاؤن پہ اُسکی گود میں پھینکے۔

دوسیکنڈ بھی نہ لگے کپڑا جل گیا۔ مخلول سیدھا ڈاکٹر کے جسم پہ گرا۔ اُسکی چیخوں سے کمرہ گونج اُٹھا۔

”آگے بول لڑکی کے منہ پہ کتنے تھپڑ مارے تھے۔؟۔ اس دفعہ ڈاکٹر کے سیدھے ہاتھ پر شیشی کو ہلکا سا

اُٹھایا۔

تین چار سیکنڈ کا کھیل تھا۔ ہاتھ کی ہڈیاں بھی پھلتی گئیں۔

”وہ بچہ میرے خاندان کا خون تھا۔۔۔ تو حرام خور ہے۔ کتنے گھروں میں تو نے ماتم بچھائے۔ کتنی

کلیوں کو نوچ کر کھا گیا۔ کتنی مائیں خون کے آنسو روئیں۔ کتنے باپ غم کا پہاڑ کندھوں پہ اُٹھائے بے بسی کی زندگی

جئے۔ کتنی بہنوں نے بھائی کھوئے۔ کتنے بچے ذالمت کی زندگی جینے پہ مجبور ہوئے۔ تجھ جیسے شیطان کا بوجھ اس

دھرتی نے بہت اُٹھالیا۔“

”نہ نہ مجھے مارومت میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں ساری متاثرہ فیملیز کو ہر جانہ دینے کو تیار ہوں۔ فی خاندان

ایک ایک کروڑ دینے کو تیار ہوں۔ غریب لوگ ہیں۔ انکی تو زندگیاں بن جائیگی۔“

”مجھے لگتا ہے۔ تو ظلمت کو پیسے کے زور پر بخشوا لے گا۔“

”یہ پاکستان ہے۔ یہاں کچھ بھی ممکن ہے۔ یہاں پیسہ دیکر جو مرضی کروالو۔ کلی کلی میں تمہیں میرے جیسے

لوگ مل جائیں گے جو ابھی میرے جیسے طاقت ور نہیں ہیں۔ مگر وہ بُرائی کر رہے ہیں۔ ایک نہ ایک دن میرے مقام

پر پہنچ جائیں گے۔ تمہارے دینی مدرسوں میں لڑکوں کو جنسی زیادتی کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ تم کہاں کہاں لڑو گے۔ اس

سے اچھا ہے مجھ سے اپنے حصہ لے لو اور۔۔۔“

گا لک کی نالی سے دو گولیاں ایک ساتھ نکلی تھیں۔

ڈاکٹر بیڈ پر پیچھے کو گرا۔۔۔ منگو نے اُسکے منہ پر تھوکا۔ اور اپنی توجہ باہر بھاگتے قدموں کی آواز پہ لگائی۔
یکے بعد دیگر اسلحہ بردار آدمی ڈاکٹر کے کمرے کے دروازے میں ابھرے۔۔۔ سامنے سے منگو نے اپنا قفل
دفاع کرتے ہوئے۔ سب کو زمین بوس کیا۔

باہر پولیس کے سائرن بجتے لگے۔ جب تک کوئی پولیس والا اندر آیا وہ وہاں سے نکل چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

ساڑھے گیارہ بجے کہیں جا کر اُسکی آنکھ کھلی تھی۔ ابھی تک دل کو یقین نہ آ رہا تھا۔

دروازہ مسلسل بج رہا تھا۔ اُس نے کمرے میں سے منگو کی آمد کے سارے نشان مٹائے۔ اور بڑھ کر دروازہ
کھول دیا۔ سامنے حرمین کھڑی تھی۔

”اس گھر میں کسی کے اتنے لاڈ نہیں دیکھے جاتے ہیں۔ آپ جو مرضی کر لیں امی کبھی آپکو کچھ نہیں کہتی ہیں۔
ساری رات میوزک سنیں سارا دن لمبی تان کر سوتی رہیں۔ سب جائز ہے اور ایک ہم بیچارے ہیں۔ ایک ذرا سا
فون رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ صبح سورج نکلنے کے ساتھ اٹھاتی ہیں۔ مجھے اب یقین ہو گیا ہے۔ آپ امی کی سگی
اولاد ہیں۔ ہمیں تو کہیں سے اٹھا کر لائی ہوئی ہیں۔“

تاحقہ کے لیے یہ باتیں نئی نہیں تھی۔ اسلئے منہ پہ دو چار پانی کے چھینٹے مار کر باہر آ گئی۔
حرمین بھی ساتھ ساتھ تھی۔

”آپ نے نیا پرفیوم لیا ہے؟۔۔۔“

وہ تھی مگر پلٹی نہیں۔ جھوٹ بولنے کی گنجائش نہیں تھی۔ کیونکہ اُسکے کمرے میں سے ابھی تک خوشبو اُٹھ رہی
تھی۔ ”ہاں لیا ہے۔ مگر میں تمہیں نہیں دے سکتی۔“

”پہلے تو کبھی کوئی چیز دینے سے انکار نہیں کرتی ہیں۔ پھر اب کیوں نہیں دیں گی۔“

”میں تمہیں پیسے دے دوں گی۔ تم نیا لے لینا۔“

”ایک پرفیوم ہی تو ہے۔“

”حرمین ہر بات پہ بحث مت کیا کرو۔ یہ پرفیوم نہیں دے سکتی ہوں۔ اب دوبارہ مت بولنا۔“

”مجھے آپ بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔“

تاشفہ نے مُذکر اُس کے گال پر پیار کیا۔ اور نرمی سے بولی۔

”چندہ مجھے معاف کر دو۔ مگر کچھ چیزیں آپ کے لیے خاص ہوتی ہیں۔ جو آپ کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتے۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”اگر آپ میرے ساتھ میری دوست کی سالگرہ پہ جانے کی حامی بھر لیں تو میں پرفیوم بھول جاؤں گی۔“

”بڑی تیز ہو۔ بس مطالبے ہی منواتی رہتی ہو۔“

”ہاں تو آپ بھی کونسا کسی کے ہاتھ لگتی ہیں۔“

”اچھا بابا چلی جاؤں گی۔ خوش؟۔۔۔“

”ہاں خوش اور اسی بات پر آپ کے سابقہ گناہ معاف کئے۔“

”بہت نوازش ہے۔ اب کیا میں ناشتہ کر سکتی ہوں؟۔۔۔“

”اب تو دوپہر کا وقت ہو رہا ہے۔ امی پچھلے صحن میں سمور پر میسن والی روٹیاں لگا رہی ہیں۔ دیسی پیزا۔۔۔“

”آپنی کدھر ہیں؟۔۔۔“

”اُنکی ساس کا فون آیا تھا۔ اس لیے دن چڑھتے ہی نکل گئیں۔“

”مجھے مل کر کیوں نہیں گئیں؟۔۔۔“

”ہاں آپ تو جیسے ایک آواز دینے پر اُٹھ جاتیں۔ ارے سب سے اہم بات تو میں بتانا ہی بھول گئی۔ بڑا عجیب و غریب واقعہ ہوا ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟۔۔۔“

”ساتھ والی چاچی مسرت ہیں ناں اُنکی دیوار پہ کوئی خون لگا کر گیا ہے۔ سارے محلے میں چہ گوئیاں ہو رہی ہیں۔ کسی نے اُن پر کالا جادو کیا ہے۔“

تاشفہ کے دماغ نے فلا بازی کھائی۔

”کس دیوار پہ؟۔۔۔“

”اُنکی باہر والی دیوار اور کونسی۔۔۔ خالہ بٹی نے کہا ہے۔ کوئی اس خون کو صاف کرنے کا سوچے بھی نہ ورنہ جادو کا سارا اثر خون صاف کرنے والے پہ ہوگا۔“

”ہماری عورتیں بھی جہالت کی انتہا کر دیتی ہیں۔“

”ہیں کیا کر دیتی ہیں؟۔۔“

”میرا سر۔۔۔“

واشنگ مشین پہ رکھا اپنا دوپٹا اُٹھا لے گیا کر کے باہر کو چلی گئی۔

وہ ہونہ ہو منگو کی ٹانگ سے ٹکٹنے والا خون تھا۔ جو دیوار پھلا لگتے ہوئے اُدھر لگ گیا تھا۔ اور ساری گلی کی عورتوں نے مل کر نئی کہانی گھڑ لی تھی۔

وہ باہر آئی تو چاچی مسرت باقاعدہ سر باندھ کر اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھی رو رہی تھی۔ گرد عورتوں کا جھکھلا لگا ہوا تھا۔ اُس نے کسی کی سُنی نہ کسی سے پوچھا۔ آگے بڑھ کر گیلے کپڑے کی مدد سے دیوار پہ جھاسا خون صاف کر دیا۔

”لیس چاچی مسرت اب رونا بند کر دیں۔ جادو سارا میرے پر آئے گا۔ آپ محفوظ ہیں۔“

عورتوں نے منہ میں انگلیاں دے لیں۔

”توبہ خالہ کی یہ لڑکی تو بڑی کم گو ہے۔ گھر چلے جاؤ تو کبھی سامنے آ کر سلام نہیں لیتی۔ آج اسکو کیا دورا پرا۔

پرائی مصیبت اپنے سر لے گئی۔ بھلا بتاؤ جوان جہان لڑکیوں کو تو ایسی جگہوں پر آنا ہی نہیں چاہیے۔“

”بس بہن جب اولاد کو سر پہ چڑھا رکھا ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ خالہ نے شروع سے اپنی بیٹیوں کو گھلی

آزادی دی ہوئی ہے۔ یہ والی تو اپنی پھوپھی کے گھر نوکری کرتی ہے۔ اُسکی بیمار ساس کو سنبھالتی ہے۔ پیسے کے

لاالچ میں خالہ نے ایک کو فیکٹری میں مردو کے ساتھ کام کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ تاشفہ تو ہفتوں بعد ایک

دو دن کے لیے آتی ہے۔ انہوں نے تو پاکستان میں ہی یورپ والا رواج بنایا ہوا ہے۔“

چاچی مسرت خالہ بیگم کی بہت اچھی دوست تھیں۔ اس لیے زیادہ دیر عورتوں کی بولیاں نہ سُن سکیں۔

”اللہ سچا جانتا ہے۔ یہ دیوار کے ساتھ دیوار ہے۔ عباس بھائی کو دنیا سے گئے اتنے سال ہو گئے ہیں۔۔۔ مجال ہے جو آج تک ان لڑکیوں کی طرف سے کوئی بُری بات سُنی ہو۔ بڑی کارشتہ بھی ماں نے خود دیکھ بھال کر کیا ہے۔ اور تاحفہ کی طرف سے تو خالدہ پریشان رہتی ہے۔ تاحفہ کہتی ہے۔ شادی نہیں کروائے گی۔ ہمیشہ ماں کے ساتھ رہے گی۔ بیٹیوں نے تو خالدہ کو کبھی بیٹے کی کمی نہیں ہونے دی۔ مافیہ اور حرمین روز کالج جاتی آتی ہیں۔ ماں کو کبھی کوئی ٹینشن نہیں دی۔ آج کل تو بیٹے بھی ماؤں کے لیے وہ نہیں کرتے جو یہ بیٹیاں ہو کر کر رہی ہیں۔“

ساری بولیاں بند ہو گئیں۔ جب کہنے کو کوئی موضوع نہ رہا تو ایک ایک کر کے سب اپنے گھروں کو چل پڑیں۔ گھر پہ تاحفہ کی شامت آئی ہوئی تھی۔

”وہاں جا کر وہ خون صاف کرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی۔ پہلے تمہاری صحت بڑی اچھی رہتی ہے۔ جو یہ نئی بلا چمٹانے کے چکر میں ہو۔“

تاحفہ ہنستی چلی گئی۔

مافیہ جو امی کو پیڑے دے رہی تھی۔ تعجب سے تاحفہ کو ہنستے دیکھ کر بولی

”ماشا اللہ اللہ نظر نہ لگائے۔“

”یار ایک ذرا کسی کا ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ ادھر تو نئی کہانی بن گئی۔“

”تم ان کہانیوں کو رہنے دو۔ کرا آئی ہو جو کرنا تھا۔ اب اندر جا کر لسی میں برف اور نمک ڈال کر تیار کرو۔“

”امی روٹیوں کے لیے مکھن ہے؟۔۔۔“

”ہاں اندر باورچی خانے میں ہی ہے۔ باہر ہال میں دسترخواں بچھا کر ساری چیزیں لگاؤ۔ میں روٹیاں لاتی ہوں۔“

امی کے چہرے پہ آیا پسینہ اُس نے اپنے دوپٹے میں جذب کر لیا۔ پھر اپنا دوپٹہ سارا کھول کر امی اور سورج کے درمیان تان دیا۔

خالدہ کے لب مُسکرا اُٹھے۔

”میں ہر روز یہاں روٹیاں لگاتی ہوں۔ مجھے سورج کی تپش کچھ نہیں کہتی۔ جاؤ شاباش اندر جاؤ جو کام بولا ہے وہ کرو۔“

”کاش میں بہت سا پڑھ کر کسی بڑی پوسٹ پہ جاتی۔ تب میری ماں کو یہ سارے کام نہ کرنے پڑتے۔“

”اچھا تب کون کرتا۔“

”نوکر کرتے۔“

”ماں صدقے جائے۔ نوکر تو اس دنیا کی شہزادی نے بھی نہیں رکھے تھے۔ جب سیدہ فاطمہ زہرہ جیسی ہستی اپنے کام کر سکتی ہیں۔ تو میری بچی ہماری کیا اوقات ہے؟۔۔۔“

”ایک تو آپ مثال بھی ایسی لاتی ہیں۔ کہ بندہ اعتراض بھی نہیں کر سکتا ہے۔ اچھا آپ اندر جا کر پچھلے کے نیچے بیٹھیں جو روٹیاں تندور میں رہ گئی ہیں۔ وہ میں نکال کر لے آتی ہوں۔“

اُس نے آخر کار انکو اندر بھیج کر ہی دم لیا۔

مافیہ آٹے والی خالی کنالی ٹل سے دھونے کے بعد دھوپ میں رکھ کر اُس کے پاس آئی جو تندور کے اندر نظر رکھے ہوئے تھی۔

”رات کو تمہارے کمرے میں کون آیا تھا؟۔۔۔“

تافہ کے لیے یہ سوال اس قدر اچانک تھا۔ شاک کے عالم میں مافیہ کی شکل دیکھے مٹی۔ جو آنکھوں میں ناراضگی لیے اُسکو دیکھ رہی تھی۔ تافہ نے بازو کے اوپر رومال لپیٹا تھا۔ تاکہ تندور میں سے پک جانے والی روٹیاں نکال سکتی مگر اب ساکت ہو کر رہ گئی۔ زبان خشک ہوتی محسوس ہوئی۔ چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

مافیہ نے اُسکے ہاتھ سے رومال لیکر تیزی سے روٹیاں نکال کر چھابے میں رکھیں۔

”مجھے نہیں علم تم کیا کہہ رہی ہو؟۔“

”ناشی میرے ساتھ لاعلمی کی گیم مت کھینا۔ اگر بھول رہی ہو تو میں یاد کروادوں۔ میں ہر روز تہجد کے لیے اٹھتی ہوں۔ تمہارے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ اگر مجھے تمہاری فطرت معلوم نہ ہوتی ناشی تو اللہ کی

قسم میں اُسی وقت دروازہ توڑ کر تمہارے سر پہ جا کھڑی ہوتی۔ میں اُمید ہی کر سکتی ہوں۔ ہمارے مرحوم باپ کی اس محلے میں بڑی عزت ہے۔ اُسی عزت کے بل پر ہم ماں بیٹیاں یہاں بے فکری کی زندگی گزار رہی ہیں۔ ہماری ماں نے اپنی چاروں بیٹیوں کو زمانہ شناس بنایا ہے۔ میں نہیں چاہتی کوئی میری ماں کی تربیت پر انگلی اٹھائے۔ اس بات کا ثبوت آج باہر کھڑی عورتوں کی باتوں سے مل ہی گیا ہوگا۔“

غصے میں بولنے کے ساتھ ساتھ مافیہ نے روٹیاں بھی نکال لیں۔ تاشفہ ابھی بھی بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ تاشفہ نے اپنی صفائی دینے کے لیے زبان کھولی تو لاہور میں ہونے والا واقعہ یاد کر کے شرمندگی سے گال دھک گئے۔

نظر نچرا کر بولی۔

”میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔“

”رات کے اندھیرے میں تم سے ملنے کوئی شخص آتا ہے۔ اس سے بڑھ کر غلط بھی کچھ ہو سکتا ہے؟۔۔۔“

”وہ ملنے نہیں آیا تھا۔“

”اچھا تو کیا تمہیں آشرवाद دینے آیا تھا۔“

”اُسکی گولی لگی تھی۔ مجھ سے مدد کی اُمید پر آیا تھا۔“

”تم کہاں کی سرجن ہو؟۔ اور یہ آدمی ہے کون۔ جو گولی کھا کر کسی ہسپتال یا ڈاکٹر وغیرہ کے پاس جانے کی بجائے اپنی معشوقہ کے پاس ٹھپ رہا ہے۔ کس قسم کے چوراچکے کے ساتھ علیک سلیک بنائی ہوئی ہے؟۔۔۔“

چھوٹی بہن کے آئینہ دیکھانے پر اور اتنے سخت الفاظ کے چٹاؤ پر تاشفہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

”میں اُسکی معشوقہ نہیں ہوں۔“

”تو کیا تم اُسکی بیوی ہو؟۔۔۔“

”مافیہ تم حقیقت نہیں جانتی ہو۔ اس لیے اپنی زبان کو قابو کرو۔ تم زیادتی کر رہی ہو۔“

”ہاں میں زیادتی کر رہی ہوں۔ اور تم ہمارا نام روشن کرنے کی کوششوں میں ہو۔ ابھی جا کرامی کو بتاؤں نا تو دیکھنا پھر وہ تمہارا کیا حشر کرتی ہیں۔ تمہاری عقل کہاں گھاس چر نے چلی گئی ہے۔ کیا یہ وہی تھا؟۔“

”کون؟۔۔۔“

”وہی جس کہ وجہ سے فون پر لاک لگا کر رکھتی ہو۔ جسکی وجہ سے بات بار بار فون چیک کرتی ہو۔“
تاہفہ کو اپنی آواز گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔۔۔

”تمہیں کیسے پتا؟۔۔۔“

”تاہفہ جی میں اپنی آنکھیں اور کان کھول کر رکھتی ہوں۔ اس گھر میں بیوقوف کوئی بھی نہیں ہے۔ کیا ہمیں نہیں نظر آتا۔ اگر فون پر مصروفیت کم ہو جائے ڈپریشن کی گولیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر فون پہ مصروف رہو تو لگتا ہی نہیں کہ تمہیں کبھی کوئی مسئلہ ہوا بھی ہے۔“

”مافیہ کیا چاہتی ہو؟۔۔۔ میری کمزوری ہاتھ آگئی ہے تو کیا اب مجھے طعنے مار مار کر بلیک میل کرو گی؟۔۔۔“
”مجھے صرف اتنا بتا دو وہ کون ہے؟۔ اور تمہارا اُسکے ساتھ کس قسم کا رشتہ ہے۔“
”یہ میں نہیں بتا سکتی۔“

”کیوں نہیں بتا سکتی ہو۔ مجھے نہیں بتانا تو کم از کم امی کا آپنی کو بتا دو۔ تاکہ وہ اس کا کوئی حل نکالیں۔“
”جب وقت آئے گا بتا دوں گی۔ پلیز میں مزید اس موضوع پہ بات کرنا نہیں چاہتی ہوں۔“
”اگلی دفعہ جب وہ سارے صحن میں خون کے نشان چھوڑ کر جائے تو منہ اندھیرے نکل کر خود ہی صحن دھو لینا۔ میں اگلی دفعہ تمہارا پردہ نہیں رکھوں گی۔ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔ اگر یہ بات ہماری پھو مہموں وغیرہ تک پہنچے تو وہ ہمارا جینا حرام کر دیں گی۔ کیا تمہاری وجہ سے امی نے کم پریشانیاں دیکھی ہیں جو تم اُنکو یہ نیا غم دینے کی تیاریاں کر رہی ہو۔“

مافیہ اپنا دل ہلکا کرنے کے بعد روٹیاں اٹھا کر اندر چلی گئی۔
تاہفہ کو اسی دن کا ڈر تھا۔ آنکھوں کی جلن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاتھ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔
”تو کیا اب میں نئے سرے سے بدکردار کہلاؤں گی؟۔۔۔ مرد کا کیا ہے۔ عین موقع پہ مگر جائے۔ تو عورت کے دامن میں کیا بچتا ہے؟۔ رُسوائی آنسو۔۔۔ اور عمر بھر کا روگ۔۔۔“
”کیا میں اسکو فون کر کے بولوں کہ اپنی ماں کو سب سچ بتا کر میری ماں کے پاس بھیج دو۔۔۔“

”کیا اپنی زبان سے کہوں کہ اس رشتے کو اب کوئی نام دے دو۔“

”کیا وہ میرا مان بنے گا یا مجھے فقط رسوائی ہی ملے گی۔“

”میں کتنی پاگل ہوں۔ میں اس راہ پر چلی ہی کیوں۔ کیسے وہ میرے گرد جال بٹتا رہا اور میں دھیرے

دھیرے کر کے اُس کے بٹنے اس جال میں پوری طرح قید ہو گئی ہوں۔“

”کیا میں ابھی اندر جا کر امی کو سب سچ بتا دوں؟“

”کیا میری بات کا یقین کیا جائے گا؟۔۔۔“

”اگر مجھ سے ثبوت مانگا گیا تو کیا دیکھا دنگی۔ میرے پاس تو کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔“

”ما فیہ تو میری بڑی عزت کرتی تھی۔ آج کیسے مجھے نفرت سے دیکھ کر گئی ہے۔ مجھ سے اُسکی نفرت برداشت نہیں

ہوتی ہے۔ میں اُسکو ساری سچائی بتا دیتی ہوں۔ وہ میری بہن ہے۔ بغیر ثبوت کے بھی میرا یقین کر لے گی۔“

حرمین اُسکو بٹلانے آئی تھی۔ پر اُسکو اپنی سوچوں میں گھرا دیکھ کر ماتھے پر ہتھیلی مار کر بولی۔۔۔

”یا اللہ میری بہن کو ٹھیک کر دیں۔“

”اندر آ جائیں امی بٹا رہی ہیں۔“

اُس نے ہتھیلی کی پٹخت سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ حرمین اُسکا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی اندر لے گئی۔

ہال میں کولر لگا کر امی وہیں پہ دسترخواں پر بیٹھ کر روٹیوں پہ مکھن لگا رہی تھی۔ ما فیہ دہی اچار اور چٹنی وغیرہ

رکھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گئی۔

تاؤفہ کی نظریں ٹی وی سکرین پر چلتی ہیڈ لائنز پر پڑیں تو قدم زمین نے جکڑ لیے۔

جبکہ نیوز کا سٹر کہہ رہی تھی۔

”ناظرین یہاں ہم آپکو ایک اہم خبر سے مطلع کرتے چلیں۔ پورے پنجاب بھر میں سیکورٹی فورسز نے

بچوں کی خرید و فروخت میں ملوث لوگوں کے خلاف کریک ڈاؤن کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں صوبے بھر میں مختلف

شہروں میں چھاپے مار کا متعدد افراد کو زیرِ حراست لیا ہے۔ ایک بہت بڑا گروہ بھی بے نقاب کیا ہے۔ جو بچوں کی

فحش فلمیں بنا کر اندرون اور بیرون ملک بیچتے تھے۔“

”ناظرین ابھی تک کی اطلاع کے مطابق اس سارے گروپ کا سربراہ ڈاکٹر نعیم تھا۔ جو اس کارروائی کے دوران مارا گیا ہے۔ پولیس نے ڈاکٹر نعیم کی موت کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا ہے۔ ڈاکٹر ایک انتہائی بُری فطرت کا آدمی تھا۔ تحقیقات کے دوران اُسکے خلاف ملنے والے شواہد اُسکو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھجوانے کے لیے کافی تھے۔“

”اُسکے علاوہ یہ بات بھی سامنے آئی ہے۔ کہ یہ وہی ڈاکٹر نعیم ہیں۔ جنکو دس سال پہلے پسرور شہر سے بچے کے ساتھ زیادتی کے کیس میں گرفتار کیا گیا تھا۔ مگر اُن پر کوئی مقدمہ نہ چل سکا۔ نہ ہی کوئی سزا سنائی جاسکی۔“

”کارروائی کے دوران گرفتار ہونے والے افراد کو نامعلوم مقام پر منتقل کیا گیا ہے۔“

”اس سارے عمل کے دوران مختلف مقامات سے بازیاب کئے جانے والے بچوں کی صحیح تعداد ابھی تک سامنے نہیں آسکی۔ مگر کہا جی جا رہا ہے کہ ان بچوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔“

”تمام این جیوز اور بہت سے مقامی ادارے ان بچوں کی دیکھ بھال کے سلسلے میں مدد کرنے کے لیے آگے آئے ہیں۔“

ناظرین اس سارے واقعے کا ایک تو قانونی پہلو ہے۔ جس پر ہم ضرور بات کریں گے۔ مگر اس وقت ہم نے اُن بچوں کے جذبات و احساسات کی ایک تصویر حاصل کرنے کے لیے اپنے سٹوڈیو میں دعوت دی ہے۔ ڈاکٹر ایمین صالحہ صاحبہ کو جو کہ ایک سائیکالوجسٹ ہیں۔ اور اس کیس کو بڑا کلوزلی دیکھ بھی رہی ہیں۔ انکے ساتھ ہم نے ایک سوشل ورکر کو مدعو کیا ہے۔ جو اپنی انجیو چلا رہے ہیں۔“

”اسلام وعلیکم ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔“

”وعلیکم اسلام۔۔۔“

”بہت شکریہ آپ اتنے شارٹ نوٹس پر تشریف لائیں۔“

صالحہ نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”ڈاکٹر صاحبہ آپ سے ہم یہ جاننا چاہیں گے۔ جو بچے آج سامنے آئے ہیں۔ جنکے ساتھ کسی نہ کسی قسم کی جنسی زیادتی کی گئی ہوئی ہے۔ آپ کے خیال میں اُنکو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے؟۔“

”بہت شکریہ جی آپ نے اس قدر اہم اور حساس موضوع پر بولنے کے لیے مجھے موقع دیا۔“

”دیکھئے بچے کسی بھی معاشرے کا قیمتی ترین سرمایہ ہیں۔ یہ ہمارا آنے والا کل ہیں۔ ہمارا مستقبل انکے ہاتھوں میں ہے۔“

”کسی بھی بچے کو ایسے حالات کا سامنا نہیں ہونا چاہیے۔ جن حالات سے گزر کر یہ بچے ہم تک پہنچے ہیں۔ اُسکے اثرات ان کی زندگیوں پر بڑے دور رس نتائج چھوڑ کر جائینگے۔“

”یہ لوگ ایک ایسی زندگی جیتے آرہے ہیں۔ جو کسی کی بھی ذاتی پسند نہیں ہے۔ ان میں سے کچھ کیس ایسے ہیں۔ جو روز مرتے ہیں۔ روز جیتے ہیں۔ یہ ایک ہزار بچہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ نہ جانے کتنے ہزار ابھی تک اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔“

”میرے پاس ایک پندرہ سالہ لڑکا آیا ہے۔ جسکا میں پچھلے دو سال سے علاج کر رہی ہوں۔ وہ اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ دو سال سے میں اُسکے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ مگر ابھی تک وہ اُس ٹروے سے نکل نہیں پارہا ہے۔ اس میں سب سے بڑا ہاتھ ہمارے معاشرے کا ہے۔ ہمارے لوگ غلط لوگوں کو غلط نہیں کہتے ہیں۔ یہاں پر جو دیکھتے ہوتا ہے۔ اُسکو بُرا جانا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ کسی کی ہمدردی نہیں ہوتی ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم قصور وار افراد کو سخت سے سخت سزا دیں۔ اور متاثرہ انسانوں کی ہر طرح سے اخلاقی جذباتی مدد کریں۔ اُنکو اچھوت کا مریض سمجھ کر ایک طرف نہ ڈال دیا جائے جہاں وہ بھٹک بھٹک کر انہی راستوں کے راہی بن جائیں جنہوں نے اُنکو ڈسٹا تھا۔ بلکہ پیارا اور توجہ سے اُنکو زندگی کی طرف لانا چاہیے۔ اُنکو میری اور آپ کو توجہ کی ضرورت ہے۔ اُنکے ساتھ بھلائی کریں۔ اُنکے ساتھ ویسا ہی رویہ رکھیں جیسا آپ روزمرہ کی زندگی میں ہر ایک کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اُنکو کسی بھی طرح اپنے سے کم تر نہ سمجھا جائے۔“

”خاص طور پر ماں باپ بہن بھائی اور قریبی رشتہ داروں کا اہم رول ہے۔ اُنکو سمیٹ لیں۔ تاکہ آنے والی زندگی میں یہ معاشرے کے فعال شہری بن سکیں۔“

”ڈاکٹر صاحبہ آپکے خیال میں ایک معاشرے کی حیثیت سے ہم کیا اتنے گر چکے ہیں۔ اتنا بڑا کرائم ہمارے درمیان اتنے بڑے پیمانے پر ہو گیا اور ہمیں خبر تک نہیں ہوئی۔“

”نہیں یہ بات غلط ہے۔ ہمیں خبر ہے۔ ہم سب کسی نہ کسی طرح سے باخبر ہیں۔ ہم اپنے ارد گرد کی دنیا سے بے خبر بالکل نہیں ہیں۔ ہاں ہم بے حس ضرور ہیں۔ یہ بات ہم لوگوں کو گھن کی طرح کھوکھلا کر دے گی۔ ہمارے اندر سے احساسِ ذمہ داری ختم ہو چکا ہے۔“

”ہم اپنی رائے دینا جانتے ہیں۔ مگر ہماری دوڑ فقط بیان بازیوں تک ہے۔ جب آپ کے حکمران جو لوگ اتھارٹی رکھتے ہیں۔ وہ ایسی کسی خبر پر میڈیا میں آکر فقط یہ کہہ کر خود کو سُرخرو جانیں۔ کہ وزیرِ مملکت اس واقعے کی بھرپور محنت کرتے ہیں۔ تو قوم سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟“

”بچھلے کچھ عرصے سے لڑکوں کے ساتھ ہونے والی زیادتوں کی خبریں میڈیا کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ بات یہ ہے کہ بچیوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی خبر زیادہ توجہ کھینچتی ہے۔ حقوق نسواں پہ کام کرنے والی انجیو ز سامنے آجاتی ہیں۔ واقعے کو توجہ مل جاتی ہے۔ جبکہ دوسری جانب بچوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو پہلے تو رپورٹ ہی نہیں کیا جاتا۔ بچے شرم اور ڈر کے مارے گھر میں ہی نہیں بتاتے۔ اگر بتا بھی دیں۔ تو معاشرتی پریشرا تا زیادہ ہے۔ ماں باپ ہی اُس چیز کا وہیں دبا دیتے ہیں۔ بہت ہی کم اس قسم کے کیس کہیں رپورٹ ملیں گے۔“

”مگر ڈاکٹر صاحبہ بچیوں کے ساتھ زیادتی کے کیس بھی تو دبائے جاتے ہیں۔“

”جی ہاں مگر اس سمت میں پھر بھی کچھ کام ہوا ہے۔ کوئی تھوڑی بہت توجہ دی گئی ہے۔ جبکہ جو موضوع آج زیرِ بحث ہے۔ اس پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا ہے۔“

ہوسٹ اس دفعہ سوشل ورکر کی جانب مڑا۔

”مڈرغنی صاحب کیا آپ ڈاکٹر صالحہ صاحبہ سے اتفاق کرتے ہیں؟۔۔۔ کیا واقعی ہمارے ہاں اس فحش میں کوئی کام نہیں ہوا ہے؟۔۔۔“

”جی بالکل میں ڈاکٹر صاحبہ کی اس بات سے ایک سوا ایک فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ خطرناک ترین بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں دو ہزار چودہ تک چائلڈ ایبوز کے خلاف کوئی قانون ہی نہیں تھا۔ جب کوئی کیس رپورٹ کیا جاتا تھا۔ تو حکام کا یہ کہنا ہوتا ہمارے پاس سوائے ریپ کے اور کوئی آپشن موجود نہیں ہے۔ جس کے تحت مقدمہ درج کیا جائے۔ تو ان لیس اگر آپ کے ساتھ ریپ نہیں ہوا۔ آپ کی درخواست ہی درج نہیں ہوگی۔ اور آپ چُپ

چاپ گھر جانے پر مجبور تھے۔ اللہ انکا بھلا کریں دو ہزار چودہ میں چائلڈ ایبوز کو ایک کرائم مانا گیا۔ اور باقاعدہ اس پراسیکیوٹری میں بل پاس کر کے قانون لایا گیا۔ اب ہم نئے مسئلے سے دوچار ہوئے ہیں۔ یہ آج کا کیس چائلڈ پناگرنی کا کیس ہے۔ اور ہمارے پاس اسکا بھی قانون نہیں تھا۔“

”دو ہزار پندرہ میں دو سو اسی بچوں کے ساتھ ہونے والا سیکشول ایبوز کا کیس منظر عام پر آیا تھا۔ جس میں پچیس افراد نے ان بچوں سے زبردستی پورن ویڈیوز بنائی تھیں۔ اُن ویڈیوز کو بنیاد بنا کر اُن تمام متاثرہ گھرانوں کی زبان بند رکھی تھی۔ اگر وہ انکے خلاف کچھ رپورٹ کریں گے۔ تو یہ لوگ انکے بچوں کی فلمیں لیک کر کے انکا جینا حرام کریں گے۔ بد قسمتی سے جب وہ واقعہ منظر عام پر آیا۔ جب ہمارے پاس اُنکو سزا دینے کے لیے قانون نہ تھا۔ پھر سے اسمبلی میں پاس شدہ بل میں ترمیم کی گئی اور چائلڈ سیکشول ایکٹ آیا۔ جس میں پناگرنی اور ملکی حدود میں ہونے والی چائلڈ ٹریفیکنگ پر بھی سزا رکھی گئی۔“

”مگر جو سزا ان جرائم کے لیے مختص کی گئی ہے۔ وہ انتہائی کم ہے۔ مثال کے طور پر آج ہم لوگ یہاں اگر موجود ہیں۔ تو صرف اور صرف با بر مراد کے والدین کی وجہ سے۔ میں اس سب کا کریڈٹ متاثرہ والدین کو دیتا ہوں۔ جنہوں نے چار ماہ پہلے اغوا ہونے والے اپنے سات سالہ بیٹے با بر مراد کا کیس تھا نے میں رجسٹر کروایا۔ مگر جب وہاں سے جب کوئی حوصلہ افزا نتائج نہیں نکلے تو انہوں نے اپنے طور پر ایک پرائیویٹ انویسٹی گیٹر ہائر کیا۔ یہ اگلا سارا کام ہمارے اُس بہادر افسر کا ہے۔ جس نے اپنی ساری ٹیم کے ساتھ مل کر اتنے بڑے گروہ کو بے نقاب کر دیا۔ اُنکا سرغنہ مارا گیا۔ میں اُس ماں کے لال کو سلام پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ جب آپ ایسے ظالم لوگوں سے جنگ کا اعلان کرتے ہیں۔ تو آپ کو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترنا پڑتا ہے۔“

”ناظرین یہ بات ہمارے لیے بھی بریکنگ نیوز ہی ہے۔ مدثر غنی صاحب نے آج کے اس شو میں ایک انتہائی اہم انکشاف کیا ہے۔ انکا کہنا ہے۔ یہ لوگ حکومتی کارروائی کے نتیجے میں نہیں پکڑے گئے۔ بلکہ یہ ایک ذاتی تفتیش کا نتیجہ ہے۔ جو اُس بچے کے ماں باپ نے کروائی۔ مدثر غنی صاحب کیا آپ ہمیں بتانا پسند کریں گے۔ جن افسر کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انکا تعلق کس تنظیم سے ہے۔؟“

”معذرت کے ساتھ میں تفصیل سے آگاہ نہیں ہوں۔ مجھے صرف اتنا علم ہے۔ جو با بر مراد کے والد سے

معلوم ہوا۔ یہ بات انہوں نے میڈیا میں بالکل بھی لیک نہیں کی ہے۔ کیونکہ جس ادارے نے اُنکی مدد کی یہ اُنکی پالیسی ہے۔ وہ لوگ منظر پر نہیں آتے۔ مگر چونکہ میرے مراد صاحب کے ساتھ فیملی بیڈ تعلقات ہیں۔ اس لیے مجھے ان تمام باتوں کا علم ہوا۔ یہاں ذکر کرنے کا مقصد صرف یہی ہے۔ میں اُن تمام لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اگر اُن میں سے کوئی بھی اس وقت مجھے سُن رہا ہو۔ تو میں کہنا چاہوں گا سر ساری قوم کی جانب سے آپ کو سلوٹ ہے۔ آپ ہمارا فخر ہیں۔ اللہ ہر حال میں آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔۔۔“

ہوسٹ نے جلدی سے خود کو حیرت سے نکال کر شوشنجالا۔

”پروڈیوسر صاحب کوشش کریں۔ اگر ہم باہر مراد کے والدین کو لائن پر لے سکیں۔“

ہوسٹ صالحہ کی جانب متوجہ ہوا۔۔۔

”ڈاکٹر صاحبہ آپ مزید کچھ کہنا چاہیں گی۔“

”جی میں یہ بتانا چاہوں گی کم عمر بچوں کے ساتھ جو زیادتی کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے ہی کسی نہ کسی فیملی ممبر کی جانب سے ہی ایسا عمل کیا جاتا ہے۔ جبکہ لڑکوں کو ایسا خطرہ گھر سے باہر ہوتا ہے۔ گھر میں وہ محفوظ ہوتے ہیں۔ گھر سے باہر اساتذہ، گھر کے پاس دکان والا، مدر سے میں، یا گلی محلے میں وہ لوگ جنکے ساتھ وہ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔“

”اسکے علاوہ یہاں اس پلیٹ فارم کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے۔ اپنے ملک کے بچوں اور والدین کو ایک پیغام دینا چاہوں گی۔“

”جو بچے مجھے سُن رہے ہیں۔ آپ کو ایک بات ہمیشہ یاد رکھنی ہے۔ آپ کا جسم صرف آپ کی اپنی ملکیت ہے۔ اسکو چھونے کی اجازت کسی کو بھی نہیں ہے۔ گھر کے اندر یا گھر کے باہر آپ کسی کو بھی اپنی ذاتی حدود میں آنے کی اجازت نہ دیں۔ اگر آپ کو کوئی خوفخواہ آپ کے جسم کو چھونے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ اُن سے دور بھاگ جائیں۔ فوراً سے اپنے بڑوں کو بتائیں۔ وہ بڑے دادا دادی ہو سکتے ہیں۔ آپ کے بڑے بہن بھائی ہو سکتے ہیں۔ ماں باپ کو بتا سکتے ہیں۔ جس کو مرضی بتائیں مگر بتائیں ضرور۔ اگر کوئی آپ کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دیکر اپنا عمل جاری رکھنے کی کوشش کرے تو شور مچا دیں۔ کیونکہ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے۔ سیونٹی پرسنٹ

کیس میں جہاں بچے شور مچا دیتے ہیں۔ وہ بچ جاتے ہیں۔ اور جو ڈر کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا گھر والوں کی جانب سے خاموش کروا دیئے جاتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ برداشت کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر بھی سالوں لگ جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنی تکلیف نہیں بھولتے ہیں۔“

”ماں باپ سے درخواست ہے۔ کبھی اپنے بچے کو اپنے کسی رشتے دار کا محلے دار کے پاس نہ چھوڑیں۔ ہمیشہ اُنکے ساتھ رہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس عمر کو نہیں پہنچ جاتے جب وہ اپنا اچھا بُرا سمجھ سکیں۔ اپنے بچے کے رویے کو اہمیت دیا کریں۔ اگر آپ کو لگے وہ کسی خاص شخص کے سامنے نارمل رویہ ظاہر نہیں کرتے۔ کسی سے دور بھاگتے ہیں۔ جان ٹھراتے ہیں۔ بدتمیزی کرتے ہیں۔ مگر عام زندگی میں وہ بچے ایسا نہیں کرتے۔ تو خدا را اُنکو اخلاقیات کا لیکچر دینے کی بجائے۔ پیار سے پوچھیں آیا کہیں آپکی ناک کے نیچے آپ کا بچہ کسی زیادتی کا شکار تو نہیں ہے۔ بچوں کو سنیں انہیں اعتماد دیں۔ اُنکو اتنی ہمت دیں۔ وہ اپنی ہر بات آپ کے ساتھ سمیر کریں۔ اور اگر خُدا انخواستہ کبھی کوئی غیر معمولی رویہ سامنے آجائے تو اُسکو دبا مت دیں۔ اُسکو باہر نکالیں اور روکنے کے لیے ضروری کارروائی کریں۔“

”میں یہاں پر ایک ذاتی واقعہ بتانا چاہوں گی۔ میری کزن اور میں ٹیوشن پڑھنے جایا کرتے تھے۔ کزن میرے سے عمر میں دس سال بڑی تھیں۔ ایک دن سردیوں کی شام ہم لوگ جس وقت ٹیوشن پڑھ کر اکیڈمی سے اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم لوگ گھر سے تھوڑا ہی دور تھیں۔ جب ایک لڑکا سامنے سے آیا اور آپنی کا بیک پکڑ لیا۔ کہنے لگا میں آپکو پسند کرتا ہوں۔ روز آپکو آتے جاتے دیکھتا ہوں۔ آج تو نام جانے بغیر نہ جاؤنگا نہ آپکو جانے دوںگا۔“

”آپنی ڈری تو میری باقاعدہ ٹانگیں کاپنے لگیں۔ انہوں نے بیک ٹھہروانے کی کوشش کی مگر وہ ڈھیٹ بنا جما رہا۔ چونکہ اپنے محلے میں تھے۔ آپنی نے دھمکی دی بیک چھوڑ دو ورنہ شور کر دوں گی۔“

”اُس لڑکے کو لگا ایویں دھمکارہی ہے۔ مگر آپنی نے سچ میں آواز لگا دی۔ قریب ہی ہماری برادری کے چچا کا گھر تھا۔ آپنی نے اُنہی چاچو کو آواز دی۔ وہ لڑکا اُسی وقت بیک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آپنی نے میرا ہاتھ پکڑا اور روتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے گھر کی جانب چل پڑیں۔ گھر کے سامنے اُنکا بھائی کھڑا تھا۔ انہوں نے سارا

ماجر ا بتایا ساتھ ہی اُس لڑکے کا خلیہ بھائی اُسی وقت اُس سمت میں بھاگ گیا۔ بعد میں اُس لڑکے کے ساتھ جو ہوئی وہ ایک الگ کہانی ہے۔“

”مگر میرا جو اس واقعے کو یہاں پر بیان کرنے کا مقصد ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب میں اپنے گھر آئی۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ دل کی دھڑکن آؤٹ آف کنٹرول ہے۔ ایک دس گیارہ سال کی بچی گھر آ کر بڑی اُمید پر ماں کو بتاتی ہے۔ امی امی آج ایسا ہوا ہے۔ امی آگے سے کہتی ہیں۔ بس اس بات کو ادھر ہی بھول جاؤ۔ وہ بچی آنکھوں میں حیرت لیکر پوچھتی ہے۔ آخر کیوں؟۔۔۔ تو امی کہتی ہیں۔ اگر تمہارے باپ کے کان میں یہ بات پڑ گئی ناں تو یہ سکول ٹیوشن سب یہیں بند ہو جانا ہے۔ وہ دس سالہ لڑکی آج تک حیران ہے۔ میری ماں نے ایسا کیوں کہا؟ یہ کیوں نہ کہا بیٹا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں میں تمہارے ابو کو بتاتی ہوں۔ وہ دیکھ لیں گے۔ اور کل سے میں خود یا گھر کا کوئی اور بڑا تم لوگوں کو اکیڈمی لینے کا یا کرے گا۔“

”جب ہم اپنے بچوں کو خاموش رہنے کا حکم دیتے ہیں۔ تو یقین مایے وہ ساری عمر کے لیے ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتے ہیں۔ کبھی بھی اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی یا غلط رویہ دوسروں کے سامنے نہیں رکھتے۔ اور یہ ظلم ہے۔ آپ اُنکے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ وہ تو بچے ہیں۔ آپ جو بات اُنکے دماغ میں بیٹھا دیں گے۔ وہ اُسی کو پکڑ کر بیٹھے رہیں گے۔ اس لیے ضروری ہے۔ والدین اپنے بچوں کو بڑی چھوٹی عمر سے ہی یہ بات سیکھائیں ظلم و زیادتی پر خاموشی اختیار نہیں کرنی۔ بتانا ہے۔ آواز اٹھانی ہے۔ اور ماں باپ اُس ظلم کو روکنے کی ہر ممکنہ کوشش کریں گے۔“

”ڈاکٹر صاحبہ نے بہت ہی خوبصورت اور اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ابھی ہمارے ساتھ باہر مُراد کے والد مُراد صاحب موجود ہیں۔“

”اسلام و علیکم سر۔۔۔ ہم لوگ آپ کے دُکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ جو غم کی اس گھڑی میں آپکی دل جوئی کر سکیں۔“

”بہت شکریہ۔ جناب میرا غم بہت بڑا ہے۔ میری بیوی نیم پاگل ہو چکی ہے۔ ان گزرنے والے چار ماہ میں ہم لوگ پل پل مر رہے ہیں۔ مگر اسکے باوجود میں آج خوش ہوں۔ میرے بیٹے کے ساتھ ظلم کرنے والے لوگ کیف کردار کو پہنچے ہیں۔ اُنکا سارا نیٹ ورک تباہ ہو گیا ہے۔ کم از کم یہ لوگ کسی اور باہر کا شکار نہیں کر پائیں گے۔ مگر

ہمارے لوگوں کو الٹ رہنا پڑے گا۔ میں تو بھگت چکا ہوں۔ اب اپنے بچوں کو ایک بل بھی آنکھوں سے دور نہیں کرتا ہوں۔ مگر یہ اسکا کوئی حل نہیں ہے۔ ہمیں اپنے معاشرے میں ایسا ماحول بنانا ہوگا۔ جس میں ہمارے بچوں کو اتنی سی آزادی اور خوشی تو میسر ہو۔ وہ گلی میں دوستوں کے ساتھ کھیل سکیں۔ وہ قریبی دکان پر کسی شکاری کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ہمیں قوم کی حیثیت سے جاگنا ہوگا۔ اپنے اندر ٹھپ کر بیٹھے ان بھیڑیوں کو پہچان کر بنگا کرنا ہوگا۔ اور سب سے اہم بات ایسے قانون بنانے ہونگے جو ایسے مجرموں کو سخت سے سخت سزا سنائیں۔ صرف سات سال کی جیل اور چند لاکھ جرمانہ انکا کچھ نہیں بیگاڑ سکتا۔“

ناصر غنی صاحب بولے۔۔۔

”اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپکو برطانیہ کا ایک کیس بتانا چاہوں گا۔

برطانیہ میں ایک سوشل ورکر نے کم عمر بچیوں کی گرمنگ کے خلاف پولیس کو متوجہ کیا۔ مگر پولیس نے کئی سال تک کوئی ایکشن نہیں لیا۔ کیونکہ اُنکے مطابق اُنکے پاس ثبوت نہیں تھا۔ جس کے بل پہ وہ کارروائی کرتے۔ آخر کار سات سال بعد جا کر کچھ لڑکیوں نے نہ صرف بیان دیئے۔ بلکہ ثبوت فراہم کئے۔ بات کرنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ جب جرم ثابت ہو گیا۔ دو عورتوں اور تین پاکستانی مرد کو دو دو ہزار سال جیل ہوئی ہے۔ جرم یہ تھا۔ وہ عورتیں لڑکیوں کے ساتھ دوستی کر کے اُنکو اپنے گھر بلاتیں۔ مہنگے مہنگے تحائف دیکر اُنکو اپنے جال میں پھنسا یا جاتا۔ پھر آگے مرد دوستوں کے ساتھ متعارف کرواتیں۔ وہ مرد بھی خود کو لڑکیوں کو دوست کہتے۔ تحفے تحائف دیکر فرنٹکس اس مقام پر لے آتے جہاں سے جنسی خواہشات کو پورا کروانے کی فرمائش کرتے۔ وہ بچیاں چودہ پندرہ سال کی تھیں۔ اور مجرموں کو دو دو ہزار سال سزا ہوئی۔ اور خُدا کے بندوں ہمارے ملک میں پانچ سات سال کے بچوں کے ساتھ زیادتی کر کے اُنکو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ جسکی سزا کیا ہے؟ چند سال کی جیل اور چند لاکھ روپے۔ ہماری تمام حکام سے درخواست ہے۔ اس پر فوری طور پر ایکشن لیں۔ اسکے سزا سخت سے سخت کریں۔“

”ناظرین آپ آج کی خاص نشریات دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اپنے مہمانوں کی باتوں سے بہت سی نئی معلومات ملی ہیں۔ اور بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا ہے۔ ناظرین یہ کسی ایک فرد یا ادارے کی لڑائی نہیں ہے۔ جب

بات بچوں کی آجاتی ہے پھر یہ جنگ ہم سب کی جنگ بن جاتی ہے۔ جسکو جیتنے کے لیے ہم سب کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ ہم فیشن اور برینڈز کے معاملے میں تو مغرب کی نکل کرتے ہیں۔ مگر اصول و ضوابط کے معاملے میں اُن سے کیوں نہیں سیکھتے۔ جرائم ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مگر ہم میں اور مغربی اقوام میں فرق یہ ہے۔ ہم اپنے ماضی سے بالکل نہیں سیکھتے۔ نہ اپنی اپنی غلطیوں کو سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”یہی کیس اگر امریکہ یا برطانیہ میں ہوا ہوتا۔ جو کہ ہوتے ہیں۔ وہاں پر بھی روزمرہ کی بنیاد پر قانون نافذ کرنے والے ادارے ایسے کالے کرتوتوں والے لوگوں کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں۔ وہ ایک مجرم کو پکڑنے کے بعد سزا دیتے ہیں۔ معاشرے میں ایک مثال قائم کرتے ہیں۔ ہم نے ٹیکنالوجی اپنا تولی ہے۔ مگر اسکے مثبت یا منفی اثرات کو نمٹنے کے لیے ابھی بالکل بچے ہیں۔ ابھی ہمیں بہت سال تک ان مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پر کم از کم ہم سب اپنا رول ادا کرتے ہوئے تھوڑے پیمانے پر ہی سہی مگر اپنے ارد گرد پر نظر ضرور رکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہم ایک چھوٹی سی بریک لیتے ہیں۔ آپ کہیں مت جائیے گا۔ ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔۔۔“

کمرشل بریک کے شور نے ہال میں موجود افراد کو کوسے سے نکالا۔ مگر وہ ویسے ہی اُت بنی کھڑی تھی۔ خالدہ نے اپنے آنسو دوپٹے کے پلو میں جذب کرتے ہوئے مافیہ کو مخاطب کیا۔

”مافی بہن کو بولو بیٹھ کر کھانا کھائے ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“

مافیہ پہلے ہی اپنے آنسو صاف کر چکی تھی۔ ہاتھ کو دیکھا۔ جسکا رنگ ہلدی کی مانند ہو رہا تھا۔

”تاشی بیٹھ جاؤ۔۔۔“

مافیہ نے دو دفعہ کہا مگر اُسکے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔

مافیہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسکے پاس آئی۔ بازو پکڑ کر کھینچا۔ ہاتھ کسی دیوار کی طرح وہیں پہنچے ڈھے گئی۔

حرمین کی چیخ نکل گئی۔

”امی دیکھیں تاشی آپ کی کو کیا ہو گیا۔“

وہ چٹائی پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔

خالدہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

سارے زخم تازہ ہو گئے۔ مافیہ نے اُسکے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ہوش میں آتے ہی وہ ماں کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

”امی ایک اور عابدین مر گیا۔ ہائے امی میرا عابدین مر گیا۔ اس عابدین کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ امی وہ آنکھوں کے سامنے مرا تھا۔ اُن لوگوں کو کوئی رحم نہیں آتا۔ اُنکے اندر کوئی رحم نہیں ہوتا۔ عابدین کو درد بھی ہوا ہوگا۔ اللہ پاک ان لوگوں پر عذاب کیوں نہیں نازل کرتے۔ انکی شکلیں گئے کہ طرح کیوں نہیں ہوتی ہیں۔ یہ کتنے عابدین ماریں گے۔“

”تاوفہ میری جان صبر۔۔۔ یہ بھی تو دیکھو وہ شیطان مارا گیا ہے۔ اللہ نے کتنا بڑا کرم کیا ہے۔ اتنے سالوں بعد ہی سہی پر اللہ نے ہمیں انصاف دے دیا۔ اُس دردے کو اللہ نے ساری دنیا کے سامنے نکال کر دیا۔ میری جان حوصلہ کرو۔ تاشی میں نے اس دُکھ پر اتنے آنسو بہائے ہیں۔ اب میرے میں ہمت نہیں ہے۔ میں یہ دُکھ بھول جانا چاہتی ہوں۔ کیونکہ جتنی دفعہ میں اسکو یاد کرتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے۔ جیسے کوئی میرے دل میں ٹھہرا کھونپ رہا ہو۔“

تاوفہ نے اپنے آنسو صاف کئے۔ امی ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ بے شک غم کبھی مرنے نہیں ہے۔ پر انسان اُسکے ساتھ سمجھوتا کر کے جینا سیکھ جاتا ہے۔ امی بھی شاید جینا سیکھ گئی تھیں۔ یا ابھی کوشش میں تھی۔ تاوفہ کو لگا اُسکو کوئی حق نہیں ہے۔ وہ ایک دفعہ پھر سے اُنکو اس جنگ میں اپنے ساتھ دھکیلے۔

”امی کیا ہم باہر کے امی ابو سے ملنے جاسکتے ہیں؟۔۔۔“

”اگر تمہیں اُن سے مل کر خوشی ملتی ہے۔ تو میں لے جاؤ گی۔“

”امی ہم تو اس درد سے واقف ہیں۔ باہر کی امی تو ابھی سنبھل نہیں پارہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے۔ ہماری آپ بیتی سُن کر اُنکو تھوڑا حوصلہ ہو۔ یہ احساس ہو وہ اکیلی نہیں ہیں۔ ہم اُنکے ساتھ ہیں۔“

”ٹھیک ہے میری جان چلے چلیں گے۔ اب جا کر منہ دھو کر آؤ اور کھانا کھاؤ۔“

وہ چُپ چاپ اُنکی بات پر عمل کرنے کے لیے اُنھی تو ذہن میں کچھ عرصہ پہلے کی پڑھی ایک نظم کے الفاظ تازہ ہو گئے۔

فائزہ جعفری ایک کم عمر شاعرہ نے کیا خوب لکھا ہے۔

یہ بند کمرہ میرا

وحشتوں سے بھری دنیا

میں تو ہوں معصوم سا بچہ

کیوں وحشتوں میں کھو گیا

کیوں تاریکیاں مقدر میری

کیوں روشنی دشمن شہری

مجھ کو تو تھا آسمان کو چھونا

وسیم اکرم، آفریدی تھا بننا

کیوں مجھ لے چھین گیا کوئی

میرا بچپن، میرا پسنا

ہر کوئی مجھ سے پوچھے

میں کیوں تنہا میں کیوں اکیلا

وحشتوں کا ساتھی کیوں ہوں

اندھیروں کا اب عادی کیوں ہوں؟

میں تو کھلتا پھول تھا جیسے

ماں باپ کا نور ہو جیسے

کیوں بے گانا ہوا میں خود سے

کیوں انجانا ہوا میں سب سے

کوئی نہ جانے، کوئی نہ سمجھے

کیا مجھ پے بیت گیا ہے

اب تم جو مجھ سے پوچھ رہے ہو
ان وحشتوں کا سبب کیا ہے؟
ان تلخیوں کی صورت کیا ہے
آنکھیں میری بجھی سی کیوں ہے
صورت میری دکھی کیوں سی ہے
سن سکو گے؟؟؟؟

سن سکو گے سکی میری
سہ سکو گے چنیں میری
اشکوں سے عیاں نہ ہوگا
لفظوں سے بیان نہ ہوگا
مجھ سے چھین گیا
میرا بچپن، میرا اپنا
لگتا تھا اپنا سا کوئی
زمین پے ہو فرشتہ سا کوئی
مگر.....

ہوس کا مارا تھا وہ
وہ تھا وحشی وہ تھا درندہ
مجھ سے میرا چھین گیا وہ
میرا بچپن، میرا اپنا

☆.....☆.....☆

وہ چیف احسان اللہ کے گیٹ کے باہر موجود تھا آنے سے پہلے آنکھ کال کر کے آیا تھا۔

چوکیدار نے اُسکو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔

”سر صاحب کا حکم ہے آپ کو دروازے سے ہی واپس نہ جانے دیا جائے۔ وہ اندر آپ کے منتظر ہیں۔“
اُس نے اپنے ساتھ موجود ارسلان کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر اندر کو آ گیا۔

ملازم نے ڈرائیونگ روم تک اُن دونوں کی رہنمائی کی تھی۔ جہاں اُنہوں نے چیف کو اپنے استقبال میں موجود پایا۔

”اسلام علیکم سر۔۔۔“

”وعلیکم اسلام۔۔۔ آؤ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ بہت مبارک ہو۔ تم اپنے مشن میں کامیاب ہوئے ہو۔“
اُنہوں نے مصافحہ کرتے ہوئے اُسکی کمر پہ چھکی دیکر صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”شکر یہ سر۔۔۔ پر مجھے بہت افسوس ہے۔ میں باہر مُراد کو بچا نہیں سکا۔“

صوفے پر اپنی جگہ سنبھالنے کے بعد وہ افسردگی سے بولا تو چیف نے بڑی گہری نظروں سے اُسکا جائزہ لیا۔
دو تین دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی کالے رنگ کی شلوار قمیض اُداس آنکھیں۔۔۔

”جنٹل مین تم کافی تھکے ہوئے ہوئے لگ رہے ہو۔ کیا طبیعت ٹھیک ہے؟۔۔۔“

”جی سر پریکٹلی فائن۔۔۔ بس کچھ راتوں سے مصروفیت کی بنا پر نیند پوری نہیں ہو سکی۔“

”جنٹل مین آئی ہوپ کہ یہی وجہ ہو۔ اینڈ یوسٹ ریٹ۔۔۔ اور جہاں تک رہی بات باہر مُراد کی اب تو

یہ بات تحقیقات کے بعد سامنے آ چکی ہے۔ وہ بچہ تمہیں کیس ملنے سے بہت پہلے ہی اس جہانِ فانی سے پردہ کر

چکا تھا۔ اسلئے تمہیں گلٹی فیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یو ہیو ڈن آ ٹرمینڈس جاب۔۔۔ تم تمہاری پوری ٹیم

کے لیے میں نے ترقی کے ساتھ ساتھ خصوصی انعامات کا اعلان کیا ہے۔“

”سر مجھے کوئی انعام نہیں چاہیے۔ میں نے اب تک کی ملنے والی ساری رقم واپس مُراد صاحب کے اکاؤنٹ

میں منتقل کروادی ہے۔ یہ میرا اور میری ٹیم کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ سر ہماری غیرت گوارا نہیں کر رہی کہ ہم مراد

صاحب سے اس کام کی اجرت وصول کریں۔ میں اگر اُنکا بیٹا بازیاں کروانے میں کامیاب ہوتا تو شائد اور بات

ہوتی مگر اس صورت میں ہرگز نہیں۔“

اُسکو علم تھا۔ اگر اندر سے وہ آگئیں تو اُس صورت میں رات کا کھانا کھائے بغیر یہاں سے جانے نہیں دینگے۔
اسیے جلدی جلدی میں نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھتے وقت مریم کا منہ سو جا ہوا تھا۔ وہ اُسکے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ ارسلان ابھی بھی خاموشی سے پچھلی سیٹ پر براجمان تھا۔

اُس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے نظر موڑ کر مریم کو دیکھا۔

”مس افلاطون آپ اس قدر غصے میں بھری کیوں بیٹھی ہیں؟“

”آپ مجھ سے بات نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔“

”اچھا جی۔۔۔!!۔۔۔“

”ہاں جی۔۔۔!!۔۔۔“

”اب بندہ بشر نے کیا کر دیا۔“

”مجھے ایک ہفتہ پہلے یہاں چھوڑ کر کیا گئے۔ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ اور آج بغیر پوچھے لینے آ گئے۔ بے جی اور آپ اپنی ایمن تو گھر پہ ہی نہیں تھیں۔ اب جب وہ واپس آئیں گی۔ یہ جان کر کتنا دکھ ہوگا۔ بے وفا مریم ملے بغیر ہی واپس چلی گئی۔“

”ہاں تو بے وفا مریم کونسا کسی دوسرے پلانٹ پر شفٹ ہو رہی ہے۔ ایک ہی شہر میں ہو۔ جب جی کرے آ کر مل جانا۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں۔ میں کال کر کے ہی آیا تھا۔“

”کال کر کے آنے کا بتایا تھا ناں۔ اجازت تو نہیں لی تھی۔“

”ملکہ عالیہ جی اگلی دفعہ خادم اجازت لیکر آنے کی جسارت کرے گا۔“

”میں جانتی ہوں۔ آپکا اور ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ آپ کبھی ہم سے ملنے نہیں آئیں گے۔“

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیک ویو مرر کے ذریعے ارسلان پر نظر پڑی جو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

کبھی کبھی ایسے انسانوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ جو غیر ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں لگتے۔ اور بعض اوقات

سالوں کی جان پہچان کے باوجود لوگ اندر سے اجنبی نکلتے ہیں۔

قبرستان آنے تک گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ جسے توڑنے کی کسی نے کوشش بھی نہیں کی۔

قبرستان کے گیٹ کے سامنے گاڑی روکنے کے بعد وہ باہر نکلا۔

پہلے ارسلان کا دروازہ کھولا پھر مریم کا۔۔۔

ارسلان باہر نکل آیا۔ جبکہ مریم کتنی دیر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے آنسو کنٹرول کرتی رہی۔

اُس نے ڈیش بورڈ پہ رکھا۔ پھولوں کا بیگ ارسلان کے حوالے کیا۔ اور اُسکے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا قبرستان میں داخل ہو گیا۔

مطلوبہ قبروں پر پہنچ کر اُس نے فاتحہ پڑھنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اُسکی تلقید میں ارسلان نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ الگ بات کہ اُسکی آنکھیں خشک تھیں۔ جبکہ ارسلان کی آنکھوں میں بار بار پانی جمع ہو رہا تھا۔ جسے وہ اپنی آستین کے ساتھ پونچھ لیتا۔

جب تک اُس نے دُعا مانگ کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہچکیوں کی آواز نے بتا دیا۔ مریم بھی آچکی تھی۔

رونے کے دوران مریم نے اپنے والدین کی قبروں پر پھول ڈالے جو ایک ساتھ بنی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں بہن بھائی کو تھوڑا وقت اکیلے میں چھوڑ کر باہر آ گیا۔

چند رہ منٹ بعد وہ لوگ آتے دیکھائی دیئے۔

جب اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ ہاتھ میں پکڑا آدھ پیا سگریٹ زمین پر پھینکنے کے بعد جوتے سے گچل کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”تمہارے ماموں کی خواہش ہے۔ وہ تم دونوں کو اپنے گھر رکھنا چاہتے ہیں۔ اب تم اپنی مرضی بتا دو۔

ماموں کے گھر چھوڑ کر آؤں یا تمہارے اپنے گھر۔۔۔؟۔۔۔“

”اس سے پہلے کہ آپ ہمیں چھوڑ کر آئیں۔ کیا ہم آخری ذرا ایک ساتھ کر سکتے ہیں؟۔۔۔“

”ڈنر۔۔۔؟۔۔۔“ اُس نے بیک ویو سے ارسلان کو دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔۔۔“

”کیوں نہیں یار ڈنر کرتے ہیں۔ بتاؤ کہاں جانا پسند کرو گے؟۔۔۔“

”کیا منیر بھائی ڈنر میں ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں۔“

ارسلان ڈرتے ڈرتے پوچھ رہا تھا۔ جس پہ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”یار منیر مفت کا کھانا کم ہی چھوڑتا ہے۔ یہ تو تم فون کرو۔ وہ جہاں بھی ہوا۔ کھانے کی تشبو سوگھتا ہوا آ جائے

گا۔“ اُس کی نظریں سامنے روڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنا موبائل مریم کی طرف بڑھایا۔

جس نے پہلے تو کامیکٹ لسٹ کا سرسری سا جائزہ لیا۔ پھر سپیڈ ڈائل میں موجود منیر کے نام پر کال کی۔

دوسری جانب جگہ کا نام دیکر فون بند کر دیا۔ مریم ابھی نمبروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب اُس نے اُس کے

ہاتھ سے اپنا فون لیکر ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا۔

مریم تھوڑی دیر خاموشی سے باہر دیکھتی رہی۔ جہاں پر اندھیرا ہوتے ہی روشنیاں جلنا شروع ہو گئی تھیں۔

”انسان اگر ساری عمر روشنی میں ہی گزار دے تب بھی اُسکو اندازہ نہیں ہو پائے گا کہ روشنی اللہ کی کتنی بڑی

نعمت ہے۔ روشنی کی اصل قدر اندھیرا دیکھنے کے بعد ہوتی ہے۔ اندھیرا روشنی کی پہچان ہے۔ کیونکہ اندھیرا ہو گا تو

آپ روشنی کی خواہش کریں گے۔“

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ جب مریم کے سوال پر چونکا جو بڑے مزے سے پوچھ رہی تھی۔

”منگو بھائی آپکی شادی ہو گئی؟۔“

وہ اُسکے سوال پہ واقعی حیران ہوا تھا۔

”کیوں؟۔۔۔“

”کیونکہ میں آپکے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ آپ کا تعلق کس شہر سے ہے۔ بہن بھائی کتنے ہیں۔ امی

ابو زندہ ہیں؟“

”سوال و جواب سے شناسائی بڑھتی ہے۔ اور جہاں پر کوئی تعلق نہ ہو وہاں پر شناسائی بڑھانے سے گریز

ضروری ہے۔“

”آپکے اور ہمارے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ تو دو دفعہ فقط ہماری جان بچانے کے لیے خود کو کیوں

خطرے میں ڈالا؟۔۔۔ ہمیں ہماری ماں کے ساتھ ہی مرنے دیا ہوتا۔“

”میں نے جو کیا وہ میرا فرض تھا۔“

”اب جو میں کر رہی ہوں۔ اُسے میرا فرض سمجھیں۔ مگر میرے لیے تو اس وقت سب سے اہم رشتہ آپ ہی ہیں۔ خود کو میرا بڑا بھائی سمجھ لیں۔ یا میرا باپ مگر اب تو جو بھی ہے۔ صرف آپ ہی ہیں۔“

”پاگلوں جیسی باتیں نہ کرو۔ آج اپنی زندگی میں واپس جاؤ گی۔ کل سب بھول جاؤ گی۔“

”آپ بھول جائیگے۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ میں ارسلان کی گارنٹی نہیں دیتی۔ مگر میں کبھی بھی آپ کو بھولنا نہیں چاہتی ہوں۔ آپ کا کردار میری زندگی میں ایک رول ماڈل کا ہے۔ آپ نے مجھے زندگی کا بڑا اہم سبق دیا ہے۔ اپنی ذات سے نکل کر دوسروں کے لیے جینے کا سبق۔“

”میں اس قدر مہمان نہیں ہوں۔ جس قدر تم مجھے بنارہی ہو۔ یہ میرا کام ہے۔ پیسہ لیکر اپنا کام کرتا ہوں۔“

”ہاں میرے ابو بھی تو اپنی نوکری کے پیسے لیتے تھے۔ مگر کیا ہوا؟۔۔۔ میں نے ایمن آپا کے کلیٹک پہ وہ بچے دیکھے ہیں۔ جنکی آنکھوں میں کوئی روشنی نہیں بچی ہے۔ تاریک آنکھوں سے جب آپ کی جانب دیکھتے ہیں۔ تو انتہا کی وحشت ہوتی ہے۔“

مریم رونے لگی تھی۔ وہ لب بچنے کا ڈی چلا تارہا۔ کہنے کو بچا ہی کیا تھا۔

”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔“

”کیا؟۔۔۔“

”میں اپنے ابو کی ساری پراپرٹی بیچ کر اُن بچوں کے لیے شیلٹر بناؤں گی۔“

اُس نے گردن موڑ کر مریم کو دیکھا۔

”ابھی تم جذباتی ہو رہی ہو۔ گھر جا کر آرام سے بیٹھ کر سوچنا۔“

”آپ بے شک میرا ساتھ نہ دینا۔ مگر مجھے اس فیصلے سے پیچھے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ ہو سکتا ہے۔ اس طرح میرے ابو کی مغفرت ہو جائے۔ ہو سکتا ہے اُن لاوارثوں کو چھت ملے تو میرے ابو کی خطائیں بخش دی جائیں۔ مجھے یہ خیال راتوں کو سونے نہیں دیتا کہ اُنکو سزا مل رہی ہوگی۔“

اُس نے ہاتھ بڑھا کر مریم کے سر پر رکھا۔ جھکی دینے کے بعد ٹٹو اُسکی جانب بڑھائے۔
 ”ٹھیک ہے دادی اماں جو کہو گی کر لیں گے۔ مگر ابھی کے لیے یہ آنسو پونچھ لو۔“
 آنسو صاف کرنے کے بعد وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی۔

”بتایا نہیں شادی ہو گئی ہے؟۔۔۔“

”یعنی تم نے جان نہیں چھوڑنی۔۔۔“

”سوچے گا بھی مت یہ جنوں کی مخلوق میں سے ہے۔ جب ایک دفعہ چٹ جاتی ہے۔ مگر نہی جان چھوڑتی ہے۔“ ارسلان کی بات پر منگو کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”تم تو خاموش ہی رہو ڈائینا سار کہیں کے۔۔۔“

”اچھا میں اپنا سوال الفاظ بدل کر کرتی ہوں۔ آپ کے فون میں جس نمبر پر زندگی لکھ کر سیو کیا گیا ہے۔ وہ کون ہے؟۔۔۔“

منگو کے دل نے بیٹ مس کی تھی۔ چہرہ بنجیدہ ہو گیا۔ شیرنگ پہ گرفت مضبوط ہو گئی۔

”وہ وہی ہے۔ جسکے بارے میں جاننے کا تمہیں تجسس ہو رہا ہے۔“

مریم کا چہرہ کھل اٹھا۔ تالی مارتے ہوئے بولی۔

”ہائے سچی۔۔۔؟۔۔۔ مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا۔ کیا وہ آپکی وائف ہیں؟۔۔۔ دیکھنے میں کیسی ہیں؟۔“ وہ جیسے کسی خواب سی کیفیت میں بولا۔۔۔

”وہ روشن سویرا ہے۔ سورج کی پہلی کرن ہے۔“

”ہاؤ سوئیٹ۔۔۔ اب تو مجھے ہر حال میں اُنکو دیکھنا ہے۔ کیا آپ کے پاس اُن کی کوئی تصویر ہے؟۔“

”لڑکی بریک کے پیر رکھو۔۔۔“

”پلیز تصویر ہے تو دیکھا دیں ناں آپکا کیا جائے گا۔“

”تم میرے تمام روز کے خلاف مجھ سے پرسنل گفتگو کر رہی ہو۔ پہلے حوالہ پوچھا اب تصویر مانگ رہی ہو۔ اگلی فرمائش کرو گی اُس سے ملوا کر لاؤ۔“

”نہیں آپ بس تصویر دیکھا دیں۔ مل میں خود آؤ گی۔“

”ہاں اتنی ہی تم سُپر وڈ من۔۔۔“

فون کی گیلری میں لگا پاس ورڈ ہٹا کر فون دوبارہ مریم کے ہاتھ میں دے دیا۔ ارسلان بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر مریم کی سیٹ کی پشت پر کھڑا ہو کر تصویر دیکھنے لگا۔

”منگو بھائی شی از سو کیوٹ۔۔۔“

منگو بد مزگی سے بولا۔۔۔

”شی از نوٹ کیوٹ شی از پریٹی۔۔۔“

اُسکے انداز پر مریم ہنستی چلی گئی۔

”کیوٹ کہنے پر کیوں غصہ آیا؟۔۔۔“

”کیوٹ بچوں کو کہتے ہیں۔ ایڈ شی از آئیگ گرل۔۔۔“

”کیا آپکی ہم عمر ہیں؟۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ میرے سے چار سال چھوٹی ہے۔“

”ملی کہاں؟۔۔۔“

”خوابوں میں۔۔۔“

مریم ہنستے ہوئے بولی ”یہ کیسا جواب ہے۔“

وہ بھی مُسکرا دیا۔

”آپ کو ان سے محبت ہوئی یا انکو آپ سے۔۔۔“

”اُس کے چہرے پر تو ہمیشہ نولفٹ کا بورڈ لگا ہوتا تھا۔ یہ تو اپنا دل ہی بے وفا نکلا۔“

”پہلی دفعہ انکو کب اور کہاں دیکھا۔“

”بچپن سے جانتا ہوں۔ مگر جب پہلی دفعہ اُسکو غلط نظر سے دیکھا تب وہ پندرہ سال کی تھی۔ اور میں اُنہیں

سال کا۔۔۔“

”کیا سیدھے سے جا کر اظہار محبت کر دیا؟“

”مجھے اُس سے شادی کرنی تھی۔ معاشرہ نہیں چلانا تھا۔ اُسے اُسکی بجائے اپنے والدین کو بتایا تھا۔ بلکہ کہا تھا آج ہی رشتہ لیکر جائیں۔“

”اور وہ مان گئے؟۔۔۔“

پارکنگ میں گاڑی لگاتے ہوئے وہ دھیمے سے ہنسا جیسے بُرائے وقت پھر سے یاد آ گئے ہوں۔

”مانے نہیں تھے۔ بلکہ اچھی خاصی چھترول کی تھی۔“

”مجھ سے تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا آپ کسی سے مار کھا سکتے ہیں۔“

”ہم ہر کسی کے سامنے شیر بن سکتے ہیں۔ پر اماں کی جو تیاں گیدڑ بن کر ہی کھانی پڑتی ہیں۔“

اُس نے انجن بند کر کے مریم کی جانب دیکھا جو پوچھ رہی تھی۔

”آگے کیا ہوا؟۔۔۔“

”آگے یہ ہوا کہ رسٹورنٹ آگیا۔ اور ہم نے اندر جا کر کھانا کھایا۔“

چند پل تو مریم سمجھی ہی نہیں پھر ہنسنے لگی۔

”جان بھڑانے کا اچھا انداز ہے۔ مگر مجھے جانتا ہے۔ آگے کیا ہوا۔“

وہ گاڑی سے نکل آیا۔ ارسلان کی متلاشی نظریں ارد گرد دیکھتے ہوئے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ منگو نے اُس کی توجہ رسٹورنٹ کے اندر کردوائی۔ جہاں منیر ایک میز پر بیٹھ کر میو پڑھ رہا تھا۔

ارسلان کے چہرے سے ساری اُداسی اُڑ چھو ہو گئی۔ اگلے پل اُس نے اندر کودوڑ لگا دی۔

”منگو بھائی بتائیں ناں آگے کیا ہوا؟۔۔۔ وہ آپکو کیسے ملیں؟۔۔۔“

”بڑی ضدی ہو۔۔۔ خیر اپنے گھر سے جوتے کھانے کے بعد میں اُس کے والد کے پاس گیا۔“

”یقیناً اُدھر سے بھی جوتے ہی کھائے ہو گئے۔“

منگو مسکرایا۔

”نہیں وہ بڑی نفیس طبیعت کے مالک تھے۔ اُنہوں نے بس گھورنے سے کام لیا۔ اور حکم دیکر بولے۔۔۔“

ناہجار اپنے گھر کے کسی بڑے کو بول آ کر مجھ سے ملیں۔ میں گھر گیا۔ جو ہمارے گھر کی سب سے سینئر ہستی تھیں۔
یعنی میری دادی اماں اُنکو سارا ماجرہ سنا کر اپنے ساتھ چلنے کا بولا۔
”پھر آگے کیا ہوا؟۔۔۔“

”آگے کیا ہونا تھا۔ دونوں نے مل کر فیصلہ میرے حق میں دے دیا۔ دئی اینڈ۔۔۔ اب مزید کوئی سوال مت
کرتا۔“

وہ لوگ ریسٹورنٹ کے اندر پہنچ چکے تھے۔ جہاں منیر اور ارسلان اپنی اپنی پسند کے آرڈر دے رہے تھے۔
خوبصورت ماحول میں کھانا کھانے کے بعد منگو اور منیر اُن دونوں کو اُنکے ماموں کے گھر چھوڑ آئے۔ ایک تو
اُنکے ماموں کی خواہش بھی تھی۔ دوسرا خالی گھر میں رہنے کے خیال سے دونوں ہی گھبرا رہے تھے۔ ابھی تو ماں
باپ کے بغیر زندگی کو قبول کرنے میں وقت لگتا تھا۔ مگر انسان کو اشرف مخلوق اسی لیے کہا گیا ہے۔ وہ جینے کے ہنر
سے واقف ہے۔ بچہ پہلے رنگتا ہے۔ پھر بار بار کرتا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اپنے قدموں پر جم کر کھڑا ہونا سیکھ
ہی جاتا ہے۔

منگو بھی جانتا تھا۔ یہ بچے بھی ماں باپ کے بغیر جینا سیکھ ہی جائینگے۔ جیسے وہ ہزاروں بچے بھٹک رہے تھے۔
کم از کم بھٹکنا نہیں پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

”ایک ماں نو ماہ اپنے بچے کو پیٹ میں اٹھا کر پھرتی ہے۔ اپنی جسامت کی پرواہ کئے بغیر ایک ان دیکھے وجود
کی آبیاری کرتی ہے۔ دن رات اُسکے بارے میں سوچتی ہے۔ اتنے پرہیز کرتی ہے۔ یہ نہ کھاؤں کہیں میرے
بچے کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ کتنے دل پسند مشظوں سے ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔

پیدائش کے مرحلے میں موت کو ہاتھ لگا کر واپس آتی ہے۔ اتنی تکلف سہہ کر جسکو پیدا کیا۔ پل پل خدمت
کر کے اُسکو بڑا کرتی ہے۔ کوئی ظالم آتا ہے۔ اور بچے کو اغوا کرتا ہے۔ مار دیتا ہے۔ اتنے بڑے ظلم پر آسمان
کیوں نہیں گرتا؟۔۔۔“

”لوگ مجھے کہہ رہے ہیں۔ اپنے دوسرے بچوں کی جانب دیکھو۔ جو چلا گیا ہے۔ اُسکو بھول جاؤ۔۔۔“

”میں کیسے بھول جاؤں کیا میں نے اُسکی دفعہ وہ ساری مشقت نہیں اٹھائی جو انکی دفعہ اٹھائی ہے۔ میری آنتیں کاٹ کر جسم سے جدا کر دی گئی ہیں۔ میں کیسے صبر کروں؟ مُراد پچھلے چار ماہ سے میں ایک اُمید میں جی رہی تھی۔ اُس کے سر پر زندہ تھی۔ میرا بچہ مل جائے گا۔ مگر اب کیا کروں۔ کیسے جیوں؟۔۔۔ وہ کتنا رویا ہوگا۔ اُس نے تمہیں آواز دی ہوگی۔ وہ میرا نام لیکر تڑپا ہوگا۔ ظالموں نے اُس کے ساتھ کیا کیا؟۔۔۔ میرے بچے کا بچپن چھین لیا۔ اُسکی بے فکر چھین لی۔ اُسکی پاک سوچ و عصمت کو تار تار کیا۔ اور میں زندہ ہوتے ہوئے بھی اُسکے لیے کچھ نہیں کر پائی۔ میں مر کیوں نہیں گئی۔ میرے سانس ختم کیوں نہیں ہو جاتے۔ میرا وجود میری روح کا بوجھ خود سے جدا کیوں نہیں کر دیتا۔ میں ایک مسلمان ملک کی شہری ہوں۔ یہ کلمہ پڑھنے والوں کی سر زمین ہے۔ اور یہاں پر ظلمت کے اندھیروں نے میرے گھر کو تاریک کر دیا۔ کیا میرے بچے کبھی اپنے بھائی کو بھول پائیں گے؟۔۔۔ وہ جب جب یاد آئے گا۔ اُسکے ساتھ ہوا ظلم بھی یاد آئے گا۔ ہم پل پل مریں گے۔ مُراد میں ایسی زندگی نہیں چاہتی۔ مجھے کہیں سے میرا بچہ لا دو۔ ہائے اللہ جی میرا بابر۔۔۔ میرا پیارا بیٹا کہاں چلا گیا۔“

مُراد کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اُسکی بیوی پچھلے چار دنوں سے ایسے ہی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بخار میں پھنک رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ اور مُراد بے بس کھڑا بس دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ اُسکے بس میں جو کچھ تھا۔ وہ کر پٹکا تھا۔

جب سے بابر کی موت کی تصدیق ہوئی تھی۔ سارے خاندان میں نئے سرے سے صوبہ ماتم بچھ گیا تھا۔ مُراد نے اپنی آنکھوں سے بہتے سیال کو آستین سے پونچھا اور بیوی کے پاس آکر اُسکو اپنی بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔۔۔

”ہم ہار گئے ہیں۔ مگر یہ بھی تو دیکھو اللہ نے بابر کے قاتل تک پہنچا دیا۔ وہ ذلیل آدمی گتے کی موت مرا ہے۔ تم مسلمان عورت ہو۔ صاحب ایمان ہو۔ اللہ کو ماننے والی ہو۔ تمہیں صبر کرنا ہوگا۔ وہ مالک بڑا بے نیاز ہے۔ وہ اسی طرح اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ ہم پر بھی بہت کڑی آزمائش آئی ہے۔ میں مانتا ہوں۔ تم ماں ہو تمہارا غم بہت بڑا ہے۔ مگر ہم بے بس ہیں۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ جن ماں باپ کے بچے بم بلاسٹ میں مارے جاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی تو صبر کرتے ہیں۔ میرے ملک میں پچھلے کئی سالوں سے نہ جانے کتنے ہزاروں سپوت

تہہ خاک چلے گئے۔ ماؤں نے رورو کر آنکھیں گوالیں۔ میں تمہیں پورا اختیار دوں گا۔ اندر بیٹھ کر رونے کی بجائے باہر نکلو۔ ماؤں کو اپنا درد بتاؤ انکو خبردار کرو۔ اپنے بچوں کی حفاظت میں الرٹ رہیں۔ میرے گلیاں محلے محفوظ نہیں رہے۔ یہاں قدم قدم پر ہزن ہیں۔ اپنے بچوں کو اپنے پروں میں مچپا کر رکھیں۔“

دروازے پہ ہونے والی دستک نے مُراد کو خاموش ہونے پر مجبور کیا۔

اُسکی بیٹی اندر آئی تھی۔

”بابا باہر کوئی صاحب آئے ہیں۔ ملازم نے انکو ڈرائینگ روم میں بیٹھایا ہے۔“

”اچھا بیٹے آپ ادھر اپنی مئی کے پاس بیٹھو میں دیکھتا ہوں۔“

مُراد بیٹی کو بیوی کے پاس بیٹھا کر باہر آ گیا۔

ڈرائینگ روم کے دروازے تک پہنچتے ہی اُسکی نظر سامنے کھڑے سفید لباس میں ملبوس اُونچے لمبے شخص پر پڑی تو چہرے پہ عقیدت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”زہے نصیب یا رتم کدھر سے راستہ بھول آئے۔“

مراد کی بات پر وہ پلٹا اور مُراد کے ساتھ بغل گیر ہوا۔

”شرمندہ نہ کریں جناب۔“

”میں یہ سوال پوچھنے کی زحمت نہیں کروں گا۔ میرے گھر کا پتا کہاں سے ملا۔ مگر تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حقیقی خوشی ہوئی ہے بیٹھو۔“

وہ باوقار انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بھابھی کی طبیعت اب کیسی ہے؟۔۔۔“

مُراد کے چہرے پہ افسردگی چھا گئی۔ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”ابھی زخم ہرا ہے۔ چوٹ تازی ہے۔ سنہلے سنہلے سنبھل ہی جائے گی۔“

”میں آج خاص اُن ہی سے ملنے آیا ہوں۔“

”وہ تو شاید یہاں تک نہ آ سکے۔ مسلسل بُخار میں رہنے کی وجہ سے کافی کمزور ہو گئی ہے۔ آؤ میں تمہیں اندر

لے چلتا ہوں۔ تم سے مل کر شاید اُسکی سوچ میں تبدیلی آئے۔“

مُراد اُٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا تو منگو نے اُسکی پیروی کی۔

دونوں بچے بھی وہیں پر تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی مُراد نے مطلع کیا۔

”دیکھو آج کون تم سے ملنے آیا ہے۔ یہ منگو ہے۔ جس کے پاس بابر کا کیس تھا۔“

مسز مُراد نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا۔ منگو دروازے سے باہر ہی رُک گیا تھا۔

لائٹ آن کرنے کے بعد مُراد نے اُسکو اندر آنے کا اشارہ دیا۔

”اسلام و علیکم بھابھی۔۔۔“

”وعلیکم اسلام بسم اللہ بھائی آؤ۔ مجھے جب مُراد نے بتایا میں کبھی کوئی بڑی عمر کے آفر کا نام منگو ہوگا۔ مگر تم تو

ہم سے چھوٹے ہو۔“

”عمر میں چھوٹا ہے۔ عقل میں ہم سے بڑا ہے۔“

”آپ دونوں تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں اتنا بھی چھوٹا نہیں ہوں۔ خیر میں آپکی خیریت پوچھنے حاضر

ہوا تھا۔ کیسی ہیں؟۔۔۔“

مسز مُراد کو اپنے وجود میں ان دیکھی طاقت محسوس ہوئی جو اسنے دلوں سے بستر پر بے جان پڑی رہتی تھی۔

اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم ہمارے گھر آئے ہو۔ اب مجھے لگتا ہے۔ میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

وہ اُنکی محبت پر دیرے سے مُسکراتا ہوا بیڈ کے قریب رکھی ٹری پر بیٹھ گیا۔

”مُراد بھائی تو بڑے دل جگرے والے انسان ہیں۔ اُنکی بیوی کی حیثیت سے آپکو بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتا

ہوں۔“

”اُنکی تو بات ہی نہ کرو۔ یہ کبھی کبھی تو بے حس معلوم ہوتے ہیں۔“

مُراد کی اپنی بیوی کے ساتھ نظر ملی تو دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی۔ دونوں نظر پُرا گئے۔

”تم چائے پسند کرتے ہو؟ یا کافی؟ اپنی پسند بتاؤ میں بنا کر لاتی ہوں۔ ماشا اللہ اگر تمہاری صحت کو دیکھا

جائے تو یہی لگتا ہے۔ دودھ لسی اور تازہ جوس ہی پیتے ہو گے۔“

وہ دھیمے سے ہنسا۔

”نہیں کبھی کبھار چائے بھی پی لیتا ہوں۔ مگر آپ اس وقت یہاں سے کہیں نا جائیں مجھے آپ سے بڑی ضروری بات کرنی ہے۔“

”منگو باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ پر مجھے اچھا نہیں لگے گا۔ میرا بھائی پہلی دفعہ میرے گھر آیا ہے۔ اور میں اُسکی کوئی خدمت ہی نہ کروں۔“

”تم بیٹھو میں ملازم سے کہتا ہوں۔ وہ اچھا سا اہتمام کرے۔“

مراد بیوی کو بیٹھے رہنے کا بول کر باہر نکل گیا۔ نوکر کو ہدایت دیکر واپس آیا تو منگو منتظر تھا۔

”اگر میں آپ لوگوں سے کہوں میں آج ایک سوال لیکر حاضر ہوا ہوں۔“

”حکم کرو یا ر۔۔۔ جو کچھ تم نے اس ملک کے لیے کیا ہے۔ بدلے میں جان بھی مانگو تو اللہ کی قسم میں نہ نہیں کروں گا۔“

”مراد بھائی اللہ آپکو عمر خضر عطا کریں۔ میں آپکا باہر تو واپس نہ لا سکا۔ مگر کسی اور ماں کا باہر لے کر آیا ہوں۔ جو اپنے ماں باپ سے چھڑ گیا ہے۔ جس نے ہر وہ تکلیف برداشت کی ہے۔ جو آپکے ننھے باہر نے برداشت کی تھی۔ اُس کے ماں باپ کا کوئی سراغ نہیں ہے۔ ابھی تک ہمیں صرف اتنا علم ہو سکا ہے۔ اُسکا تعلق سوات سے ہے۔ چامیلڈ ٹریڈنگ کے ذریعے لاہور لایا گیا تھا۔ ماں باپ زندہ بھی ہیں یا نہیں ہم اُنہیں ڈھونڈنے کی کوشش میں ہیں۔ ملتے ہیں یا نہیں اللہ بہتر جانتے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں۔ جب تک وہ ادھر ہے۔ بھابھی آپ اُسکا خیال کریں۔ اپنا باہر سمجھ کر اُسکو سینے سے لگالیں۔ آپکا دل نہ مانے تو بھی خیر ہے۔ کوئی زبردستی نہیں ہے۔“

”کیا تم اُسکو اپنے ساتھ لیکر آئے ہو؟۔۔۔“

مسز مراد نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے مضبوط آواز میں پوچھا تھا۔

”جی باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔“

مسز مراد نے اپنے شوہر کی نم آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بابر کے بابا میں اُسکواندر بکوالوں؟۔۔۔“

مُراد نے کچھ دیر سنجیدگی سے بیوی کا چہرہ پڑھا اور ہاں میں گردن ہلا دی۔

ملازم کے ساتھ جو بچہ کمرے داخل ہوا۔ سارے نفوس کو حیران کر گیا۔

نبلی آنکھیں کھلتا سُرخ و سفید رنگ۔۔۔ گہرے بھورے بال۔۔۔ آٹھ نو سال کا صحت مند بچہ تھا۔

لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

”ادھر آ بیٹا۔۔۔“

مسز مُراد کے بٹا نے پر وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلا اُنکے پاس آیا۔

اپنے پاس بیٹھا کر پیار سے اُسکے بال سنوارے جو گھبرائی ہوئی نظروں سے سب کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

”بیٹے آپ کا نام کیا ہے؟۔۔۔“

وہ کتنی دیر تک کچھ نہیں بولا۔ بس مسز مُراد کا چہرہ دیکھے گیا۔ بہت دیر بعد نظر موڑ کر منگو کی جانب دیکھا۔ جو اُسکا حوصلہ بڑھانے کو بولا۔

”یہ آنٹی بہت اچھی ہیں۔ یہ انکل اُنکے شوہر ہیں۔ اور یہ جو بہن بھائی دیکھ رہے ہو۔ یہ ان آنٹی کے بچے

ہیں۔ تم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔“

”مگر میں آپ کے علاوہ اور کسی کا دوست نہیں بنوں گا۔“

”یار میرے پاس تو ایک بھی خرگوش نہیں ہے۔ آنٹی کے پاس تو بہت سارے خرگوش ہیں۔ ان انکل کا اپنا

فارم ہے۔ اب خود سوچ لو دوستی کرنی ہے۔ یا نہیں۔“

نبلی آنکھیں ڈھیر ساری حیرت لیے مسز مُراد کی جانب اُنھیں۔

”کیا آپ کو خرگوش پسند ہیں؟۔۔۔“

مسز مُراد کو اپنی آواز ڈھونڈنے میں دقت ہوئی پر بلا خر بولیں۔

”جی بیٹا مجھے خرگوش بہت پسند ہیں۔“

”کیا آپ کے گھر میں خرگوش ہیں؟۔۔۔“

”ہاں جی پورے چار خرگوش ہیں۔ اور دو چھوٹے بچے بھی ہیں۔“

”اگر میں آپ سے دوستی کر لوں۔ تو کیا آپ مجھے اپنے خرگوش کے ساتھ کھیلنے دیں گی؟۔۔۔“

”مسز مراد نے ایک دفعہ پھر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا۔

”تم اگر ادھر میرے پاس رہو گے تو سارے خرگوش تمہارے ہونگے۔“

”کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟۔۔۔“

”ہاں بیٹے مگر اُس سے پہلے آپ کو اپنا نام بتانا پڑے گا۔“

”میرا نام اسد ہے۔“

”اسد خرگوش کے علاوہ اور کیا پسند کرتے ہو؟۔۔۔“

مراد نے شفقت سے پوچھا تو وہ جھکتے ہوئے بولا۔

”جہاں میں رہتا تھا۔ ادھر ایک چاچا دودھ والی سونیاں بناتا تھا۔ مگر اب میں ادھر نہیں رہتا ہوں۔ کیا آپ

کو دودھ والی سونیاں بنانی آتی ہیں۔“

مسز مراد کی ہلکی بندھ گئی۔ اسد کو اپنی آغوش میں بٹھپاتے ہوئے بولیں۔

”میری جان میں ابھی تمہیں سونیاں بنادیتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ تم میرے پاس ہی بیٹھنا۔“

منگو نے سوالیہ نظروں سے مراد کی طرف دیکھا۔

مراد کی بجائے اُسکا بیٹا بولا۔

”بابر بھی امی سے ہمیشہ دودھ والی سونیوں کی فرمائش کرتا تھا۔“

کمرے میں کتنی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ جسے ملازم کی آواز نے توڑا۔۔۔

”صاحب چائے لگ گئی ہے۔“

چائے پینے کے بعد اُس نے اجازت لی۔

مسز مراد اور بچے اسد کو خرگوش دیکھانے میں مصروف تھے۔ مراد منگو کے ساتھ باہر گیٹ تک آیا۔

”میں تمہارا بڑا شکر گزار ہوں۔ اسد کے معاملے میں ہم پر اعتماد دیکھانے کی بڑی مہربانی۔“

”مجھے لگا شائد اسد ہی بھابھی کو اُنکے غم سے نکلنے میں مددگار ثابت ہو جائے۔ باہر کو بھولنا تو ممکن نہیں ہے۔ مگر دماغی طور پر تھوڑی مصروف ہو جائیگی۔“

”ہاں ابھی تک تو تمہارا پلان کام کرتا نظر آ رہا ہے۔ وہ اتنے دنوں سے بیڈ پر پڑی تھی۔ آج اُٹھ گئی ہے۔ یہ پہلا قدم ہے۔“

”اللہ پاک صبر دیں گے مُراد بھائی جانے والوں کا پیچھے صرف غم رہ جاتا ہے۔ پر میں آپکو مبارک دیتا ہوں۔ آپکا بیٹا چلا تو گیا ہے۔ مگر وہ جاتے ہوئے کئی ماؤں کی گود آباد کر گیا ہے۔ ایک بہت اہم پہلو کی جانب ہماری توجہ مبذول کروا گیا ہے۔“

”ہاں پہلے کبھی ایسے واقعات سُنے تک نہ تھے۔ مگر آج کل دیکھنے میں آ رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہم جنس تعلقات کا رُخ جان بڑھ رہا ہے۔“

”مُراد بھائی آج جو بہت زیادہ لبرل معاشرے ہیں۔ اُن میں بھی جو خاندانی اور بات والے لوگ ہیں۔ وہ اس عذاب کو عذاب ہی سمجھتے ہیں۔ انسانی حقوق کی آزادی نہیں۔ ایک اسلامی ریاست میں تو ان باتوں پر بڑے سخت قانون ہونے چاہیں۔ دین اسلام اتنا ماڈرن اور جدید مذہب ہے۔ اسلام میں مرد کے ختنے کرنے کا حکم ہے۔ جو کسی اور مذہب میں نہیں۔ آج سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ ختنے کرے ایڈز جیسے موزی مرض کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ افریکہ میں ایک گاؤں کے دو حصے ہیں۔ ایک طرف مسلمان آبادی ہے۔ دوسری طرف ساری عیسائی آبادی ہے۔ مسلمان آبادی میں بچوں کے ختنے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہاں ایڈز کا تناسب عیسائی کمیونٹی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اسی طرح ہم جنس تعلقات میں بھی ایڈز اور ایڈز کے علاوہ اور بہت سی بیماریوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ اللہ نے یہ کام بھی ہمارے ہر حرام کر دیا۔ اسلام ہمیں بُرائی سے روکتا ہے۔ تو صرف ہماری فلاح و بہبود کے لیے۔ اور ہم ماڈرن ازم کے شوق میں بُرائی کی دلدل میں اُتر رہے ہیں۔ مُراد بھائی ہم لوگ وہ ہیں۔ جو منزل کا نشان بتانے والے تھے۔ آج ہم خود ہی اپنی منزل بھلا بیٹھے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا ایک ہی رواج ہے۔ مٹی پاؤ والا۔ ہر بات پر یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ کونسا ہمارے گھر کا مسئلہ ہے۔ کسی اور کی ٹینشن میں گھسنے کی کیا ضرورت ہے۔ مٹی پاؤ اور آگے جاؤ۔ میں نے اس کیس کو ڈراپ نہیں کیا ہے۔ ہم انشاء اللہ اپنا کام

جاری رکھیں گے۔ پکڑے جانے والے تمام لوگوں پر کیس چلیں گے۔ اور تمام کے تمام کیس پبلک کئے جائیں گے۔ عام طور پر ہمارے ہاں حادثے کی خبرٹی وہ پر چلا دی جاتی ہے۔ یہ نہیں بتایا جاتا اُس جرم پر سزا کیسا سنائی گئی۔ کیونکہ بہت کم کاروائی ہوتی ہے۔ جس سے جرم کا چرچا تو ہو جاتا ہے۔ اُس کی پاداش میں کسی کا عبرت ناک انجام نہیں دیکھایا جاتا۔ ہم یہ رواج بدل رہے ہیں۔ ہم پہلے سزا دلوانے لگے اُس کے بعد مجرم کو میڈیا کے سامنے بے نقاب کریں گے۔ تاکہ لوگوں کو علم ہو۔ یہاں جرم کر کے بچے گا کوئی نہیں چاہے وہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو۔

”اللہ تمہیں تمہارے مشن میں کامیاب کریں۔ تم نے مجھ سے فیس تو نہیں لی۔ مگر میری چاہت ہے۔ جو بچے بازیاب ہوئے ہیں۔ اُنکے لیے میں کوئی نہ کوئی تعاون ضرور کروں۔ اسکے لیے اس دفعہ جو رقم میں تمہارے اکاؤنٹ میں بھیجوں وہ واپس مت کرنا۔“

”جو حکم بھائی صاحب انشا اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ ابھی کے لیے اللہ حافظ۔۔۔“

”اللہ حافظ منگو۔۔۔ یا آج تمہارا میرا تعلق غیروں سے نہیں رہا۔ کم از کم آج اپنا اصل نام تو بتاتے جاؤ۔“

اُس نے ہنستے ہوئے اپنا اصل نام بتایا اور گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ منیر ہیڈ سیٹ لگائے گیرز کھیل رہا تھا۔ اُس کے گاڑی میں بیٹھے ہی منیر نے فون ایک طرف رکھا اور گاڑی سٹارٹ کی۔

”اب کدھر کو چلنا ہے؟۔۔۔“

”اب ہوم سویٹ ہوم۔۔۔“

”آپکے ہوم یا میرے؟۔۔۔“

”تم بھی میرے والے ہی چلو مزار ہے گا۔“

”آئی سے ڈانٹ تو نہ پڑے گی؟۔۔۔“

”وہ مجھے ہی پڑے گی۔ میری خاطر ایک آدھ طعنہ کھا لیتا۔“

”آپ کی خاطر گولی کھاتے کھاتے بچا ہوں۔ اماں کی ڈانٹ تو گولی سے بھی جگڑی ہوتی ہے۔“

منگو نے ہنستے ہوئے سیٹ پیچھے کولمبی کر کے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ خاندان کی نئی نسل میں پہلی شادی تھی۔ اس لیے دو دو اور قریب کے بھی رشتہ دار مدعو تھے۔ اتنا بڑا گھر تھا۔ مہمان آسانی سے سما گئے تھے۔

چوڑیوں کی کھنک اور نشیلے قمچے، آتی جاتی دوشیزاؤں کے رنگین آنچل، ڈھوکی کی تھاپ پر گائے جانے والے روایتی ٹپے۔ ہر پہلو دلآویز تھا۔

لڑکوں کی مائیں تو پھولے نہیں سار ہی تھیں۔ ایک ایک رسم کو نبھایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے حرا اور فاطمہ کو مہندی لگائی گئی تھی۔ اب لڑکوں کی باری تھی۔ مگر واسع کا کیا کرتے۔ جس کی ایک ہی ضد تھی۔ جب تک فریودنوازش گھر نہیں آ جاتا۔ وہ مہندی نہیں لگوائیں گے۔ رات کے بارہ بج گئے تھے۔ فریودن کے بارے میں کسی کو بھی علم نہ تھا۔ وہ اس وقت کہاں پایا جا رہا ہے۔

نوازش علی اپنے فون سے اُس کا نمبر ڈرائی کر رہے تھے۔ مگر فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ ”اس لڑکے نے لا پرواہی کی حد کی ہوئی ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے اسکو گھر سے لکھے ہوئے۔ کہہ کر گیا تھا۔ کمپنی کی طرف سے نور پر جا رہا ہوں۔ اس ایک ہفتے میں اُس نے صرف دو ایک بار ہی مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ ایسا تو وہ لوگ بھی نہیں کرتے جو باہر کے ممالک میں روزگار کمانے جاتے ہیں۔“

شمیم جھنجھلائی ہوئی بیٹھی تھیں۔ دل ہی دل میں پریشان بھی تھیں۔ کم از کم فون تو اٹھالے۔

”چچی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میری صبح ہی اُس سے بات ہوئی تھی۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اُس نے وعدہ

تھا۔ مہندی کی رسم تک پہنچ جائے گا۔“

واسع کے بتانے پر اُن کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ تب ہی وہ ساس کی جانب مڑیں۔

”اماں آج آپ بڑے تحمل کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ لاڈ لے پوتے کی بات ہے ناں ورنہ اگر ہم میں سے کوئی

اس طرح لیٹ ہوتا تو آپ نے سب کی شامت بٹھائی ہوتی تھی۔“

”تم میرے بچے کو اس گھر کے لوگوں سے مت ملاؤ۔ وہ تم سب جیسا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر اُس نے وعدہ کیا ہوا ہے۔ تو بے فکر رہو۔ پہنچ جائے گا۔ بس راستے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔“

ساس کی بات پر شمیم نے دل و جان سے آمین بولا تھا۔

”ویسے بہو۔۔۔؟ تم نے فرہود کی شادی کہاں کرنی ہے؟ میری مانوں تو عاشری نے جو بتایا تھا ناں کہ وہ کسی گوری کو پسند کرتا ہے۔ چپ چاپ اُسکی شادی وہیں کر دو۔“

”اماں میرا ایک ہی ایک بیٹا ہے۔ میں کیوں اُسکے لیے ایک غیر مذہب کی لڑکی لاؤں گی۔ میری نسلیں ہی جاتی رہیں۔“

”تمہارا بیٹا اب سمجھدار عمر کو پہنچا ہوا ہے۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتا ہے۔ اُسکی شادی وہیں کرو۔ کیا علم کل کو تمہاری پسند کے ساتھ انصاف نہ کرے۔ تب کیا کر لو گی؟“

”اماں یہ آپ کہہ رہی ہیں؟“

”ہاں تو اس میں بُرائی کیا ہے۔ تمہارا بچہ اتنا نیک اور سعادت مت ہے۔ نہ جانے دن سے لکیر رات تک کہاں کہاں کیسی کیسی خاک چھانتا ہے۔ تم اسکو ایک ذرا سی خوشی نہیں دے سکتی ہو۔ کیسی ماں ہو۔“

صدے سے شیم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اُنہوں نے شوہر پر ایک شکوہ کناں نظر ڈالی اور اپنے غصے کو قابو کرنے کی کوشش میں بولیں۔

”اماں وہ باپ کی اتنی بڑی جائیداد کا تھا وارث اُسکو کیا ضرورت پڑی ہے۔ وہ در در کی خاک چھانتا پھرے۔“

”شیم پُتر میرا مشورہ ہے۔ کبھی وقت نکال کر اپنے بیٹے سے یہ ضرور پوچھنا وہ کیا کام کرتا ہے۔“

”آپ دیکھ رہے ہیں؟۔۔۔“

شیم اب ڈائریکٹ نوازش علی سے مخاطب تھیں۔

”اماں وڈی آج بھی ہمیشہ کی طرح اپنے سخت الفاظ سے میرا سینہ چھلنی کر رہی ہیں۔ جواب میں اگر میں نے کچھ کہہ دیا تو آپ کو بڑا غصہ لگتا ہے۔“

”تم جو بھی کہنا چاہتی ہو۔ کھل کر کہو۔ میرا بیٹا غصے کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ پر جو باتیں میں نے کی ہیں۔ اُن پر آگ بگولا ہونے کی بجائے غور کرو۔ جوان اولاد اگر بے راہ روی کی جانب نکل جائے تو قصور ماں باپ کا ہی ہے۔ کیوں فضول کی رکاوٹیں ڈال کر اُنکو بھٹکنے کا موقع دیا۔ جوان ہوا ہے۔ وقت پہ شادی کر دو۔“

باہر جانے کی بجائے اپنے گھر میں دل لگائے۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں۔ جیسے میں جان بوجھ کر بیٹے کی شادی نہیں کر رہی ہوں۔ کوئی اچھی لڑکی بھی تو ملے۔“
”کتنی لڑکیوں کو رد کر چکی ہو؟ رشتے کروانے والے کو تم کہتی ہو بہتر سے بہترین لڑکی دیکھانا۔ پھر اُس بہترین لڑکی میں بھی کوئی نہ کوئی عیب نکال کر گھر آ جاتی ہو۔ اسلیے اب کی بار پُچپ چاپ بیٹے کی پسند پہ ہاں کر دو۔“
”یہ شوشہ عائشہ نے چھوڑا ہوا ہے۔ ورنہ فرہود نے تو کبھی کسی لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔“
”چلو تم اوروں کے ہی قصور نکالنا۔“

وہ چار پانچ لوگ باہر والے گیٹ کے پاس بیٹے ہوئے تھے۔ شمیم جواب میں کچھ کہنے کے ارادے میں تھیں۔ جب گیٹ کے باہر کالی بی ایم ڈبلیو کی۔
واسع نے خوشی سے نعرہ مارا۔۔۔
”لو جی آگیا اپنا شہزادہ۔۔۔ چل اگے ڈھول والے کو یو لو بجائے ذرا۔۔۔“
تین ڈھول ایک ساتھ بجے تھے۔ جس کی وجہ سے تمام مہمان جو ٹولیوں کی شکل میں بکھرے ہوئے تھے۔
ایک دم متوجہ ہو گئے۔

لڑکے سارے باہر کو نکل گئے۔ کیمرے والا آگیا۔
واسع نے فرہود کے گلے لگ کر زور سے بھینچا۔۔۔
”فرہود تیرے لارے۔۔۔“

منڈے رہن کنوارے۔۔۔“

ہنستے ہوئے فرہود نے واسع کی چپی کا جواب دیا۔

”میں نے کب کہا تھا میرے انتظار میں بکری بن کر بیٹھنا۔“

”پر میں مہندی لگنے کے بعد سب سے پہلی چماٹ تجھے مارنا چاہتا تھا۔ کیا پتا میری چماٹ کھا کر ہی تیری لاٹری نکل آئے۔“

شمیم فرہود کو آوازیں دیتی ہی رہ گئیں۔ شمن آلود سفید شلوار قمیض تھوڑی تھوڑی بوڑھی داڑھی دائیں آنکھ کے

اوپر نہ جانے وہ پلاسٹر تھا یا کوئی ٹیپ اب اتنے رش میں وہ آگے آ کر دیکھ بھی نہ سکیں۔

سارا گھر اور حویلی مصنوعی روشنیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ آتش بازی نے سما باندھ دیا۔ ڈھول کی تھاپ پہ لڑکوں کا رقص، پیسوں کی سوٹ لڑکے کو گونے والے دوپٹے تلے گیٹ سے اندر لا کر سٹیج پر بٹھایا گیا۔

واسع نے فریود کو ایک بل بھی اپنے پہلو سے ہٹے نہیں دیا۔ جوائنٹا کا تھکا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی نہ جانے کس اُمید پہ نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اُس کے اندر مایوسی اُتر رہی تھی۔

اُسکو نہیں خبر کون کون واسع کو مہندی لگانے آیا۔ دیکھا ہوا ہیں موجود ہو کر بھی غائب تھا۔ یار دوست مہندی لگا کر چلے گئے تو گھر کی خواتین کی باری آئی۔

”عائشہ چچی آپ کہیں سے بھی لڑکے کی ماں نہیں لگ رہی ہیں۔“

”کو کیا دادی لگ رہی ہوں۔“

فریود اُنکے جواب پہ ہنستے ہوئے بولا۔

”جناب عالی بڑی بہن لگ رہی ہیں۔“

”رہنے دو فریود تم ہمیشہ ایسے ہی جھوٹ بال کر مجھے خوش کرتے ہو۔“

”لو جی کر لو بات میری بات یہ یقین نہیں ہے۔ تو چچا سے پوچھ لیں۔“

”چپ کر و شرارتی کہیں کے۔“

”کمال بات ہے چچی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اور آپ آج بھی چچا کے ذکر پر بلش کر رہی ہیں۔“

”ابے کچھ شرم کر میرے سامنے میری ماں کو کیا کیا بول رہا ہے۔“

واسع کے بولنے پر وہ اُس کو گھورتے ہوئے بولا۔

”ٹوچپ کر کے بیٹھ زیادہ طرم خان نہ بنا کر وہ میری بھی ماں ہیں۔“

عائشہ بولی۔۔۔ ”فریود بھائی آپ دونوں کو ایک ساتھ بیٹھا دیکھ کر یہ لگ رہا ہے۔ جیسے مہندی کی رسم آپ کی ہو رہی ہے۔ کیونکہ واسع بھائی تو کلین شیو کے ساتھ مایوں کا ڈلہا لگ ہی نہیں رہے۔ البتہ آپ کا حلیہ بالکل ویسا

نی بنا ہوا ہے۔“

وہ جیسے موقع کی تلاش میں تھا۔ فوراً شمیم کو مخاطب کیا۔

”امی سن رہی ہیں۔ یہ عاشی کیا کہہ رہی ہے۔“

”یہ لڑکی تو ہے ہی فتنہ کوئی نہ کوئی نئی بات ہی کرتی ہے۔ تمہیں بھی چاہیے تھا۔ گھر آ کر پہلے تیار ہوتے کم از کم

کپڑے ہی بدل لیتے۔“

”چچی آپ اصل بات دہا رہی ہیں۔ بھائی کے کہنے کا مطلب ہے۔ لگے ہاتھ اُنکی بھی مایوں کر دیں۔“

سارے مہمانوں کے سامنے شمیم کو مسکراہٹ سجا کر کہنا پڑا۔

”کیوں نہیں اب فر بود کی ہی باری ہے۔“

موقع ملتے ہی واسع نے فر بود کے کان میں سرگوشی کی۔۔۔

”کسے ڈھونڈ رہے ہو؟۔۔۔“

وہ بد مزگی سے بولو۔

”اُسے ہی جو نظر نہیں آ رہی۔ مجھے تو بتایا گیا تھا وہ واپس آ گئی ہوئی ہے۔“

واسع نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ فر بود کی نگاہ اُنھی اور ٹھکنا بھول گئی۔ یہ بات تو وہ پورے یقین سے کہہ سکتا

تھا۔ وہ پہلے سے وہاں موجود نہیں تھی۔ کیونکہ اُس نے لاتعداد مرتبہ گریسیوں پر بیٹھے چہروں میں اُسکو کھو جاتا تھا۔ وہ

ابھی وہاں آئی تھی۔ اماں وڈی کا ہاتھ تھام کر سٹیج کی جانب لا رہی تھی۔

سفید رنگ کی ویسٹ اور پورے بازو تھے۔۔۔ جن کے اوپر کالے رنگ کے دھاگے سے مشینی کڑھائی کے

بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔ نیچے شفون کا لمبے گھیر والی لہنگا نما فرائک تھی۔ ایک شانے پہ کالا ہی دوپٹہ پڑا

ہوا تھا۔ جس کے پلے پہ سفید ربن لگا ہوا تھا۔

فرنج ٹیل میں چھوٹے چھوٹے سفید پھول پروئے ہوئے تھے۔ جیولری کے نام پہ چاندی کی چھوٹی چھوٹی

جھمکیاں پہنی ہوئی تھیں۔

فر بود کو بڑی دشواری کا سامنا تھا۔ نظریں اُسکے سراپے سے ہٹنے کو انکاری تھیں۔ جی چاہ رہا تھا۔ کسی بڑی

سے چادر میں اسکو لپیٹ کر کہیں بند کر دے۔ تاکہ اُسکے علاوہ کوئی آنکھ اس پری جیکر کو دیکھ ہی نہ سکے۔

گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اپنی نظروں کا زاویہ بدل گیا۔

تیرے سوا کوئی وہم و گماں میں ہی نہیں
کوئی دوسرا تو میری داستان میں ہی نہیں
میں کسی اور کا ہو جاؤں یہ کیسے ممکن ہے

یہ حوصلہ تو جاناں، اس بے جاں میں ہی نہیں۔۔۔

شہباز اکبر الفت۔۔۔

جب تک وہ سٹیج پر آئی وہ اپنے مچلتے بے قابو دل کو چھکی دیکر تھوڑا بہلا چکا تھا۔

لا پرواہی سے یہاں وہاں دیکھ رہا تھا۔ مگر اندر کے جذبات نے چہرے کا رنگ سُرخ کر دیا تھا۔ وہ سامنے
آئی تو کیا کیا نہیں آیا تھا۔

میز پر پڑی پانی کی بوتل کھول کر ساری ختم کر گیا۔ آج سے پہلے اُس کا ڈرتا سہتا روپ دیکھ کر صرف اُلجھتا آیا
تھا۔ کہ آخر ایسا رویہ کیوں اپناتی ہے۔ پر آج وہ اُس کے ہر رویے ہر نفرت کی وجہ سے واقف تھا۔ اتنے دنوں سے
وہ یہ ہی نہ جان پایا کہ کیسے اُس کو سیٹنا ہے۔ کوئی ایسا عمل جس سے وہ اُس پر اعتماد بھی کر جائے اور اُس کے جذبات
بھی مجروح نہ ہوں۔

واسع کے ایک طرف فریود براجمان تھا۔ دوسری جانب پہلے وڈی اماں نے بیٹھہ رسم پوری کی فریود اور واسع
پر سے پیسے وار کر کام والیوں کو دیئے۔ پھر اپنے بعد اپنی جگہ پر تاحفہ کو بیٹھا دیا۔ خود عاشی کا ہاتھ پکڑ کر سٹیج سے اُتر
گئیں۔ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بیٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ مگر وڈی اماں زبردستی بیٹھا گئی تھیں۔

لوگ دیکھ رہے تھے۔ یا نہیں مگر اُس کو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہر آنکھ اُسی پر جمی ہوئی ہو۔ کمرے کی
روشنی نے آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔

کانپتے ہاتھوں سے ایک اُننگی تیل میں ڈبو کر واسع کے بالوں پہ رگڑ دی۔ پھر اُسی اُننگی پر گیلی مہندی لگا کر
واسع کے ہاتھ پر رکھے لگی۔ مگر عین اُس لمحے پان کے پتے والی ہتھیلی کی جگہ ایک صاف شفاف گلابی ہتھیلی رکھ دی
گئی۔

جو کے سراسر واسع کی شرارت تھی۔ جس نے اپنا ہاتھ ہٹا کر فریود کا ہاتھ آگے رکھ دیا تھا۔

وہ ویسے ہی اتنی بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔ یہ شرارت تو اُسکے رڈار میں آئی ہی نہیں۔ لہذا مہندی فریود کی ہتھیلی پر رگڑ دی۔ جس نے اُسی پل مٹھی بند کر کے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ اُٹھ رہی تھی۔ جب واسع نے کہا زکوٰۃ ایک سیلفی ہو جائے۔

فریود ایک دم اُٹھ کر چلا گیا۔

سیلفی میں بس واسع اور تاشفہ ہی رہ گئے۔

بڑی دقت سے اپنے آنسوؤں پر بند باندھ کر وہاں سے اُٹھی۔۔۔

سراونچا رکھا۔۔۔ کبھی کبھی درد کو اپنے اندر ہی کہیں دفن کرنا پڑتا ہے۔ بہانہ بنا کر رش سے نکل آئی۔ وہ یہ نہ دیکھ سکی فریود اپنے ابو کے اشارے پہ اُٹھ کر اُنکی جانب گیا تھا۔ اُسکو بس اتنا ہی یاد رہا واسع نے سیلفی کی بات کی اور فریود اُٹھ کر چلا گیا۔

اتنے دنوں سے اُس کو فون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو زیادہ تر تو بند جا رہا ہوتا۔ مگر جب بیل جاتی تب بھی دوسری جانب سے کوئی جواب نہ آتا تھا۔

وہ اپنی جگہ چپ چاپ خاموشی سے مری۔

بات یہ نہیں ہے۔ کوئی فون کا جواب نہیں دے رہا تو آپ اُس کے خلاف بُرا سوچنا شروع کر دو۔ ان دونوں کے کیس میں ایسا معاملہ نہیں تھا۔ یہاں عزت نفس لائن پہ لگی ہوئی تھی۔ یہاں پر معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھا۔ اماں وڈی کے بے حد اصرار پر وہ تیار ہوئی تھی۔ سب سے پہلے لباس تبدیل کیا پھر بہن کو فون کیا۔

”سیماب آپنی وہ جو رشتہ دیکھنے والوں نے آنا تھا۔ اُنکو ہاں کر دیں۔ مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔“

سیماب جو فون کی بیل پر نیند سے جاگی تھی۔ اُسکی بات سمجھتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

”تاشی تم رورہی ہو؟۔۔۔“

”نہیں تو بھلا میں کیوں روؤ گی۔۔۔“

”کیا ہوا ہے؟۔۔۔“

”جو بھی ہوا تھا۔ آپ کے علم میں ہی ہے۔ کب اور کیسے میری تقدیر کے اوراق سیاہ ہوئے۔“

”استغفر اللہ تاشی خدا کا خوف کرو کیا بک رہی ہو۔“

”مجھے خود نہیں پتا میں کیا کہہ رہی ہوں۔“

”کیا پھر اُس فون والے سے لڑائی ہوئی ہے؟۔۔۔“

”آپی۔۔۔“

”کیا ہوا ہے؟۔۔۔“

”آپکو پتا ہے عابدین کے قاتل کو کس نے مارا ہے؟۔۔۔“

اُس کے پوچھنے میں اتنی سنجیدگی تھی۔ لائن پر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

سیماب اپنے بیڈروم سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”ہاں ٹی وی پہ بتا رہے تھے۔ سمجھ کر ائم اور آئی ایس آئی کے بندوں نے مارا ہے۔“

”آپی ہمارے خاندان کا ایک فرد سیکریٹ سروسز میں ہے۔“

ایک دفعہ خاموشی چھا گئی۔

”تاشی جہاں تک میری معلومات ہیں۔ دور دور تک ایسا ہونہار ہمارے جاننے والوں میں موجود نہیں

ہے۔“

تاشی نے با آواز اپنی ناک صاف کی۔۔۔

”آپی۔۔۔“

”تاشی ایک تو آدمی رات کو کال کر کے جان نکالی ہے۔ اوپر سے اب پہیلیاں بچھا کر رہی سہی کسر پوری کر

رہی ہو۔ جو بھی بات ہے۔ ایک دفعہ میں کہہ دو۔“

”عابدین کے قاتل کو شیم پھوپھو کے بیٹے نے مارا ہے۔“

سیماب کے لیے یہ خبر توقع سے باہر تھی۔ بے یقینی سے بولی

”فرہود کی بات کر رہی ہو؟۔۔۔“

”آپی پھوپھو کا ایک ہی بیٹا ہے۔“

”پر تاشی وہ عابدین کے قاتل تک کیسے پہنچا اور وہ تو بندے مارنے والا نہیں لگتا ہے۔“

”آپی وہ انہی کاموں میں ماہر ہیں۔“

”تاشی میرا دماغ گھوم رہا ہے۔ تمہارے کہنے کا مطلب فریوڈیکریٹ سروسز کا بندہ ہے؟۔۔۔“

”جی آپی۔۔۔“

”ہائے میرے اللہ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔ مگر تاشی وہ تو چار پانچ سال امریکہ میں گزار کر ابھی ایک آدھ

ماہ پہلے ہی واپس آیا ہے۔ پھر وہ اتنی اہم جاب کیسے کر سکتا ہے۔ تھینا تمہیں کسی نے اُلوہنا دیا ہے۔“

”آپی وہ باہر جانے سے پہلے اسی فیلڈ میں تھے۔ باہر صرف ایک کورس کرنے کے لیے گئے تھے۔ جو دو سال

میں ختم کر کے وطن واپس آ گئے تھے۔ جسکے بارے میں گھر والوں کو نہیں بتایا۔ دو ماہ پہلے وہ امریکہ سے نہیں کراچی

سے آئے تھے۔ پر یہاں سب یہی سمجھتے ہیں وہ امریکہ چار پانچ سال رہے ہیں۔“

”تاشی کوئی فلم دیکھی ہے؟ یا کوئی جاسوسی ناول پڑھا ہے۔ ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے۔ اگر وہ امریکہ کی بجائے

پاکستان میں تھا۔ گھر والے اتنے بیوقوف تو نہیں ہیں۔ جو یہ نہ دیکھ پائیں جس نمبر سے وہ فون کرتا ہے۔ وہ

پاکستان کا ہے یا امریکہ کا۔۔۔“

”آپی جو نمبر ایک دفعہ فیڈ کر لو۔ رومنگ میں وہی نمبر آتا ہے۔ پھر تم چاہے جس مرضی ملک میں بیٹھ جاؤ۔ اور

آج امریکہ کا نمبر پاکستان میں رہ کر استعمال کرنا بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ آپ کا فون لائن سے کنکٹ ہو آپ

دنیا میں کہیں بھی ہوں۔ فون اٹھا سکتے ہیں۔“

”میرے دماغ کی کھجڑی بنا دی ہے۔ پر پھوپھی نے اُسکو ایسی فیلڈ میں جانے کی اجازت کیسے دے دی۔

وہ تو فریوڈ کے بچپن سے ہی اُسکے معاملے میں بڑی پوزیٹر ہے۔“

”پھوپھی کو علم نہیں ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔ ماں کو خبر ہی نہ ہو بیٹا کیا کام کرتا ہے۔“

”اس کا جواب آپ کے سوال میں ہی چھپا ہوا ہے۔ پھوپھی کو اگر بھٹک بھی پڑ جائے اُنکا ویسے ہی ہارٹ فیل

ہو جانا ہے۔ بیٹے سے بڑھ کر انہیں کوئی عزیز نہیں ہے۔ جس فیلڈ میں تمام رسک آپکی پلیٹ میں رہتے ہوں۔ وہ کیسے بخوشی بیٹے کو اس راہ پر جانے دیتیں۔ انہوں نے اجازت مانگی پر پھوپھی نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا انہوں نے ماں کو بتائے بغیر جوائن کر لیا۔“

”ناشو۔۔۔ تمہیں یہ سب باتیں چوہدرانی نے بتائی ہوگی۔“

ٹافہ نے گہرا سانس بھرا۔۔۔

”نہیں آپنی۔۔۔ اماں وڈی کو بھی میں نے بتایا تھا۔“

”ہائیں یہ کیا بات ہوئی؟۔۔۔ جو بات اُس کی ماں کو نہیں پتا اُسکی دادی کے علم میں نہیں ہے۔ وہ سب تمہیں پتا ہے؟۔۔۔“

”آپنی بیوی تو راز دار ہوتی ہے ناں۔۔۔“

ٹافہ کے آخری فقرے نے لائن کو خاموش کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”مجھے آپ دونوں سے بڑی ضروری بات کرنی ہے۔ ادھر بیٹھ جائیں۔“

نوازش علی اور شمیم کو اپنے ساتھ کمرے میں لیکر آیا تھا۔ اب ماں کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھوا اپنے برابر بیڈ پر بٹھایا۔

”ایسی بھی کیا بات ہے جو یوں کمرے میں بند ہو کر کرنی پڑ رہی ہے۔“

شمیم کی بات پر وہ بولا۔

”میں یہ بات باہر بھرے مجمع میں بھی کر سکتا تھا۔ مگر آپکی آسانی کے لیے یہاں لایا ہوں۔“

نوازش نے صوفے پہ بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور جمائی لیتے ہوئے بولے۔

”جلدی کرو کیا بات ہے۔ نیند آرہی ہے۔ صبح پھر جلدی اٹھنا ہے۔“

شمیم کے دونوں ہاتھ اُس نے اپنی مضبوط گرفت میں پکڑے ہوئے تھے۔

”میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں۔ اُس سے آپ دونوں کے احساسات کو ٹھیس پہنچنی ہے۔ جس کے لیے میں

کبھی بھی خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ مگر اب یہ بات کھولے بنا گوارا بھی نہیں ہے۔“

”تو کیا تم واقعی کسی گوری کو پسند کرتے ہو؟۔۔۔“
 شمیم نے غصے سے اپنے ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے پوچھا تھا۔
 وہ دھیمے سے ہنسا۔۔۔

”گوری تو آپکو برداشت ہو ہی جاتی مگر میں جس کا نام لینے والا ہوں۔ وہ آپکو ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔۔۔ اور مجھے اُسکے علاوہ کوئی اور نہیں بھاتی ہے۔“
 کمرے میں اتنی خاموشی چھا گئی اگر سوئی بھی گرتی تو صاف سُنا جاتا۔

”میں نے آپ دونوں سے پانچ سال پہلے بھی اُسی کو مانگا تھا۔ آج مانگ نہیں رہا ہوں۔ بتا رہا ہوں۔ کیونکہ تب وہ میری نامحرم تھی۔ اُسکو پانے کا اصولی قانون یہی تھا۔ میں آپکو بتاتا۔ میں نے بتایا۔ آپ نے اسے میری جوانی کی بے راہ روی سمجھ کر انکار کر دیا۔ اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔ مگر نہ تو وہ میری جوانی کا اہال تھا جو چُپ چاپ بیٹھ جاتا۔ مجھے اُس سے شادی کرنی تھی۔ آپ نے نہیں سنی میں نے ماموں عباس سے بات کر لی۔ وہ مان گئے۔ وڈی اماں اور ماموں عباس نے پانچ سال پہلے میرا اور تاحفہ کا نکاح کر دیا تھا۔“
 ”نکاح عدالت میں ہوا تھا۔ اُسکے وکیل کی جگہ ماموں موجود تھے۔ میری وکیل اماں وڈی تھیں۔“
 نوازش بڑی نارمل انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنکے تاثرات میں کوئی تہدیلی نہیں ہوئی۔
 فریود کا سارا فوکس ماں کی طرف تھا۔

جن کے چہرے کا رنگ لٹھے کی مانند سفید ہو گیا تھا۔
 فریود کی جان پہ بن گئی۔ ماں کے دونوں ہاتھ اپنے لبوں سے لگائے۔ اُنکا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اُنکی آنکھوں میں دیکھا۔

”امی پانچ سال کوئی تھوڑا عرصہ تو نہیں ہے۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ انسان دل سے اُتر بھی جاتے ہیں۔ وہ کوئی حور پری نہیں ہے۔ پھر بھی میں کیا کروں۔ وہ آج بھی وہیں موجود ہے۔ میرے دل کے اُسی حصے میں رہتی ہے۔ جہاں پانچ سال پہلے قبضہ کیا تھا۔ میں جانتا ہوں۔ میری ساری باتیں فقط پاگل پن معلوم ہو رہا ہوگا۔ کسی دو نمبر انجھے کی تقریر پر ماں وہ میرے لیے بڑی اہم ہے۔ پانچ سالوں سے میری بیوی ہے۔ میری وفادار ہے۔

میرے نام پر جیتی ہے۔“

”چپ کر جاؤ بے غیرت انسان مجھے جس بیٹے پر اتنا غرور تھا۔ آج اُس نے ہی مجھے دو کوڑی کا کر دیا۔ جس کو میں منہ لگانا پسند نہیں کرتی ہوں۔ جو ہمارے ہی گھر میں دو ککے کی ملازمہ ہے۔ میں اُسکو بہوتاؤں۔۔۔“

”امی وہ میری بیوی ہے۔“

”میں نہیں مانتی اس شادی کو۔ اگر پانچ سال پہلے نکاح ہوا ہے۔ اس نکاح کی حیثیت کیا ہوگی؟ تمہاری عمر ہی کیا تھی؟۔۔۔ ایک جذباتی عمر جب ہر کوئی اپنے آپ کو شاہ رخ خان سمجھتا ہے۔ افسوس تو اماں پر ہے۔ جنہوں نے ایک بچے کی باتوں میں آ کر میری کمر میں مٹھرا کھوٹا۔ اچھا طریقہ نکالا انہوں نے اپنے اگلے پچھلے بدلے لینے کا میرے بیٹے کو اُس چیل کے حُسن کا اسیر بنایا ہوا ہے۔ نہ جانے اپنی کلمو ہی ماں بیٹیوں نے کہاں سے تعویذ گنڈے کروا کر تمہاری مت ماری ہوئی ہے۔ میرا نام بھی شیم ہے۔ انکو وہاں پھینکوں گی۔ ساری عمر یاد کریں گی۔ غضب خُدا کا میرا ایک ہی ایک بیٹا اُسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہیں۔ اپنی داغدار لڑکی کو پار لگانے کا بڑا اچھا طریقہ نکالا ہے۔“

”امی جو کہتا ہے۔ مجھے کہہ لیں۔ گالیاں دے لیں۔ جوتے مار لیں۔ مگر اس پر کچھ نہ اچھا لیں۔ وہ بے قصور ہے۔ پسند اُس نے نہیں میں نے کیا تھا۔ شادی کی خواہش اُسکی نہیں میری تھی۔ پھر بُرا اُسکو کیوں کہہ رہی ہیں۔“

”تیری عقل پر کل بھی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ آج بھی تیرا وہی حال ہے فرہود۔۔۔“

”آپ اُسکو اتنا پسند کیوں کرتی ہیں؟۔۔۔ آخر اُس نے آپکا کیا پکاڑا ہے؟۔۔۔“

”میرے بیٹے کو میرے خلاف کر دیا۔ کیا اس سے بڑا جرم کوئی اور ہوگا۔“

”میں کب آپکے خلاف ہوں۔ میں تو آپکا بیٹا ہوں۔“

”تم عباس کی کسی اور بیٹی کا نام لے لیتے تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ مگر جسکی تم بات کر رہے ہو۔ اگر وہ واقعی تمہارے نکاح میں ہے۔ تو آج اسی وقت اُسکو طلاق دو۔“

”چلیں اپنے مرحوم بھائی کی یتیم اولاد کے لیے آپکے دل میں تھوڑا سا رحم تو جا گا۔“

”بکواس نہ کرو فرہود اُس گندی بد کردار کو۔۔۔“

”بس ماں۔۔۔ بس۔۔۔“

”کیا بس؟۔۔۔ جا جا کر پوچھ اُس سے جب دودن تک انوار ہی تھی۔ تب اُسکے ساتھ کیا کیا ہوا تھا۔“
”میں کبھی بھی اُسکو ایسے سوال و جواب نہیں کروں گا۔“

”کیوں نہیں کرو گے؟ کیا ذرا سی بھی غیرت نہیں جانتی؟ میرے دودھ کا اتنا سا بھی اثر نہیں لیا۔“

”میری غیرت ہی مجھے روکتی ہے ماں۔۔۔ مجھے شرم آتی ہے۔ بھلا میں کون ہوتا ہوں۔ جو کسی کے غم کو کرید کر اُسکو دکھی کروں۔ مگر آپکو میں ایک چیز دیکھانا چاہتا ہوں۔ میں نے اسکو ضائع کرنا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر ابھی تک لیے گھوم رہا ہوں۔ پر شاید آپکے لیے یہ وڈیو ہی آنکھیں کھولنے کا باعث بن جائے۔ شاید آپکو اُنکا غم نظر آ جائے جو اس مصیبت سے گزر رہے ہیں۔“

”مجھے تم نئے سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ جو مرضی دیکھا لو۔ میں اس لڑکی کو اپنی بہو تسلیم نہیں کروں گی۔ آپ اسے بتاتے کیوں نہیں ہیں۔ میں ہی بول رہی ہوں۔ آپ تو ایسے مطمئن بیٹھے ہیں۔ جیسے آپکا اس معاملے سے کوئی لین دین ہی نہیں ہے۔“

”بولنے کا سارا کام تم جو کر لیتی ہو۔ جو باتیں تمہیں اب پتا چل رہی ہیں۔ وہ میری ماں مجھے پہلے سے بتا چکی ہیں۔ اور اس وقت بیٹے کو بے غیرت بولنے کی بجائے اسکی لمبی زندگی کی دعائیں مانگو۔ صاحب زادے نے بڑے مشکل راہ چننے ہوئے ہیں۔ مجھے آج صبح علم ہوا تھا۔ تاہم اسکی بیوی ہے۔ پچھلے ہفتے اسکو ٹانگ پر گولی لگی تھی۔ تب یہ نہ تمہارے پاس آیا نہ میرے پاس یہ اپنی بیوی کے پاس گیا تھا۔ جب کسی بھی انسان کو تکلیف ہوتی ہے۔ اُس وقت وہ اُنکو یاد کرتا ہے۔ جو دل کے بہت قریب ہوں۔ ہمیں تو یہ اس لائق بھی نہیں سمجھتا اپنی تکلیف ہی ہم سے ہانٹ لے۔“

باپ کے شکوے کے پیچھے مچھاپا یاد رکھ کر وہ نئے سرے سے شرمندہ ہوا۔
شیم تو دنگ بیٹھی رہ گئیں۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ اسکو کیوں گولی لگے گی۔ اسکا تو ایسے لوگوں کے ساتھ دور دور کا تعلق نہیں جہاں لڑائیاں ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ یاد آیا وہ پچھر والی پل پہ جو قتل ہوا تھا۔ تم نے وہ لاش اُٹھوا کر ہسپتال بھجوائی

تھی۔ کہیں اُس قاتل نے تو تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ میں ہمیشہ سے تمہیں سمجھاتی آرہی ہوں۔ فریود اپنی اس عادت پر کنٹرول کرو۔ یہ ہیرو بننے کا دور نہیں ہے۔ آج کل تو لوٹ مار کرنے والے بھی مطالبہ بعد میں کرتے ہیں۔ ہتھیار پہلے چلاتے ہیں۔ گولی کہاں لگی تھی؟۔۔۔“

وہ روتے ہوئے اُسکے ہاتھ بازو کندھوں پر ہاتھ پھیر کر دیکھ رہی تھیں۔

”فریود جیسے کہانی والے بادشاہ کی جان طوطے میں ہوتی ہے۔ اسی طرح میری جان تمہارے اندر ہے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو ماں ویسے ہی مر جائے گی۔“

وہ اُسکا گھنے بالوں والا سردنوں ہاتھوں میں تھام کر ولہانہ چوم رہی تھیں۔

”امی میں ٹھیک ہوں۔ ٹانگ پہ معمولی سا زخم آیا تھا۔“

”ہاں اُس معمولی سے زخم سے دو بوتلیں خون نکلا تھا۔“

وہ جھنجھلا کر بولا۔

”ابو یا آپ میری مدد کر رہے ہیں۔ یا میرے لیے مزید مشکل پیدا کر رہے ہیں۔“

”میری جو مرضی میں کروں۔ تمہارا بھی علاج ہے۔ باپ کو لا علم رکھ کر۔ بڑے قوی ہیرو بنے پھر رہے ہو۔“

”یہ اب قوی ہیرو کیسے بن رہا ہے؟ تم باپ بیٹا ساری تیرا ایک ہی بار میں کیوں نہیں چلا دیتے۔“

نوازش علی نے فریود کی جانب دیکھ کر اشارہ کیا بتاؤ۔۔۔

فریود نے نفی میں سر ہلایا اور ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے بولا۔

”میں تو نہیں بتا رہا یہ بڑا ماریں گی۔“

”اتنا ہی تمہیں ماں کی مار کا ڈر ہوتا تو یہ سب نہ کرتے۔“

شیم نے باقاعدہ روتے ہوئے کہا۔ نوازش کو آگے آنا پڑا۔

انہوں نے مختصر سا سارا کچھ بتا دیا۔

شیم کی ہچکی بندھ گئی۔

”میں نے لڑکی کے لیے منع کیا۔ تم نے اُنہی دنوں میں اُسی سے نکاح کر لیا۔ میں نے اس محکمے میں جانے

سے منع کیا تم نے وہیں نوکری کی۔“

”اس بات کو اسکی نافرمانی نہ سمجھو بس اپنے دل کو یہ بتا کر تسلی دو۔ صاحب جی ایک دفعہ کہیں دل لگالیں۔ تو انکو ہٹانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ نہیں تو جتنے جوتے میں نے اسکو مارے تھے۔ یہ ڈر جاتا۔ مگر یہ مستقل مزاج واقع ہوا ہے۔“

شیم نے اپنے آنسو صاف کئے۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”کیا تمہیں وہ اتنی پیاری ہے۔ ماں باپ کے پاس آنے کی بجائے اُسکے پاس آرام ڈھونڈنے گئے؟۔۔۔“

”امی میری پیاری امی آپکا اور اُسکا کوئی مقابلہ تھوڑی ہے۔ وہ بیوی ہے۔ آپ ماں ہو۔ وہ مجھ سے ہے۔ میں آپ سے ہوں۔ آپ نے مجھے جنم دیا۔ اُس نے مجھے مکمل کیا۔ آپ کے پیروں میں جنت ہے۔ آپ کی نافرمانی کروں تو دوزخ میں جلوں گا۔ اُسکے ساتھ حسن سلوک کئے بغیر میرا آخرت میں کوئی حق نہیں ہوگا۔ میرے لیے آپ دونوں ہی اہم ہیں۔ میں ایک کور کھ کر ایک کو چھوڑ نہیں سکتا ہوں۔ مجھے اس آزمائش میں مت ڈالیں۔ میں اُسکے پاس اُسکو آپ پر ترجیح دیکر نہیں گیا تھا۔ مجھے علم تھا مجھے اُس حالت میں دیکھ کر آپکو تکلیف ہوتی تھی۔“

”کیا بہت گہرا زخم تھا؟

”بتا تو چکا ہوں معمولی سی خراش تھی۔ اُس سے بڑا زخم تو تین سال پہلے اس کندھے پہ گولی لگنے سے ہوا تھا۔“

شیم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھٹی ہوئی آواز میں بولیں۔

”کندھے پر بھی گولی کھا چکے ہو۔“

”کندھے والا زخم تو ایک ماہ میں ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔ پر جو ڈیڑھ سال پہلے پہلی ٹوٹی تھی۔ اُس نے بڑا خوار کیا تھا۔ سانس لیتے ہوئے بھی درد ہوتا تھا۔“

”اُس وقت کون خیال کرتا تھا؟ کون پرہیزی کھانے بنا کر دیتا ہوگا۔“

”آرمی کے ہسپتالوں میں شایعی علاج ہوتا ہے۔ اوپر سے آپکی بہو کو دن میں دو دفعہ کال کر کے دل کا حال سنا تا تھا۔ جس سے کافی افاقہ محسوس ہوتا تھا۔“

”مت اُسکو میری بہو بولو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ پتا نہیں نکاح ہوا بھی ہے یا جھوٹی ستوری بنا رہے ہو۔“

اُس نے اپنی الماری کے اندرونی خانے کی چابی لگا کر نکاح نامہ برآمد کر کے ماں کے سامنے رکھ دیا۔ جسے پڑھنے کے بعد وہ بولیں۔

”فرہود کون مرد چاہے گا اُسکی بیوی کی عصمت۔۔۔“

”اماں اسکے آگے ایک لفظ نہیں۔۔۔ پلیز میں ہاتھ جوڑ کر عرض کر رہا ہوں۔ میں اُسکو یہاں نہیں رکھوں گا۔ آج آپ کے سامنے بات کھولنے کا مقصد صرف اتنا ہے۔ میں اب شادی خدہ زندگی جینا چاہتا ہوں۔ مجھے اُسکو اپنے اس کمرے میں لانا ہے۔ آپ تو اُسکو نہ جانے کیا سمجھتی ہیں۔ ماں میں اُسکا شوہر ہوں۔ وہ مجھے بھی اجازت نہیں دیتی کہ میں کبھی اُسکو شوہر کی نظر سے دیکھ ہی لوں۔ آپ یہ دیکھ لیں۔“

اُس نے لیپ ٹاپ پہ وڈیو چلا کر سکرین ماں کے سامنے کر دی۔ خود جا کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ چہرے پہ گہری سنجیدگی میں تھکن کی گرد بھی تھی۔

شیم سے ویڈیو پوری نہ دیکھی گئی۔ آدمی دیکھ کر ہی اُنہوں نے لیپ ٹاپ بند کر دی۔ اور پلو میں چہرہ مٹھا کر اپنی سسکیاں دبائیں۔ نوازش علی نم آنکھوں سے ایک ٹک سامنے دیوار کو دیکھ رہے تھے۔

وہ ماں کے پاس آیا اور اُنکو بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”مجھے بس اتنا بتا دیں۔ جو اس قدر مشکل آزمائش سے گزر رہا ہو؟ جس آزمائش سے عباس ماموں اور اُنکی ساری فیملی گزری تھی۔ کیا ایسے میں اُنکے ساتھ وہ رویہ رکھنا جائز ہے۔ جو آپ نے اور آپ کے سب بہن بھائیوں نے رکھا۔ اُنکا بانکٹ کر دیا۔ تنہا کر دیا۔ بیٹی کے نام پر طعنے دئے۔ امی اگر عابدین کی جگہ یہ سب آپ کے فرہود کے ساتھ ہوا ہوتا تو آپ پر کیا گزرتی۔“

”فرہود بس کر میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ میرا عابدین بڑا پیارا تھا۔ اللہ ایسے ظالموں کو دوزخ کے نچلے درجے میں پھینکیں۔“

”اور امی اُنکے لیے کیا سزا ہوگی جو مرے ہوؤں پر کچھ اُچھال اُچھال کر اُنکو مزید تنگ کریں۔ آگے بڑھ کر اُنکی مدد کرنے کی بجائے اُن پر زندگی مزید تنگ کر دیں۔ اگر عابدین پیارا تھا تو کیا تاشفہ پیاری نہیں ہے؟ یا کیا وہ انسان نہیں ہے؟ ویڈیو دیکھ کر تو آپکو یقین آ گیا ہوگا۔ تاشفہ کو انخوا ضرور کیا گیا تھا۔ مگر اُسکے ساتھ کوئی جنسی

زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ تافہہ اُن لوگوں کا ٹارگٹ نہیں تھی۔ پرامی اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں نے اُس سے محبت کی ہے۔ آپ نے کبھی عیسائیوں کی شادی میں جب نکاح ہو رہا ہوتا ہے۔ تب اُنکے الفاظ سُنے ہوں۔ شوہر بیوی کو اور بیوی شوہر سے وعدہ کرتی ہے۔ تم جیسے ہو۔ جو ہو میں اُسی کہ بنیاد پہ تمہیں اپنا شوہر مانتی ہوں۔ اور وعدہ کرتی ہوں۔ ہر سختی میں ہر تنگی میں خوشی میں غمی میں غربت میں امیری میں ہر حال میں تمہارے ساتھ وفاداری کرو گی۔ یہی الفاظ شوہر دہراتا ہے۔“

”میرا جب اُس سے نکاح ہوا تھا۔ میں اس بات سے لاعلم تھا۔ کہ آپ کس وجہ سے اُس کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ پر ماں میں نے اللہ رسول ﷺ کی گواہی میں اُس کی حفاظت اور بہبود کا ذمہ اپنے سر لیا تھا۔ اب اگر میرے پراچانک سے یہ گھلے کہ بچن میں میری بیوی کو کسی نے جسمانی طور پر ایبوز کیا تھا۔ تو کیا میں اُسے اپنے نکاح سے نکال دوں؟ یہ نکاح جیسے عظیم اور مقدم رشتے کی توہین نہ ہوگی؟ اور پھر میرے میں اور ہوس کے مارے عاشقوں میں فرق کیا رہ جائے گا۔ کیا میں اس قدر نچلے درجے کا انسان ہوں؟ کیا میری تربیت میں عورت کی یہ عزت رکھی گئی ہے۔ اُس کو ٹھوک بجا کر اُسکے خالص اور پاک ہونے کا ثبوت ڈھونڈ دو۔ ماں یہ جہالت ہے۔ نکاح کی توہین ہے۔ ہاں اگر مجھے اُسکے اخلاق میں کمی نظر آئے۔ اور میرے نکاح میں رہتے ہوئے وہ اپنے ہوش و حواس میں کسی اور مرد کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتی ہے۔ تب میں اُس کو بدکردار مانوں گا۔ یہ کیا ظلم کی انتہا نہیں ایک لڑکی کو صرف اس لیے بدکردار کہنا کیونکہ اُس کو کسی نے ایبوز کیا تھا۔ جبکہ وہ اُس وقت بالغ بھی نہیں تھی۔ تافہہ کا ریپ نہیں ہوا تھا۔ آج اس بند کمرے میں صرف آپ کی اُس روانگتنی سوچ کی وجہ سے میں گھل کر اس موضوع پر بات کر گیا ہوں۔ پر آج کے بعد میں کبھی بھی اس پہ نہ بات کروں گا۔ نہ سُنوں گا۔“

”میں اُس کو مزید اُسکی امی کے گھر نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ وہ اُسکی شادی کرنے کا سوچ رہی ہیں۔ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ اگر آپ خالدہ ممانی سے مل کر ساری بات کر لیں۔ تافہہ آپ کو بہو کے روپ میں قبول نہ ہوئی تو میں اُس کو ملک سے باہر سیٹ کروادوں گا۔ یا کسی اور شہر میں رہائش رکھ دوں گا۔ خود آپ کے ساتھ رہوں گا۔ مہینے نے ایک آدھ دفعہ اُسکے پاس ہو آیا کروں گا۔ وہ دیے بھی میری بغیر رہنے میں ماہر ہو گئی ہوئی ہے۔ قریب جاتا ہوں۔ تو جان لینے پہ اتر آتی ہے۔“

نوازش علی کے لبوں پر پہلی دفعہ مسکراہٹ پھیلی۔۔۔

”امی جانتی ہیں۔ اس سارے میں میرے لیے تکلیف کی بات کیا ہے؟ وہ آپکا خون ہے۔ آپکے باپ دادا کا خون ہے۔ آپکے بھائی کی نسل ہے۔ اور آپ نے ہی اُسکے کردار پر سب سے زیادہ کچھ اُچھالی ہے۔ مجھے اس بات کا بڑا غم ہے۔“

شیم کو لگا کسی نے اُن پر ٹھنڈا ٹھار پانی اُنڈیل دیا ہو۔ اُن سے آدمی عمر کا بیٹا آج وہ وہ باتیں کر گیا تھا۔ جو شاید کوئی اسی سال کا بزرگ بھی نہ کرتا۔ آنسو خشک ہو گئے تھے۔ صاف آواز میں بولیں۔

”جاؤ اُسکو نکلا کر لاؤں۔۔۔“

فریود کو پہلے تو کان کا دھوکا لگا۔

”منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جا کر تافہ کو لیکر آؤ۔“

”اُسکی پٹائی وٹائی تو نہیں لگانی؟۔۔۔“

”اب میں اتنی بھی گئی گوری نہیں ہوں۔ بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔ جاؤ جا کر اُسکو اپنے کمرے میں لے آؤ۔۔۔“

”یہ ہوئی نہ بات۔۔۔ مجھے اپنے اللہ پہ یقین تھا۔ وہ میری ماں کو پتھر دل نہیں بنا سکتے۔ جیو میری ماں مجھے آپکا بیٹا ہونے پر فخر ہے۔“ اُس نے شیم کو ساتھ لگا کر بو سے لیے۔

”اچھا بس مکھن کم لگاؤ جا کر لاؤ میری بہو کو میں ذرا غور سے دیکھوں آخر میرے بیٹے کی محبت ہے۔“

”میری طرف سے معذرت قبول کریں۔ کیونکہ اس گھر میں ہوتے ہوئے وہ میرے سے نظر تک نہیں ملاتی۔ کسی بات کا سیدھا جواب نہیں دیتی۔ ابھی جا کر اُسکو یہ کہہ دوں جا غم ذرا میرے کمرے میں تو آؤ۔ وہ حالت کرے گی خدا پناہ۔۔۔“

”ہاں یا ر آخر بھتیجی کس کی ہے۔“

نوازش کی بات پر فریود کا قہقہہ ویسا ہی تھا۔ جیسے طوفانی رات کے بعد تروتازہ سورج نکل آئے۔

☆.....☆.....☆

”امی آج کے لیے میرا خیال ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ اپنی بہو سے بات کرنی ہو۔ یا اپنی بھابھی سے اب دن چڑھنے کے بعد ہی کچھ گے گا۔ کیونکہ ساڑھے تین ہو رہے ہیں۔ ابھی مجھے حرا باجی کو اُنکا گفٹ بھی دینا ہے۔ میں اس قدر تھکا ہوا ہوں۔ ایک دفعہ سو گیا تو ڈر ہے کل واسع کی بارات ہی نہ مس کر دوں۔“

”ٹھیک ہے۔ اب سے میں تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں کروں گی۔ کیونکہ گھما پھرا کر تم نے مجھے پھر وہیں لے آنا ہے۔“

”یار جو کام میں پیچھے تیس سالوں سے نہیں کر سکا وہ تو نے آج دو گھنٹوں میں کر دکھایا ہے۔ مبارک ہو تمہاری ماں مان گئی ہے۔“

”ہاں آپ کی تو میں نے آج تک ایک بات نہیں مانی ہے۔ اس گاؤں میں بھی اپنی مرضی سے رہ رہی ہوں۔“

”لو بھائی یہ پھر نہ شروع ہو جائے میں چلا۔ تم بھی سو جاؤ کل انشا اللہ دیکھتے ہیں۔ کیا کرنا ہے۔“

انہوں نے فریود کو گلے لگا کر مبارک دی۔ اور کمرے سے نکل گئے۔ شیم نے بھی اُسکی پیشانی چومی ساتھ میں ڈھیر ساری دعائیں دیکر شوہر کی چروٹی میں چل پڑیں۔

اُس نے شاور لیکر لباس تبدیل کیا اور فجر کی نماز کے ساتھ دو نفل ادا کئے۔

بیڈ پر شیم دراز ہونے کے بعد اپنا فون آن کیا۔ دھڑا دھڑا مس کا لڑا اور میسجز کی بھرمار ہو گئی۔

زندگی نام کے میسج کھولے کچھ پڑانے تھے۔ جن پر نظر ڈالتے ڈالتے وہ سب سے آخری میسج پڑ آیا تو ماتھے پہ تیوری آگئی۔ دو دفعہ غور سے پڑھا پھر یقین آیا کہ وہ نیند میں نہیں ہے۔ بلکہ سچ میں تاحقہ کی جانب سے طلاق کا مطالبہ آیا تھا۔

فورا جواب لکھا۔

”کیا تم جاگ رہی ہو؟۔۔۔“

دو سیکنڈ بعد میسج سینڈ تو ہو گیا۔ مگر جواب اگلے دو چار منٹ میں بھی نہیں آیا۔

اُس نے کال ملا دی۔

جواٹھائی نہیں گئی۔

”تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟۔۔۔“

”میری مرضی۔۔۔“

فریود کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ناراض ہو؟۔۔۔“

”میرا آپکا تعلق ہی کوئی نہیں ہے۔ ناراضگی کا کیا جواز۔۔۔“

”ہاں یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ویسے اس وقت ہو کہاں؟۔۔۔“

”بھاڑ میں۔۔۔“

”میری اجازت کے بغیر وہاں کیا لینے گئی ہو۔“

”آج کے بعد میں کسی کام میں آپکی اجازت نہیں لوں گی۔“

”تاہفہ۔۔۔“

دوسری جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ تیزی سے بیڈ میں سے نکلا۔۔۔ حائشہ کے نمبر کال ملائی۔ جو جلد ہی

اٹھالی گئی۔ ”فریود بھائی کیا چاہیے؟۔۔۔“

”اماں وڈی کدھر سو رہی ہیں؟۔۔۔“

”وہ اپنے کمرے کے علاوہ اور کہاں ہو سکتی ہیں۔“

”اور اُکلی مشیر۔۔۔“

”تاہفہ۔۔۔؟۔۔۔“

”ہاں بھئی۔۔۔“

”ہائیں آپ اس وقت اُسکا کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”بات ذرا خود سے سُنو اور جلد ہضم کر لیتا۔ تاہفہ جی آپکی بھابھی ہیں۔ مابدولت کی زوجہ۔۔۔ سمجھ آ گئی۔ اب شور

بالکل نہیں کرنا۔ صبح جو مرضی آئے کر لو۔ پر اس وقت خاموشی سے مجھے اُس کی خبر دو۔ کہاں پائی جا رہی ہے۔“

”اتنی بڑی خبر اور آپ چاہ رہے ہیں۔ میں خوشی سے چیخیں بھی نہ ماروں۔ مجھے علم تھا۔ آپ نے کوئی انوکھا

کارنامہ ہی انجام دیتا ہے۔ وہ حراباجی کے کمرے میں ہے۔“

”وہاں اور کون کون ہے؟۔۔۔“

”پوری پلٹون ہے۔“

”اُسکو کسی طرح وہاں سے نکالو پلیز۔۔۔“

”ہائے رئے یہ جیتا بیاں۔۔۔“

”بکواس نہ کرو۔ تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ ادب سے بات کرو۔“

”گھنے میسنے ذرا دن چڑھ لینے دیں۔ آپکی تو ایسی خبر لوگنی۔ یاد کریں گے۔“

وہ گچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ مگر عائشہ کی آواز دوبارہ آئی وہ رضیہ چچی سے مخاطب تھی۔

”امی آپکو ایک خبر دوں۔ فرود بھائی نے تاحفہ سے شادی کر لی ہے۔“

”تم تو ایسے کہہ رہی ہو۔ جیسے آج کی ہے۔ مجھے پتا ہے۔ ابھی شمیم بتا کر گئی ہیں۔“

”لیس جی یعنی خبر میرے سے پہلے ہی لیک ہو گئی ہے۔“

”عاشو۔۔۔“

”کان کیوں پھاڑ رہے ہیں۔ حراباجی کے پاس ہی جا رہی ہوں۔ ویسے جا کر کیا کہوں بھابھی آپکو بھائی بُلا

رہے ہیں؟۔۔۔“

”نہیں میری ماں بس اُسکو کوئی بہانا بنا کر کمرے سے باہر لے آؤ۔ آگے میں جانوں میرا کام۔۔۔“

”اوہ نہ نہ آپ چاہ رہے ہیں۔ میں آپکی خفیہ ملاقات کرواؤں۔ یہ تو نہیں ہوگا۔“

”تم رکو پہلے میں تمہاری خبر لیتا ہوں۔ پھر کسی اور کی عقل ٹھکانے لگاؤں گا۔“

کمرے کا دروازہ کھلا۔ اندر سے گچھ آوازیں آرہی تھیں۔ مگر عائشہ کی آواز کے سامنے خاموشی چھا گئی۔

”تاشی باجی آپکو وڈی اماں بلارہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں۔ فوراً آئیں۔۔۔“

اگلی آواز تاحفہ کی تھی۔

”وڈی اماں تو سو رہی ہیں۔ میں خود اُنکو دیکھ کر آئی تھی۔“

”اب اٹھ گئی ہیں۔ آئیں ناں شائد اُنکی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

خاموشی چھائی۔۔۔ پھر حرا کی آواز آئی۔

”ناشی یہ تمہارے فون میں لائف لائن کون ہے؟۔۔۔“

”حرا باجی یہ غلط بات ہے۔ آپ نے اپنی تصویر دیکھنے کے لیے فون مانگا تھا۔ اب اُسکا سارا پوسٹ مارٹم تو نہ کریں۔“

”میری تصویر تو صرف ایک دوہی ہے۔ ساری گیلری میں تو میرا بھائی چھایا ہوا ہے۔“

”پلیز حرا باجی یوں شور تو نہ کریں۔“

”لڑکی اب کس بات کا ڈر ہے۔ تمہاری ساس صاحبہ سب کو بتا چکی ہیں۔ تم بھی پوری میسنی ہو۔ اتنی بڑی خبر اتنے سالوں سے مٹھپائی ہوئی ہے۔“

”ہائے ناشی میں صدقے جاؤں۔ لائف لائن والا نمبر تو میرے دیر کا ہے۔ فی تا شوا سکوتم لائف لائن سمجھتی ہو۔“
وہ لائن کی دوسری جانب ہونے والی گفتگو دم سادھے سن رہا تھا۔

حرا کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”اللہ تم دونوں کو ہر سرد گرم سے محفوظ رکھیں۔ میرے سے تو خوشی سنبھالی نہیں جا رہی۔“

”ناشی بھابھی وڈی اماں۔۔۔“

عائشہ کے یاد کروانے پر وہ چل پڑی پر بھابھی کہنے پر عائشہ کو گھورا۔۔۔

حرا کے کمرے سے نکل کر گھر کے دوسرے حصے کی جانب جا رہی تھی۔ جب سیڑھیوں کے پاس اندھیرے میں کسی نے کلائی پکڑ کر روک لیا۔

وہ چہرہ دیکھے بغیر بس سے ہی جان گئی تھی۔ ڈرتے ہوئے اپنے گرد نظر ڈالی کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا۔

اُسی وقت سارے گھر کی بجلی بند ہو گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔

وہ اُسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسکے قریب آیا۔ اور کان میں سرگوشی کی۔۔۔

”میں نے سپریم کورٹ میں اپنا کیس لڑا ہے۔ اور جیت بھی گیا ہوں۔ اس لیے اب مجھے عوام کیا کہے گی جیسے

فضول سوال نہ دینا۔ میرے ساتھ اوپر میرے کمرے میں چلو۔“

تاشفہ بول نہ سکی۔۔۔ مگر زور زور سے نفی میں گردن ہلائی۔

”تاشی پلیز۔۔۔ میں یہاں کھڑے ہو کر بات نہیں کر سکتا۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔“

اُس نے اپنا سر تاشفہ کے کندھے پر رکھا۔۔۔

اُس نے دھیمے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ جانتی تھی وہ تھکا ہوا ہے۔ اور اگر کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔
کئے بغیر رہے گا بھی نہیں۔

اُس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے تک لایا۔

اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے جیب سے فون نکال کر ایک نمبری ڈائل کیا۔

منیر نے فوراً ہی اٹھا لیا۔

”جی سر۔۔۔“

”یار ہم آفس سے باہر ہیں۔ اب تو جی سر کی راگنی بند کر دئے۔“

”سر بجلی اور کتنی دیر بند رکھنی ہے۔“

”وہی کہنے لگا تھا۔ چلا دو۔“

تاشفہ اُسکے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اتنے سالوں سے وہ اس گھر میں نوکری کر رہی تھی۔ مگر آج تک
اُس نے گھر کے اس کمرے میں پیر نہیں رکھا تھا۔

”آپ نے بجلی بند کروائی تھی؟۔۔۔“

جواب میں اُس نے معصومیت سے ہاں میں گردن ہلائی۔ اُسی وقت لائٹ آگئی۔ اے سی چل پڑا۔۔۔
لائٹ مدھم تھی۔

وہ چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آیا جہاں وہ نروس سی کھڑی تھی۔

”آج کالے جوڑے میں تم بہت پیاری لگ رہی تھیں۔“

”ہاں اسی لیے آپ نے ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔“

”آہ۔۔۔ پیاسا دریا کے کنارے پر کھڑا ہو۔ اور خود کو سیراب نہ کر سکے کیا تم اُسکی بے بسی کا اندازہ لگا سکتی ہو؟۔۔۔ میں نے اندرونی جنگ لڑ کر تم سے اپنی نظر ہٹائی تھی۔“

وہ اُسکی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

”مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپکی امی کو بُرا لگے گا۔“

”امی سے میں بات کر چکا ہوں۔ آج کے بعد وہ کبھی تمہیں غلط نہیں کہیں گی۔“

”دوسرے لوگ کیا کہیں گے۔“

”کیا دوسرے لوگ تمہارے لیے اہم ہیں؟۔۔۔ ہمارے بڑوں نے ہمارا نکاح کیا تھا۔ اگر اس میں بھی

کوئی جاہل اپنی انٹرنیشنل کا پہلو نکالتا ہے۔ تو یہ اُنکا مسئلہ ہے۔ نہ کہ تمہارا اور میرا۔۔۔“

”آپ نے اتنے دنوں میں ایک دفعہ بھی مجھے اپنی خیریت سے آگاہ نہیں کیا۔“

”میں بہت بزی رہا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔ پر ڈر گئی تھی۔ مجھے لگا شائد۔۔۔“

”شائد جس سچ نے اتنے سال تمہیں بے سکون رکھا وہ آج میرے سامنے آیا ہے۔ تو میں بدل جاؤں گا

؟۔۔۔“ فریوڈ نے اُسکا جملہ پورا کرتے ہوئے اُسکی نظروں میں دیکھا۔ جہاں نمی چمک رہی تھی۔ اُس نے اپنے

دونوں ہاتھ اُسکی کمر پر باندھ کر اُسکو خود سے قریب کیا۔

دونوں کے درمیان خاموشی بولتی رہی۔ تاہم کانپتے ہاتھوں سے اُسکی قمیض کے بٹن چھو رہی تھی۔ لب کپکپا

رہے تھے۔

”کیا اب بھی ڈر لگ رہا ہے؟۔۔۔“

تاہم نے سر اٹھا کر دیکھے بغیر سرفی میں ہلا دیا۔

”کیا واقعی آپکو مجھ سے اتنی محبت ہے؟۔۔۔“

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ پھر جواب دوں گا۔“

اُس نے پلکیں اٹھائیں گہری براؤن آنکھیں خطرناک حد تک سنجیدہ تھی۔ وہ زیادہ دیر اُن میں دیکھ نہ پائی

اپنی نگاہ ایک دفعہ پھر ہٹا کر اُسکی داڑھی پہ لگالی۔

”داڑھی آپکو سوٹ کر رہی ہے۔“

”شکر یہ۔۔۔ اگر ہاتھ لگا کر دیکھا چاہ رہی ہو تو دیکھ سکتی ہو۔ یہ جیتی بالکل نہیں ہے۔“

تاشفہ کو بالکل حیرت نہیں ہوئی وہ کیسے اُسکی سوچ پڑھ لیتا ہے۔

اُس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر فریود کی داڑھی کو محسوس کیا۔

”اپنے سوال کا جواب چاہیے یا مل گیا؟۔۔۔“

”مل تو گیا ہے۔ مگر پھر بھی میں سننا چاہتی ہوں۔“

”آئی لو یواکنڈ۔ شٹلی۔۔۔“

تاشفہ کے گال پر آنسو پھسل گیا۔

”یو آر مائنڈ ایکشن۔۔۔ کہتے ہیں جتنی چھوٹی عمر میں کوئی نشے کا عادی ہو جائے پھر وہ ساری عمر اُس نشے

سے جان نہیں بچھڑا سکتا۔ اور میں تو اس نشے سے بچنا چاہتا بھی نہیں ہوں۔“

”اگر میرے ابو رشتہ دینے سے انکار کر دیتے تو؟۔۔۔“

”ایسا ناممکن تھا۔ اگر اللہ نے تمہیں میرے دل کا مکین بنایا تھا۔ تو انہوں نے گھر کا مکین بنانے کے لیے بھی

کوئی نہ کوئی راہ نکال دینی تھی۔ میں بدنیت انسان نہیں ہوں۔ نہ ہی دوسروں کی عزت پر بُری نظر ڈالنے والا

ہوں۔ پھر میری راہ سیدھی کیوں نہ ہوتی؟۔۔۔ اگر تم میری نہیں تھیں۔ میرے دل میں تمہارا خیال بھی نہیں آتا

تھا۔“

”اتنا یقین ہے؟۔۔۔“

”ہاں یقین اور ایمان ہی تو ایک انسان کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔“

”آپ کو نیند آرہی تھی۔ اب سو جائیں دن نکل جاتا ہے۔ میں نماز پڑھ لوں۔“

”یہاں سے ہٹنے کو میرا دل نہیں کر رہا۔“

تاشفہ نے مسکراتے ہوئے اُسکے گلے کی ہڈی کو پہلے ہاتھ سے چھوا پھر لیوں سے۔۔۔ فریود کے چہرے پر

بڑی ریلیکس مسکراہٹ تھی۔

”تم میرے پاس بیٹھو میں سو جاؤں گا تو چلی جانا۔“

وہ اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ اُس نے آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ جب وہ آکر اُسکے پہلو میں بیٹھی۔ فرود نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھا۔

اُسکے پُرکشش نقوش کو دیکھتے ہوئے بار بار تافہ کی آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ آ جاتی۔ جسے وہ اُسی خاموشی سے اپنے پلو میں جذب کرتی جاتی۔

آگے کو جھک کر فرود کی کشادہ پیشانی پر بوسہ لیا۔

فرود نے ایک دفعہ پہلے کا پڑھا شعر پھر سے دہرایا۔

سُرخِ اودھے نماں دی۔۔۔

ایسی تیسی پھلاں دی۔۔۔

تافہ کھل کر ہنسی۔۔۔

مگر وہ یونہی آنکھیں بند کئے رہا۔۔۔ دو منٹ بعد کمرے میں فرود کے ہلکے ہلکے خراٹے گونج رہے تھے۔ بڑی آہستگی سے اُس نے اپنا ہاتھ ہٹایا۔ اور اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکلی ہی تھی۔ جب سامنے کھڑے افراد پر نظر پڑتے ہی زمین نے قدم جکڑ لیے۔

شیم اور نوازش علی اُسکو دیکھ کر چار پائی سے کھڑے ہو گئے۔

تافہ کے چہرے پر خوف و ہراس دیکھ کر شیم کو بڑی شرم آئی۔

نیم تاریکی میں کھڑی وہ لڑکی شیم کا اپنا خون تھی۔ مگر آج پہلی دفعہ وہ اُسکو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اور افسوس بھی ہوا۔ آج سے پہلے اپنی بیوقوفی اور جہالت کی عینک سے وہ اس معصوم چہرے کو پہچان ہی نہ پائی تھیں۔ آج دیکھا تو اُس میں اپنا مرحوم بھائی نظر آیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔

انہوں نے ہاتھیں کھول دیں۔ تافہ ہٹ بن گئی۔ پلکیں تک ساکت تھیں۔ شیم نے ہاتھیں کھولیں تو تھوڑی جھجک کے بعد آکر اُنکے سینے سے لگ گئی۔

دونوں پھوپھی بھتیجی رورہی تھیں۔

نوازش نے تاشفہ کو اپنے ساتھ لگا کر سر پہ ہاتھ رکھا۔

”بس کرو تم دونوں کی آواز سن کر اندر فریود بے آرام ہوگا۔ میں ہال کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ فریود اور تاشفہ کا نکاح سب سے پہلے ہوا تھا۔ انکی رخصتی بھی اُن سے پہلے ہوگی۔“

وہ شمیم کو ہدایت دیتے ہوئے۔۔۔ ”تم تاشفہ کو ساتھ لے جاؤ اور جا کر خالدہ بھابھی کو منا کر لاؤ۔ والہی پہ ان دونوں کی ضروری شاپنگ بھی کر لیتا۔“

شمیم نے تاشفہ کے چہرے پر بوسہ دیا اور آنسوؤں کے درمیان مسکرا دیں۔

اُس دن فریود کو ڈیڑھ بجے کے قریب زبردستی میند سے بیدار کرنے والے واسع اور منیر تھے۔

اُسی شام لاہور میں اپنے ماموں کے گھر پہ موجود مریم نے اپنے نئے فون پہ ایک ای میل وصول کی تھی۔ جس میں دولہا ڈلہن کی تصویر کے ساتھ لکھا تھا۔

مسٹر اینڈ مسز تاشفہ فریود۔۔۔۔۔

مریم نے بے اختیار وہ تصویر چوم لی تھی۔ اور اُسی وقت اُس کا پرنٹ آؤٹ نکلوا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

☆.....☆.....☆

”اسلام و علیکم۔۔۔ میں تمام حاضرین محفل کو دل کے گہرائیوں سے خوش آمدید کہتی ہوں۔ آج یہاں پر میری فیملی کے لوگ موجود ہیں۔ پچھلے دو سال سے ہمارے اس سفر میں ہمارا ساتھ دینے والے دوست احباب موجود ہیں۔ اور وہ تمام لوگ جنہوں نے کسی نہ کسی طرح اس پراجیکٹ جس کو میں ایک خواب کا نام ہی دیتی ہوں۔ اس خواب کو حقیقت بنانے میں ہمارا ساتھ دیا۔“

”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ بس آپ سب کا ذاتی طور پر ٹھکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ کہتے ہیں جیڑی سب سے پہلے اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ میں اس معاملے میں انتہائی خوش قسمت ہوں۔ اللہ نے مجھے ایسی فیملی سے نوازا ہوا ہے۔ جو ایسے کاموں میں ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔“

”میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار سب سے پہلے اپنی دوست اپنی سابقہ باس اور حالیہ دادی ساس

چوہدرانی جی سے کیا۔ انہوں نے اُسی وقت مجھے ایک کروڑ کی ڈومینشن دیکر کہا یہ دوسرا یہ اور اللہ کا نام لیکر کام شروع کرو۔ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ فوراً جا کر اپنے شوہر سے بات کی یہ یہ ہوا ہے۔ اب کیا کروں۔ انہوں نے کہا کرنا کیا ہے۔ کام کرو۔ جیسے جیسے یہ خبر پھیلی مجھے امداد ملنا شروع ہوگئی۔ میرے ابو جی نوازش علی کی جانب سے مجھے یہ زمین الاٹ ہوئی جہاں پر آج یہ شاندار عمارت کھڑی ہے۔ جس عمارت کی افتتاحی تقریب میں آپ سب شریک ہیں۔ یہاں اگر ڈاکٹر ایمین صالحہ، مریم، ارسلان، اور مراد بھائی کی ساری فیملی کو مینشن نہ کیا جائے تو بہت بڑی نا انصافی ہوگی۔ میں آپ سب کی مشکور ہوں۔ آپ کے جذبے اور جنون کے سامنے شکریہ بڑا ہی حقیر لفظ ہے۔ مگر پھر بھی آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔۔۔

”اس کے ساتھ ہی میری ماؤں کی احسان مند ہوں۔ پراجیکٹ آدھا مکمل ہوا تھا۔ جن دنوں اللہ نے مجھے ماں بننے کی خوش خبری دی۔ ہم سب ہی بہت خوش تھے۔ میرے دل میں پریشانی بھی آئی اب اس کام کا کیا ہوگا۔ کہیں رفتار سُست نہ پڑ جائے۔ اگر شوہر نے کام چھوڑ کر گھر بیٹھ جانے کا حکم دے دیا تو کیا کرونگی؟۔۔۔ کیا ایک دم سے سب چھوڑ دوں گی۔“

”پر میرے تمام خدشے خدشے ہی رہے۔ دونوں ماؤں نے مجھے ایک دن بھی گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ پر سارے کام بھی ہوتے گئے۔ حرا باجی اور واسع بھائی نے مکمل طور پر چارج سنبھال لیا۔ سیما ب آپا میری چڑچڑی طبیعت سہتی رہی ہیں۔ خیر یہ فیملی ساگا بہت طویل ہے۔

جب ایک سال سو سال کی بچی نے سٹیج پہ چڑھ کر بھاگنا شروع کیا تو سارے ہال میں تہقہ دوڑ گیا۔ وہ بھاگ کر بچی تک گئی اور اُسکو گود میں اٹھالیا۔

جو چل چل کر سٹیج کے نیچے کھڑے تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص کی جانب لپک رہی تھی۔ جسکی گود میں سے نکل کر وہ سٹیج پر آئی تھی۔ وہ بچی اُسی شخص کی کاربن کاپی تھی۔ اُسی جیسا ناک اُسی کے جیسے ہونٹ۔۔۔

مجبوراً اُس کی ماں کو بچی اُسکے باپ کے حوالے کرنی پڑی۔ جیسے ہی وہ گول مٹول سی باربی ڈول باپ کی گود میں اُتری خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔۔۔ بابا بابا۔۔۔

جواب میں اُس نے بیٹی کے گال پر پیار دیا اور سٹیج سے دور ہٹ گیا۔

وہ واپس مائیک کے پاس آئی۔ آواز جذبات کے سیلاب کے پیچھے کھو گئی تھی۔ گلا کھنکارتے ہوئے بولی۔۔۔
 ”یہ ابھی آپ نے میری پرسنل زندگی کی ایک جھلک دکھ لی ہے۔ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میرے دن رات کیسے گزرتے ہیں۔ یہ باپ بیٹی ایک دوسرے کے دیوانے ہیں۔ اور میں ان دونوں کی دیوانی ہوں۔“
 ”بیک ٹو ڈانٹا پک۔۔۔ سب سے آخر میں اُس ہستی کو شکر یہ کہنا چاہتی ہوں۔ جس نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ اعتماد، اعتبار، محبت، مان۔۔۔ اُس نے کہیں کوئی کمی چھوڑی ہی نہیں ہے۔“
 ”ایک دفعہ میں نے ایک فلم دیکھی تھی۔ بلکہ میں نے اور وڈی اماں نے اکٹھے بیٹھ کر دیکھی تھی۔“
 وہ وڈی اماں کی جانب دیکھ کر دلکشی سے ہنسی۔۔۔

”کیا کریں جب یاری اپنے سے بڑی عمر کے فرد سے ہو جائے۔ یاری تو یاری ہی ہے۔ تو میں وہ فلم دیکھتے ہوئے بڑا روئی تھی۔ وین آمین لو آؤ من۔۔۔ آخر پہ اماں وڈی سے یہ سوال بھی پوچھا ایسے آدمی کہاں پائے جاتے ہیں۔ بیوی نشے کی عادی ہو گئی۔ دو انگی چھوٹی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ ماں واش روم کے فرش پر گری ہوتی ہے۔۔۔ نہیں پتا مر گئی ہے۔ یا زندہ ہے۔ ایک انتہائی جذباتی ڈرامہ ہے۔ بیوی اتنی نیچے گر جاتی ہے۔ اور وہ مرد پھر بھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ وہ دونوں لڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نہ ابھلا کہتے ہیں۔ اگر وہ آدمی چاہتا تو اُسکو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔ بچیوں کی زندگی سے اُس عورت کو نکال دیتا۔ مگر نہیں اُس نے آخر تک اُمید نہیں چھوڑی بڑی تکلیفیں آئیں پر وہ ڈنارہا۔ اور ایک دن علاج کے بعد بیوی ٹھیک ہو گئی۔“

”میرے قریبی احباب بھی جانتے ہیں۔ ماضی کی تاحفہ سر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ وہ اتنے سارے لوگوں کے سامنے یوں کھڑی بول رہی ہوگی۔ میں پس منظر میں رہنے کی عادی تھی۔ ہجوم دیکھ کر ہی ٹانگیں کاٹنے لگتی تھیں۔ پر اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔

جو فلم دیکھ کر میں روئی تھی۔ وہ تو ہالی وڈ کی فیکشن کہانی تھی۔ اللہ نے مجھے اصل زندگی میں ایسے ساتھی سے نواز دیا جس کے ساتھ نے مجھے سرتاپا بدل دیا ہے۔ بہت شکر یہ فریاد نوازش آپ میری زندگی میں آئے۔ مجھے اتنی پیاری بیٹی دی۔ میں آپ دونوں کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہوں۔ اللہ پاک آپ کو میری عمر بھی لگا دیں۔
 تھینک یو سوچ۔۔۔“

جب دونوں کی نظر ملی تو فریود نے دور سے ہی اُسکو آنکھ ماردی۔۔۔
 ”فریود بھائی شرم کریں اپنی ہی بیوی کو پبلک میں آنکھیں مار رہے ہیں۔“
 فریود ہنستے ہوئے مریم کی طرف مڑا۔
 تم بھی شرم کرو۔ پبلیک کی پیٹھ کر ہماری پرایوسی میں جھانک رہی ہو۔“
 مریم نے قہقہہ مارا۔۔۔
 ”یعنی اُلٹا چور کو تو ال کو ڈانٹے۔۔۔“

تین ایکڑ پر بے گھر بچوں کے لیے شیلٹر ہوم بنایا گیا تھا۔ جس میں پانچ سو بچے رہ رہے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی ابتدائی کاوش تھی۔ جس میں آنے والے وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا تھا۔
 اک لفظِ محبت کا اتنا یہ فسانہ ہے
 سٹے تو دل عاشق پہلے تو زمانہ ہے۔۔۔

